زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

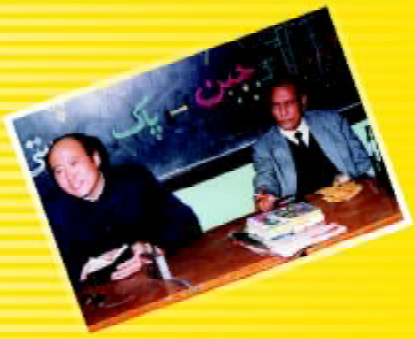

۔بھلایا نہ جائے گا۔

میں نے فرخندہ لودھی کے خاکے میں اشارہ کیا تھا کہ اس کی تمام تر تمنائیں حسرتوں میں بدلتی رہیں۔ اُس کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ سو اِس کتاب کے ذریعے اس کی ایک خواہش (ان شاءاللہ) حسرت میں بدلنے سے بچ جائے گی۔

میں نے اپنے محبوب تعلیمی اداروں کی یاد کو اس کتاب میں ''بیتے ہوئے کچھ دن'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ یہ یاد اساتذہ اور طلبہ کے چھوٹے چھوٹے خاکے اپنے جلو میں لے کر آئی ہے۔ اس لیے میں نے اداروں کو خاکوں میں شمار کیا۔ (یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور کا قرض ابھی مجھ پر باقی ہے۔ میری اس کتاب کا نام فرخندہ لودھی نے ''اکثر یاد آتے ہیں'' تجویز کیا تھا لیکن خبر ملی کہ اس نام سے ایک کتاب لکھی جا چکی ہے۔ اتفاقاً اورینٹل کالج اردو کی پروفیسر اور میری شریکِ کار عارفہ شہزاد نے میر تقی میر کا شعر سنا دیا۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ جا
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

.....صابر لودھی

۔حسن کوزہ گر۔

پیشِ نظر کتاب پانچ مشمولات کی حامل ہے۔ راشد کے فکر و فن پر میرے تفصیلی مقالے ''انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے'' کے علاوہ راشد سے ایران میں کیے گئے تین مصاحبوں (جن میں سے ایک مضمون نما مصاحبہ ہے) کے اردو ترجمے (مع تعارف، مفصل حواشی و تعلیقات) اس کتاب میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ممتاز ادیب، شاعر، مترجم اور فرانسیسی ادبیات کے مشہور عالم ڈاکٹر لئیق بابری کے نام راشد کے پانچ خطوط مع حواشی بھی ''مکتوبات راشد بنام ڈاکٹر لئیق بابری'' کے زیرِ عنوان اس کتاب کا حصہ ہیں۔

یہ کتاب شعبۂ اردو کے سلسلۂ راشد صدی مطبوعات کی تیسری کڑی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے حسبِ سابق اس کتاب کی اشاعت کے لیے بھی بھرپور مالی تعاون فرمایا اور حوصلہ افزائی کی۔ میں ان کی علم پروری کی داد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

.....ڈاکٹر تحسین فراقی

۔نیا سورج نکلتا ہے۔

کسی شاعر کو جستہ جستہ پڑھنے اور کتابی شکل میں اس کا دیوان یا شعری مجموعہ پڑھنے میں بعض اوقات اگر زمین آسمان کا نہیں تو غیر معمولی فرق پڑ جاتا ہے اور یہ تبدیلی دو طرفہ ہو سکتی ہے۔ منظور ثاقبؔ ان شعراء میں سے ہیں جن کا کلام تسلسل سے پڑھنے سے ان کے بارے میں آپ کی رائے بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ (کم از کم میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔)

ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''نیا سورج نکلتا ہے'' کا مسودہ گزشتہ چند دنوں سے میرے زیرِ مطالعہ ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ شاعری کے لیے مطلوبہ فنی محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں Perfection کی تلاش اور ایک فکری رویے کی موجودگی قدم قدم پر دکھائی دیتی ہے بالخصوص ان کی نظموں میں یہ کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔

.....امجد اسلام امجد

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۰،شمارہ:مئی،جون ۲۰۱۱ء

بانی مدیرِاعلیٰ
سید ضمیر جعفری

○○○

مدیرِ مسؤل
گلزار جاوید

○○

مدیرانِ معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

○

مجلسِ مشاورت

○○○

قارئین چہارسُو

○○○

زرِسالانہ

○○○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

○

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔
فون: 0092-51-5462495
فیکس: 0092-5490181
موبائل: 0092-333-5358114
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِورق،پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

نفوسِ وقت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۶

وقت دریا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عروب شاہد ۸

وصالِ یار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انتخاب عالم ۱۰

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۲

شہرِ منور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیصل عظیم ۲۲

آپ کی دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔توصیف تبسم ۲۶

گناہِ عشق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نقاش کاظمی ۲۸

اقرارِ وفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آفتاب اقبال شمیم ۳۰

ذرا انتظار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امجد اسلام امجد ۳۲

دن جدائی کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطاالحق قاسمی ۳۴

چمن پہ ڈال نظر۔۔۔۔۔۔۔غالب رضا گیلانی ۳۵

شیشوں کے مسیحا۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۳۶

شبِ کراچی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انتخاب عالم ۴۰

افلاک کی تسخیر

امین راحت چغتائی، آصف ثاقب، حفیظ انجم، صابر عظیم آبادی۔ ۴۱

افسانے

اُس کی سالگرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ستیہ پال آنند ۴۳

زندگی دوسروں کے لئے۔۔۔۔۔۔۔وقار بن الٰہی ۴۶

مفلس کدے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سعید شیخ ۵۳

امنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یسٰین احمد ۵۸

برق رفتار زمانہ

انور سدید، مشکور حسین یاد، کرشن کمار طور، امین راحت چغتائی، سرور انبالوی، غالب عرفان، غلام مرتضیٰ راہی، شاہین، انوار فیروز، یوگیندر بہل تشنہ، ضیاء شبنمی، رب نواز مائل، حسن عسکری۔ ۶۰

افسانے

تنہائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید سعید نقوی ۶۷

گل بہشت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نقشبند قمر بھوپالی ۷۲

ہڑتال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احسان احمد شیخ ۷۵

اسے کیا کہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔نثار احمد صدیقی ۷۸

تتلیوں پہ کیا گزری

سہیل غازی پوری، پرتپال سنگھ، عظمیٰ صدیقی زہیر کنجاہی، سیفی سرونجی، خورشید انور، پنہاں، تنویر شاہد، شگفتہ نازلی، انیس الرحمٰن، کرشن گوتم، ندیم ہاشمی، نور زمان ناوک، نعیم الدین نظر، جتندر پرواز۔ ۸۰

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔۔فیروز عالم ۸۵

فکرِ فردا

مذہبِ ابراہیمی۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفوت علی صفوت ۹۱

نشانِ راہ

فیض اور صنفِ نعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن عبد ۹۳

اعترافِ ہنر

مزاح کا ایٹمی سائنسدان۔۔۔ایس۔ایم معین قریشی ۹۵

بہ نوکِ خار

ستیہ پال آنند، امجد اسلام امجد، یونس صابر، یوگیندر بہل، حسن عسکری، فیصل عظیم، طالب زیدی، شگفتہ نازلی، اقبال بھٹی، احمد ظہور، تنہا تیما پوری، جہانگیر اشرف، تصور اقبال، ایم۔ایل۔شرماناز۔ ۹۷

ڈرامہ

خطرہ چارسوچالیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۰۵

ایک صدی کا قصہ

سہراب مودی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۱

ورثہ

اختر شیرانی، لالہ کا نجی مل صبا ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۵

اردو زبان زندہ باد، پاک چین دوستی پائندہ باد

قرطاسِ اعزاز

چانگ شی شوان

المعروف

انتخاب عالم

کے نام

''نفوسِ وقت''

فاری شا

(اسلام آباد)

نام: چانگ شی شوان (انتخاب عالم)
تخلص: عالم
قومیت: چینی
پیدائش: ۲۲ مئی ۱۹۴۰ء، بمقام یانگ چانگ گاؤں، بونگ تھونگ کاؤنٹی، صوبہ شان شی، چین

تعلیم

انٹرمیڈیٹ: ۱۹۶۰ء مڈل اسکول نمبر ا، شہر لین فین، صوبہ شان شی، چین۔
گریجویشن شعبہ صحافت: ۱۹۶۴ء، بیجنگ براڈ کاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ، چین۔
گریجویشن شعبہ اردو: ۱۹۶۷ء بیجنگ براڈ کاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ، چین۔
ایڈوانسڈ اردو: ۸۲۔۱۹۸۰ء، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، پاکستان۔

اعزازات

''تمغہ پاکستان''.....مارچ ۱۹۹۳ء حکومت پاکستان۔
''سلیم جعفری اردو ایوارڈ''.....اکتوبر ۲۰۰۰ء ادارہ فروغِ اردو ادب دوبا ودبئی۔
''ستارہ قائداعظم''.....فروری ۲۰۰۶ء حکومت پاکستان۔
''فخرِ اردو ایوارڈ''.....نومبر ۲۰۰۸ء اردو مرکز، لاس اینجلز۔
''غیر معمولی خدمات انجام دینے والے ماہرین کیلئے مخصوص الاؤنس''.....۱۹۹۷ء (حکومت چین)

ملازمت

اردو مجلّہ ''چین با تصویر'' میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۴ ایڈیٹر
۱۹۸۴ء تا ۱۹۹۷ء ایڈیٹر ان چیف
۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۰ء سینئر ایڈیٹر
ریٹائرمنٹ کے بعد کے مشاغل
کیسونی کیشنز یونیورسٹی آف چائنہ میں ستمبر ۲۰۰۳ تا جون ۲۰۰۷ وزٹنگ پروفیسر اور صدرِ شعبہ اردو۔
فارن سٹڈیز یونیورسٹی میں ستمبر ۲۰۰۷ء تا حال وزٹنگ پروفیسر۔

تصانیف

(۱) شعر گوئی:
''گلبانگِ وفا'' (پہلا شعری مجموعہ)
(۲) اردو سے چینی میں ترجمہ:
''پاکستان کے فلمی گیت''
''پاکستان کے قومی نغمے''
Ovation to China (شعری مجموعہ، شاعر: راغب مراد آبادی)
''غیر ملکی غنائی شاعری (حصہ اردو)
(۳) چینی سے اردو میں ترجمہ
''یاسمین'' (شعری مجموعہ، شاعر: چی پھنگ)
اردو ماہنامے ''چین با تصویر'' کے جملہ ۳۸۴ شماروں میں شائع شدہ مضامین کا قریب چوتھا حصہ۔
''آبلہ پا'' (غیر مطبوعہ۔ اس کتاب کا ترجمہ جناب بوانگ وان ای کے تعاون سے کیا گیا)
''پاکستان، تاریخ وثقافت'' (غیر مطبوعہ)
(۴) ترتیب وتالیف
اردو ماہنامے ''چین با تصویر'' کے جملہ ۳۸۴ شماروں کا بیشتر حصہ
''اردو کا عروض'' (نصابی کتاب)
''منتخب ادب پارے'' (نصابی کتاب)
''معلومات پاکستان'' (نصابی کتاب)
(۵) نظر ثانی
''عام استعمال کے اردو جملے''
''میری ننھی چینی اردو لغت''
''میری چینی اردو لغت
(۶) متفرقات
چینی اور اردو میں مختلف موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو مضامین، مقالات اور منظومات۔
غیر ممالک کے دورے اور بین الاقوامی ادبی سرگرمیوں میں شرکت
۱۔ دسمبر ۱۹۸۰ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد میں ایڈوانسڈ اردو کورس کی تکمیل۔
۲۔ مارچ ۱۹۸۸ء ابوظہبی میں منعقدہ ''انٹرنیشنل احمد ندیم قاسمی سیمینار و مشاعرہ'' میں شرکت۔
۳۔ اگست ۱۹۸۸ء کراچی میں چین کی شائع کردہ اردو مطبوعات کی نمائش منعقد کرنے کیلئے پاکستان کا دورہ۔
۴۔ مئی ۱۹۹۱ء میں چینی صحافیوں کے واحد نمائندے کی حیثیت سے چین اور

پاکستان کے سفارتی تعلقات کے قیام کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر پاکستان کا دورہ۔ دورے کے دوران ملتان، فیصل آباد، میاں چنوں اور پنجاب یونیورسٹی میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت۔

۵۔ستمبر۱۹۹۲ء ایلیٹیز کالج کراچی کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی اردو کانفرنس اور پانچویں عالمی مشاعرے میں شرکت۔

۶۔دسمبر۱۹۹۵ء اسلام آباد میں منعقدہ ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کی انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت۔

۷۔نومبر۱۹۹۸ء چینی ادیبوں کے وفد کے ساتھ پاکستان کا دورہ۔

۸۔اکتوبر۲۰۰۰ء دوہا اور دبئی میں بشیر بدر کے نام سے منعقدہ اردو ادبی جشن میں شرکت۔اس موقع پر ''تیسرے سلیم جعفری اردو ایوارڈ'' ملا۔

۹۔اکتوبر۲۰۰۰ء میں دوہا اور دبئی کے ادبی جشن سے فارغ ہو کر چین واپسی کے راستے میں دورہ پاکستان۔

۱۰۔اپریل۲۰۰۴ء نئی دہلی میں جشنِ بہار کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرے میں شرکت۔

۱۱۔نومبر۲۰۰۵ء نئی دہلی میں ادارہ ''جشنِ بہار'' کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے میں شرکت۔

۱۲۔نومبر۲۰۰۸ء شہر لاس اینجلز اور شہر سالٹ لیک میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت۔

۱۳۔مئی ۲۰۰۹ء نئی دہلی میں ادارہ ''جشنِ بہار'' کے زیرِ اہتمام منعقدہ مشاعرے میں شرکت۔

۱۴۔اپریل۲۰۱۰ء اسلام آباد میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس ''صوفی ازم اینڈ پیس'' میں شرکت۔

ایک ارب میں ایک شاعر

آپ سے ملئے۔آپ کا اسمِ گرامی ہے چانگ شی شوان۔اردو دنیا میں آپ انتخاب عالم کے نام سے معروف ہیں اور واقعی انتخاب عالم ہی ہیں۔چین کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے۔اس ایک ارب سے زائد کی آبادی میں اردو شاعر صرف ایک ہے انتخاب عالم! یہ مشہور رسالے ''چائنا پکٹوریل'' کے اردو ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔''چائنا پکٹوریل'' کا اردو ایڈیشن انہی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔جولائی کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے! جناب چانگ شی شوان نے پاک چین دوستی کے جذبے سے متاثر ہو کر۱۹۶۳ء میں اردو سیکھنی شروع کی اور چار سال میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ''چائنا پکٹوریل'' جو بیس زبانوں میں شائع ہوتا ہے کے اردو ایڈیشن ''چین با تصویر'' کے کارکن بنے۔اب اس کی اشاعت چودہ ہزار ہے۔۱۹۷۸ء میں آپ نے اردو شاعری شروع کی اور پچھلے دس سال میں ماشاءاللہ بے شمار غزلیں کہہ چکے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انتخاب عالم بڑی خوبصورت غزل کہتے ہیں۔کیا عجب شعر کہا ہے:

کبھی ''نہیں'' کے بجائے ذرا کہو ''ہاں'' بھی
''نہیں'' کے لفظ سے یہ لفظ مختصر تو ہے

پاکستانی سفیر اکرم ذکی صاحب شاعر بھی ہیں شاعر نواز بھی۔چین کے دارالحکومت بیجنگ میں مشاعروں کا سلسلہ اکرم ذکی صاحب ہی نے شروع کیا ہے اور ان مشاعروں میں چین کے واحد اردو شاعر انتخاب عالم ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور داد پاتے ہیں۔

رئیس امروہوی(●)

''وقت دریا ہے''

جناب انتخاب عالم کے کلام سے چنیدہ اشعار

عروب شاہد
(راولپنڈی)

ٹوٹ جاتا ہے قلم حرف مگر رہتا ہے
پاؤں چلتے ہیں مگر نقش ٹھہر جاتا ہے
وقت دریا ہے کوئی جھیل نہیں ہے عالم
راہ میں غم ہو، خوشی ہو، یہ گزر جاتا ہے

○

غالبًا چینی سے بھی شیریں ہے اردو دیکھئے
چین کا عالم بھی اب اس میں غزل خواں ہو گیا

○

آدمی دھوپ میں ہو زیرِ شجر جائے گا
دھوپ میں ہے جو شجر خود وہ کدھر جائے گا
وہ جو نکلا ہے تری بزم سے، گھر جائے گا
کوئی گھر دل کا نہیں ہے وہ کدھر جائے گا
راہِ دریا سے چٹانیں بھی پرے ہٹتی ہیں
راستہ پاؤں تلے آپ سنور جائے گا

○

دروں بزمِ یاراں ہوں مگر ہوں کس قدر تنہا
شریکِ کارواں ہو کر بھی کرتا ہوں سفر تنہا
مقدّر مثلِ انساں ہے پرستار زر و دولت
مصیبت میں نہیں آتی مصیبت کی خبر تنہا
مجھے حاصل رہی تیری رفاقت زندگانی بھر
ترے ہوتے ہوئے لیکن رہا میں عمر بھر تنہا

فراقِ یار میں ہم کیا کمال کرتے ہیں
گھڑی کو کاٹ کے ہم ماہ و سال کرتے ہیں
کتابِ دہر میں جس کا جواب درج نہیں
تمام عمر وہی ہم سوال کرتے ہیں
مثالِ نخلِ خزاں دیدہ، خود کو ہم عالم
زوالِ حال سے ہی لازاول کرتے ہیں

○

قرارِ دل کا عجب انتظام کرتے ہیں
کہ آئینے سے سدا ہم کلام کرتے ہیں
یہ بت ہمارے تراشے ہوئے ہیں ان کا مگر
ہمیشہ خوف سے ہم احترام کرتے ہیں
خیالِ ذات کی فرصت کہاں کہ ہم عالم
کسی کا ذکر سحر تا بہ شام کرتے ہیں

○

کبھی نہیں کے بجائے ذرا کہو ''ہاں'' بھی
''نہیں'' کے لفظ سے یہ لفظ مختصر تو ہے

○

مجھے کس درجہ عادت پڑ چکی ہے دھوکا کھانے کی
کوئی آتا نہیں تو در کو خود ہی کھٹکھٹاتا ہوں
پڑے ہیں ڈھیر سارے کام، تھوڑی عمر باقی ہے
حصولِ وقت کی خاطر گھڑی الٹی گھماتا ہوں

بہت پڑھا ہے رخِ یار، کچھ نہیں سمجھا
یہ صرف غیر پہ کھلتی کوئی کتاب نہ ہو
میں دیکھتا ہوں کبھی آئینہ، کبھی مہماں
ادھر ضعیفی نہ ہو، یا ادھر شباب نہ ہو

○

شاعری کرتے ہیں ہم عالمِ زبانِ یار میں
ہے زبانِ یار یہ اردو زبان ہم کیا کریں

○

وقتِ وصالِ یار بھی آتا ہے دیر سے
یہ چیز بھی جھجکنے لگی یار کی طرح

○

اس وقت تجھ سے مل کے بہت دکھ ہوا مجھے
کس درجہ نیک کام میں تاخیر ہو گئی

○

دیتا ہے شجر اپنے ثمر کو سر کو جھکا کر
پر لوگ ثمر توڑتے ہیں سر کر اٹھا کر

○

ابر رویا تشنہ کاموں کو زمیں پر دیکھ کر
عازمِ ساحل ہوا دریا یہ منظر دیکھ کر

○

بہت کرتا ہے شور و غل، کبھی نکلا نہ ساحل سے
سمندر بھی مثال آدمی کم حوصلہ ٹھہرا

○

مری یہ سادگی دیکھو کہ دل کو دل سمجھتا ہوں
وہ پتھر ہی سہی، سجدے کے میں قابل سمجھتا ہوں

کب سکوں ملتا ہے اس پرشور شہرِ عشق میں
خواب میں اکثر پکار آتی ہے کوئے یار سے
مجھ کو کچھ احساسِ تنہائی نہیں تیرے بغیر
بات کرتا ہوں کبھی در سے کبھی دیوار سے

○

دنیا میں کوئی ایسی مکمل کتاب ہو
جس میں میرے سوال کا کوئی جواب ہو

○

تُو کہ ہے فخرِ زمیں اپنے جلال و جاہ میں
کوئی شے جچتی نہیں تجھ بن نگاہِ ماہ میں
گو بنی ہے خاک سے تُو، ایستادہ خاک پر
عکس اپنا ڈالتی ہے تُو مگر افلاک پر

○

طالبِ نشتر تھی کل اپنی یہ دنیا جس طرح
دے رہی ہے اب بھی شیشوں کے مسیحا کو صدا
پاسِ وعدہ کر ذرا اے شاعرِ نوروسحر
پھر قلم کی لرزشوں سے سونے والوں کو جگا

○

تیری ہر اک نظم میں گنجینۂ معنی نہاں
ہر غزل جذبات کا ہے موجزن سیلِ رواں
گوہروں کا اک خزینہ ہے ترا ہر شاہکار
ساحرانہ ہے زباں، ہے منفرد طرزِ بیاں

○

کوئی کہتا ہے فنا ہو جائے گا مر کر بشر
قلبِ دنیا میں ہے تیری زندگانی جاوداں

''وصالِ یار''

چانگ شی شوان

(انتخاب عالم)

پاکستان کے ایک چینی دوست کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تجربے کے حوالے سے چین پاک دوستی کی قصیدہ خوانی کروں، لیکن اس دفعہ میں معمول کے برعکس آپ کو نظم کے بجائے نثر پیش کروں گا جو ایک طرح کا سفرنامہ ہے۔

''آپ چینی تو ہیں نا؟''

مارچ ۱۹۸۸ء کے ایک دن کا ذکر ہے احمد ندیم قاسمی صاحب کی ۷۲ویں سالگرہ کے موقع پر ان کی ادبی خدمات کے بارے میں ابوظہبی میں منعقدہ مشاعرے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے ایک پرانے پاکستانی دوست جمیل اختر صاحب کے اصرار پر دوبئ گیا اور وہاں ان کے گھر میں دو دن ٹھہرا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے بازار کی سیر کروائی۔ چونکہ خاتونِ خانہ جو وہاں کے پاکستان اسکول میں ٹیچر ہیں، گھر کی گاڑی اسکول لے گئی تھیں اس لئے ہم نے ٹیکسی میں سفر کیا۔ بازار جانے کے راستے میں جب میں نے اور ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دوسرے کا تعلق معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ بازار پہنچ کر جب میں اور جمیل صاحب ایک دوسرے کو کرایہ دینے سے منع کر کے خود اپنی جیب سے دینے لگے تو ڈرائیور نے ہم دونوں کو کرایہ دینے سے منع کیا۔ جب میں نے کرایہ دینے پر اصرار کرتے ہوئے پوچھا ''کرایہ کیوں نہیں لیتے؟ کیا میرا پیسہ پیسہ نہیں ہے؟'' تو جواباً بولا: ''آپ کا پیسہ پیسہ تو ہے لیکن آپ چینی تو ہیں نا؟ چینی ہمارے بھائی ہیں، ہم بھائیوں سے کرایہ نہیں لیتے'' مجھے یہ چند فقرے بے حد خیال انگیز شعر لگے۔

اردو بولنے کا فائدہ

ابوظہبی میں منعقدہ مذکورہ بالا سیمینار اور مشاعرے میں شریک شعراء و ادبا نے فرخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقِ مہر کے طور پر مجھے اپنی اپنی تصانیف سے نوازا اور میں نے انہیں بہ صد مسرت اور بلا تکلیف قبول کیا۔ جب چین واپس آنے کا وقت آیا تو وہ مسرت پریشانی کا باعث بن گئی۔ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اُنہیں کیسے چین لاؤں۔ کیونکہ دنیا بھر کی تمام ائیر لائن کمپنیوں کا ایک مشترکہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ہر مسافر کو اپنے ساتھ صرف ۲۴ کلو سامان بھیجنے کی اجازت ہے، جبکہ میرے سامان کا وزن کم سے کم پچپن ساٹھ کلو تھا۔ چنانچہ شارجہ ائرپورٹ پر میں نے ۲۴ کلو سامان بھیجا اور باقی تیس پینتیس کلو سامان کو کندھے پر اٹھائے کسٹمز چینل سے گزرنے لگا۔ مجھے بھاری بوجھ تلے ہانپتے ہوئے دیکھ کر ائیرپورٹ کے ایک صاحب کو مجھ پر ترس آیا اور انگریزی میں مجھ سے پوچھا ''ویر آر یو گوئنگ'' میں نے اردو میں جواب دیا ''چین واپس جا رہا ہوں'' خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ صاحبِ موصوف بھی اردو بولنے لگے۔ ''اتنے بھاری سامان کو الگ بھیجنے کے بجائے کیوں کندھے پر اٹھائے جا رہے ہیں؟'' میں نے عرض کیا ''قاعدے کے مطابق صرف ۲۴ کلو بھیجا جا سکتا ہے اور اتنا تو میں بھیج چکا ہوں'' بولے: ''قاعدہ تو قاعدہ ہے لیکن آپ تو اردو بولنے والے ہیں نا؟'' چنانچہ میں اپنے بھاری سامان سے سبکدوش ہو گیا۔

بندر بننے سے بال بال بچا

مئی ۱۹۹۱ء میں میں نے چین اور پاکستان کے سفارتی تعلقات کے قیام کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر حکومتِ پاکستان کی دعوت پر اس کے خوبصورت ملک کا دورہ کیا۔ پروگرام میں بالترتیب کشمیر، پشاور، لاہور اور کراچی کی سیر شامل تھی۔ ظاہر ہے اسلام آباد دورے کا نقطہ ہی آغاز بھی تھا اور منتہا بھی۔ لاہور میں رہنے والے عطاء الحق قاسمی صاحب، جو اپنی زندہ دلی اور خوش کلامی و خوش قلمی کے علاوہ دوست پروری اور مہمان نوازی کی وجہ سے بھی مشہور ہیں میرے پرانے یار ہیں۔ جب انہیں خبر ملی کہ میں لاہور کا دورہ کروں گا تو کہہ اٹھے کہ مجھے کندھے پر اٹھا کر ائیرپورٹ سے ہوٹل تک پہنچا دیں گے۔ یہ سن کر مجھے بے حد خوشی تو ہوئی، لیکن قدرے پریشانی بھی دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ یار واقعتاً مجھے بندر کی طرح کندھے پر نہ اٹھائیں۔ کیونکہ میرے مشاہدے کے مطابق ان کی محبت ان کے مزاج کی طرح زندہ دلانہ اور ان کے کلام کی طرح ظریفانہ ہے۔ چنانچہ میں لاہور کے ائیرپورٹ پر ان کا اور میرا خیر مقدم کرنے والے ایک اور صاحب ڈاکٹر حسن رضوی کے ہمراہ لاؤنج سے نکلتے ہی بھاگم بھاگ گاڑی کی طرف بڑھا اور دروازے کے کھلتے ہی جھٹ سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یوں بندر بننے سے بال بال بچ گیا۔

ایک نوجوان ہم سفر

لاہور کے مذکورہ دو روزہ دورے کے دوران عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھ سے کہا چند دنوں کے بعد پنجاب کے کئی شہروں میں عالمی مشاعروں کا اہتمام ہوگا، آپ بھی آیئے اور ہمارے ساتھ مشاعرے پڑھیئے ان کی اس مخلصانہ دعوت اور دوستانہ حکم کی تعمیل کی غرض سے حکومتِ پاکستان کے مرتب کردہ پروگرام کے ختم ہونے پر میں دوبارہ عازمِ لاہور ہوا۔

پچھلی دفعہ میں ہائی ایئر لاہور گیا۔ ابھی ٹھیک طریقے سے نہیں بیٹھ پایا تھا کہ اترنا پڑا جس کی وجہ سے راستے میں سرزمینِ پنجاب پر ایک سرسری نظر

ڈالنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔ چنانچہ اس دفعہ روانگی سے پہلے میں نے ارادہ کرلیا کہ اب بائی بس سفر کروں گا۔ بس میں بیٹھتے ہی ایک نوجوان ہم سفر پر تجسس لہجے میں مجھ سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ ''آپ چینی ہیں؟'' یہ وہی وقت تھا جب سندھ میں تین جاپانی طالب علموں اور دو چینی انجینئروں کو اغوا کیا گیا تھا۔ ان دو حادثات کے پیش نظر میں نے ازراہِ مزاح جواباً سوال کیا ''جب چینی اور جاپانی سب اغوا کے نشانے ہیں، تو ان میں کیا فرق رہ گیا؟'' نوجوان نے شرمندہ ہو کر میری دانستہ غلط فہمی کو دور کنے کی کوشش کی، نہیں نہیں ہم آپ کو اغوا نہیں کرتے۔ جرمِ اغوا کا ارتکاب محض غنڈے ہی کرتے ہیں اور وہ بھی گنتی کے ہیں۔ راستے بھر میں ہمارے درمیان گفتگو جاری رہی جس میں دوستی اور بے تکلفی کا رنگ فقرہ بہ فقرہ نمایاں ہوتا گیا۔ لاہور پہنچ کر وہ پہلے مجھے اپنے گھر لے گیا جہاں اس نے مجھے اپنے والد سے ملایا اور چائے وائے پلائی۔ پھر مجھے اپنے اسکوٹر کے پیچھے بٹھا کے عطاالحق قاسمی صاحب کے ہاں پہنچا دیا۔ بعد ازاں اس ہم سفر کی معصوم صورت ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہوگئی۔

ناشتہ کی دعوت

عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھے ہوٹل میں ٹھہرانے کے بجائے اپنے گھر میں مفت قیام وطعام کے ساتھ ٹھہرا دیا۔ بقول ان کے گھر میں رہتے ہوئے ایک طرف مل بیٹھنے اور گپ شپ مارنے کا زیادہ وقت مل سکے گا۔ دوسری طرف باہم رابطہ قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے بعد میں نے شعرائے لاہور کے لشکر میں شامل ہو کر مردان، فیصل آباد، میاں چنوں اور پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے مشاعرے پڑھے۔ مشاعروں کے درمیانی وقفوں میں میں عطاء الحق قاسمی کے گھر میں رہ کر شعرائے لاہور کے دوش بدوش دو مشاغل میں محو رہا۔ اول مختلف ادبی تنظیموں اور خاندانوں کی شعری نشستوں میں شرکت کرنا۔ دوم، دعوتوں پر دعوتیں کھانا۔ دراصل یہ دو مشاغل ایک ہی مشغلے کے دو باہم مربوط حصے ہیں۔ ان دنوں اتنی زیادہ دعوتیں کھائی گئیں کہ آخر کار دہن اور شکم میں جھگڑا ہونے لگا کیونکہ دہن تو ہر دعوت کھانے پر راضی و آمادہ رہا جبکہ شکم مسلسل محنتِ شاقہ کی تاب نہ لا کر شکایت کرنے لگا۔ چنانچہ ایک شام ڈنر کھانے کے بعد میں نے یہ عہد کرلیا کہ کل صبح ناشتے سے پرہیز کر کے ایک تہائی روزہ رکھوں گا۔ لیکن رات کو سونے سے پہلے اچانک اطلاع ملی کہ صبح کسی دوست کے گھر میں ناشتہ کرنا ہے۔ چنانچہ مجھے میزبان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے پیٹ کی منت سماجت کرنی پڑی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ میزبان موصوف کسی شام یا دوپہر کو ہماری دعوت کرنا چاہتے تھے لیکن ہماری تمام شاموں اور دوپہروں پر دوسرے لوگوں نے پہلے سے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھے اس دعوتِ ناشتہ کے آئینے میں ایک دوست نواز دل کا عکس دکھائی دیا۔

بابا کو اعتراض ہے

ستمبر ۱۹۹۳ء میں میں نے ایلیٹس کالج کے زیر اہتمام کراچی میں منعقدہ عالمی اردو کانفرنس اور پانچویں سالانہ عالمی مشاعرے میں حصہ لیا۔ پہلے کراچی سے لاہور اور پھر لاہور سے اسلام آباد جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن کراچی میں مذکورہ مشاعرے کے بعد پھر کئی مشاعرے ہوئے جن میں شرکت کے لئے بھی مجھے پر خلوص دعوت نامے موصول ہوئے۔ چونکہ مجھے ایک تنظیم کے مشاعرے میں شرکت کر کے دوسری تنظیموں کے مشاعروں میں شرکت کی دعوت سے انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔ اس لئے کراچی میں مزید پانچ دن ٹھہرا۔ اس طرح لاہور جانے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ جب میں نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں سامان اتار کر آفتاب شمیم صاحب کو فون کیا تو وہ گاڑی بھیج کر مجھے میرے سامان سمیت اپنے گھر لے آئے۔ اسی شام افتخار عارف صاحب اور ظفر بختاوری صاحب نے اکادمی ادبیات اور کلچرل فورم کی طرف سے میرے اعزاز میں شعری نشست کا اہتمام کیا چنانچہ میں اپنے دل میں منوں شکریہ لے کر ایک بار پھر ان کے زیرِ بار آیا۔ دوسری شام جو اسلام آباد میں میری آخری شام بھی تھی، آفتاب صاحب نے اپنے گھر میں شعری نشست کا اہتمام کیا جس میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی منہ بولی صاحبزادی محترمہ منصورہ احمد بھی تشریف فرما ہوئیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگیں ''بابا کو پتہ ہے کہ آپ پاکستان آئے ہوئے ہیں، لاہور کیوں نہیں آئے؟ بابا کو آپ سے اعتراض ہے''۔ میں نے اپنی مجبوری کی وضاحت کی، ان سے معافی مانگی اور ان سے وعدہ کیا کہ اگلی دفعہ اگر دورۂ پاکستان کا اتفاق ہوا تو سب سے پہلے لاہور جاؤں گا۔ دراصل میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا بے حد احترام کرتا ہوں اور ان کی صحت مندی اور درازی عمر کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ انہوں نے نہ صرف اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں بلکہ سال ہا سال سے مجھے فون کے پرچے بھیج کر میرے ادبی و شعری ذوق کی آبیاری بھی کی ہے۔ میں ان کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔

''کیا آپ چینی بھی سمجھتے ہیں؟''

جولائی ۱۹۹۵ء میں قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا کے صدر ڈاکٹر محمد افضل نے چائنیز اکیڈمی آف سائنسز کی دعوت پر چین کا دورہ کیا۔ وہ سائنس دان ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے بیجنگ کے شی یوان ہوٹل سے مجھے فون کیا۔ چونکہ وہ ہوٹل کے نام کا تلفظ صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکے، اس لئے میں نے گزارش کی کہ کسی بیرے سے بات کروائیں۔ بولے ''سارے بیرے چینی ہیں، کیا آپ بھی چینی سمجھتے ہیں؟'' میں نے عرض کیا میں نہ صرف چینی سمجھتا ہوں، بلکہ خود چینی ہوں۔ حیران ہو کر بولے۔ ارے آپ تو انتخاب عالم ہیں نا؟ کیسے چینی ہو گئے؟ میں نے وضاحت کی میں شروع ہی سے چینی ہوں۔ بس پہلے خالص و سالم چینی تھا بعد میں آدھا چینی اور آدھا پاکستانی ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ خوبصورت غلط فہمی میرے لئے ایک دیرپا خوشی کا باعث بن گئی۔

براہِ راست

اگر اس خیال سے اتفاق کر لیا جائے کہ فن اور فنکار کی کوئی حد اور سرحد نہیں ہوتی تو جناب چانگ شی شوان عرف انتخاب عالم صاحب اس خیال پر نہ صرف پورا اترتے بلکہ اس کی عملی تصویر و تشہیر بن کر تن تنہا عظیم تر چین میں اردو ادب کا علم تھام کر پوری دنیا کو ''داغ'' کی زبان میں یہ بتلا اور جتلا رہے ہیں کہ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس بات میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں کہ جناب انتخاب عالم اپنی محنت اور لگن سے اردو ادب میں ایک منفرد مقام پر متمکن ہو چکے ہیں! زیرِ نظر اشاعت کا منشا و مقصود فقط یہ ہے کہ انتخاب عالم صاحب کے طویل علمی، ادبی اور شعری سفر کو مربوط شکل میں ادب کے تمام حلقوں تک اس طرح پہنچایا جائے کہ موجودہ وقت کے ساتھ آنے والے وقت میں بھی انتخاب صاحب کی نسبت تحقیقی، تنقیدی جستجو کے حامل احباب کو باہم سہولت دستیاب رہے!! ہماری کوشش اور کاوش کی کامیابی کا انحصار آپ کی وسعتِ نظر سے مشروط ہے!!!

گلزار جاوید

☆ اردو زبان وادب سے آپ کا تعارف کیونکر ہوا۔ اس تعارف کو تعلق بنانے کی غرض سے آپ کو کیا کیا جتن کرنا پڑے؟

☆☆ میں ستمبر ۱۹۶۰ء میں صحافت پڑھنے کے لیے چین کے بیجنگ براڈ کاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ مین داخل ہوا۔ مارچ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں یعنی شعبہ صحافت سے گریجویٹ سے سوا سال قبل انسٹی ٹیوٹ کی انتظامیہ نے بدلی ہوئی بین الاقوامی صورتِ حال کے پیشِ نظر حکومت چین کے ایما پر مجھے اردو سکھوانے کے لیے شعبۂ صحافت سے شعبۂ زبان ہائے غیر ملکی میں بھیج دیا جہاں میرا خاص مضمون اردو تھا۔ اس طرح اردو سے واسطہ ہوا جس سے پہلے میں نے اردو کا نام تک نہ سنا تھا۔ اردو کا کورس چار سال کا تھا۔ اردو کی یہ جماعت شروع میں نو طلبا پر مشتمل تھی جن میں سے چھ اسی انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ صحافت سے اور باقی تین چائنا ریڈیو انٹرنیشنل کے شعبۂ انگریزی اور شعبۂ ہندی سے آئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد دو طلبا مختلف وجوہات کی بنا پر ہم سے بچھڑ گئے۔ ہمارے استاد کفیل احمد خان صاحب تھے۔ ستمبر ۱۹۶۷ء میں ہم فارغ التحصیل ہو کر چین کے مختلف سرکاری اداروں میں ملازم ہو گئے (اس زمانے میں چین میں سارے ادارے سرکاری یا اجتماعی تھے۔ نجی اور غیر ملکی ۱۹۷۸ء کے بعد نافذ ہونے والی اوپن پالیسی اور اصلاحات کی پیداوار ہیں) میں چین کے ایک سرکاری جریدے ''چائنا پکٹوریل'' کے نئے نئے قائم شعبہ اردو کا ایک کارکن بن گیا جس کا کام اردو ماہنامہ ''چین باتصویر'' نکالنا تھا۔ میں عمر بھر اسی شعبے سے وابستہ رہا۔ کام کے دوران ایک طرف اردو ادب پڑھتا رہا دوسری طرف بولنے لکھنے کی مشق کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جہاں مجھے اردو پر رفتہ رفتہ عبور حاصل ہوتا گیا وہاں اردو ادب پڑھنے کا شوق بھی بڑھتا چلا گیا، ہوتے ہوتے اردو میں شعر گوئی کی خواہش دل میں کروٹیں لینے لگی۔ جب باقاعدہ غزل کہنے لگا تو اردو سے میرا سرسری تعارف ایک مستقل و مستحکم رشتے میں ڈھل گیا۔

☆ جب آپ اس زبانِ لطیف کی زلفوں کے اسیر ہوئے اس وقت چینی ادب سے آپ کا تعلق کس نوعیت کا تھا اور آج صورت حال کیا ہے؟

☆☆ جس وقت زلفِ اردو کا اسیر ہوا اس وقت میرا میلان چینی ادب کی طرف تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ شاعری پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ میں نے بچپن میں اپنے دادا جو ایک دیہاتی معلم تھے کی نگرانی میں چینی شاعری پڑھنا شروع کی۔ اس دوران چینی علمِ عروض کا بھی سطحی سا مطالعہ کیا۔ بیجنگ براڈ کاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ صحافت میں پڑھنے کے دوران ایک آدھ افسانہ بھی لکھ ڈالا۔ ایک دفعہ ہمارے مضمون نویسی کے پروفیسر جناب شی یوئی ہوا نے کلاس میں تمام طلبا کے سامنے میرے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''چانگ شی شوان کا اپنا ایک خاص طرزِ تحریر بن چکا ہے''۔ بعد میں افسانہ نگاری کی کونپل کو پنپنے کا موقع میسر نہ آیا، بس کبھی کبھی شعر کہا کرتا ہوں۔

☆ حامد علی ہاشمی صاحب نے آپ کے چینی نام کے معنیٰ کب بتلائے اور آپ نے اس نئے نام کو کس طور اختیار کیا نیز آپ کے اس اردو نام کی چین میں قانونی حیثیت کیا ہے؟

☆☆ حامد علی ہاشمی مرحوم جولائی ۱۹۷۱ء سے مئی ۱۹۷۵ء تک مذکورہ بالا ماہنامے ''چین باتصویر'' میں غیر ملکی مدیر کے عہدے پر فائز رہے۔ یہ رسالہ چینی سمیت انیس زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ ہر زبان کا ایک شعبہ تھا۔ شعبہ اردو میں حامد علی ہاشمی مرحوم کے علاوہ چند چینی کارکن بھی تھے جن میں سے ایک میں تھا۔ چونکہ چینی نام یاد کرنا پاکستانی دوستوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے چین میں رہنے والے بیشتر پاکستانی دوست اپنے چینی ساتھیوں اور شاگردوں کا ایک ایک

اردو نام رکھنا پسند کرتے ہیں۔ چینیوں کے نام رکھنے کا آسان طریقہ ان کے چینی ناموں کا ترجمہ کرنا ہے۔ انتخاب عالم میرے ذاتی چینی نام کا اردو ترجمہ ہے جبکہ میرا خاندانی نام چانگ ہے۔ حامد علی ہاشمی مرحوم نے میرے چینی نام کا صحیح ترجمہ کیا جو بہت جلد چین میں مقیم پاکستانی دوستوں میں پھیل گیا۔ بعد میں جب میں نے غزل میں طبع آزمائی شروع کی تو عالم میرا تخلص بن گیا۔ چونکہ یہ نام چینی محکمۂ تحفظ عامہ میں رجسٹرڈ نہیں کیا گیا اس لئے پاسپورٹ، آئی ڈی کارڈ اور سرکاری دستاویزات میں یہ نہیں لکھا جاتا۔ گویا میرا یہ نام صرف پاکستانیوں، بھارتیوں اور اردو بولنے والے دوسرے افراد کے لئے مخصوص ہے۔

☆ آپ کی اردو دوستی کی نسبت اہلِ خانہ، اقرباء اور اہلِ وطن کس طرح کا حسن ظن رکھتے ہیں؟

☆☆ ہمارے اہلِ خانہ، اقرباء اور اہلِ وطن میری اردو دوستی کی نہ تو تعریف کرتے ہیں نہ ہی مخالفت۔ بس کبھی کبھی اظہارِ تعجب کرتے ہیں۔ ایک خالص چینی کا اردو میں شاعری کرنا ناقابلِ تصور!

☆ آپ کی حسِ مزاح اور چونچال طبیعت کے باعث بہت سے احباب آپ کو ٹھیٹھ لاہوریا گردانتے ہیں۔ اس کا مطلب خدانخواستہ یہ تو نہیں کہ عوامی جمہوریہ چین میں لاہور کی طرز کا کوئی زندہ دل شہر نہ ہے یا چینی لوگ حسِ مزاح سے بے بہرہ ہیں؟

☆☆ جیسا دیس ویسا بھیس۔ آپ کی منطق الٹی ہوگئی ہے۔ میری حسِ مزاح اور چونچال طبیعت اس بات کا ثبوت نہیں کہ چینی لوگ حسِ مزاح سے بے بہرہ ہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چینی لوگ یا بہت سے چینی لوگ زندہ دل ہیں۔ انسان کے مزاج پر اپنے ماحول کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ لاہوریے صرف لاہور کی پیداوار ہیں۔ دراصل مزاح چینی لوگوں کی زندگی کا اہم جزوِ ترکیبی ہے۔ چین کے ٹی وی پروگراموں میں مزاحیہ پروگراموں کا تناسب خاصا زیادہ ہے۔ مزاح کے فنکار چینی تماشائیوں میں خاصے مقبول ہیں۔

☆ پروفیسر صاحب! اس اطلاع میں کہاں تک صداقت ہے کہ اس نئے تعلق کے بعد آپ خواب بھی اردو میں دیکھا کرتے ہیں۔ کس طرح کے ہوتے ہیں یہ خواب اور اُن کی تعبیر کیا ہوا کرتی ہے؟

☆☆ ایک زمانے میں چین میں مقیم پاکستانی سفارت خانے میں ضیغم محمود نام کے ایک کمرشل کونسلر تھے جن کا مزاحیہ کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے دولت خانے میں ایک چھوٹی محفل منعقد ہوئی جس میں انہوں نے مجھ سے پوچھا ''چانگ صاحب، آپ خواب بھی اردو میں دیکھتے ہیں؟'' محفل میں شریک کسی یار نے ازراہِ محبت اس جملے کا سوالیہ نشان مٹا کر محفل سے باہر پھیلا دیا۔ رفتہ رفتہ یہ چین سے پھیل کر پاکستان میں پہنچ گیا اور ایک دوستانہ سوال پیار بھرے جواب کا روپ اختیار کر گیا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مجھے اردو سے والہانہ محبت ہے جس کی بنا پر یہ مبالغہ آمیز خوبصورت افواہ پھیل سکی۔

☆ یہ تاثر اگر درست ہے کہ اردو ادب نے آپ سے بہت سی چینی روایات ترک کرادی ہیں تو ہم ترک کردہ چینی روایات کی بابت ضرور جاننا چاہیں گے؟

☆☆ اردو ادب نے صرف میری رات کو جلدی سو جانے کی عادت ترک کروادی ہے۔ رات کو جلدی سونا اور صبح سویرے جاگ کر اٹھنا عام چینیوں کی قدیم روایات میں سے ایک ہے جو صحت کے لیے بڑی مفید ہے۔

☆ جس سبب آپ سے دانستہ یا غیر دانستہ یہ عمل سرزد ہوا اُس زبان، تہذیب اور ثقافت کے کچھ طور طریق بھی یقیناً آپ کے روزمرہ میں شامل ہونا چاہئیں؟

☆☆ اردو زبان و ادب کے وسیلے سے پاکستانی تہذیب و ثقافت کے کچھ طور طریق واقعی میرے روزمرہ میں داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً عام چینی یاسمین ٹی یا گرین ٹی پینا پسند کرتے ہیں لیکن میں سبز چائے کے علاوہ پاکستانیوں کی طرح دودھ ملی بلیک ٹی بھی پیا کرتا ہوں۔ عام چینی تیز آنچ پر کم تیل میں جلدی تلی ہوئی سبزیاں اور اسی طریقے سے پکائی ہوئی گوشت کی بوٹیاں کھانا پسند کرتے ہیں لیکن میں ان کھانوں کے علاوہ کبھی کبھی گھر میں سالن، قیمے کے ساتھ مٹر، گرم مسالے کے ساتھ چکن اور آلو گوشت وغیرہ پاکستانی کھانے بھی پکایا کرتا ہوں جنہیں میرے علاوہ کچھ اہلِ خانہ بھی پسند کرتے ہیں جن میں سے میری بیٹی اور میرا پوتا پیش پیش ہیں۔

☆ ایک زمانے میں پورے چین کے اندر آپ اردو کے اکلوتے شاعر تھے۔ اب جب کہ وہ ننھا پودا گھنا شجر بن چکا ہے اُس کے ثمرات کہاں تک پھلے پھولے ہیں؟

☆☆ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں پورے چین میں راقم الحروف اردو کا واحد شاعر تھا، کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ پاکستان میں مقیم سابق چینی سفیر جناب لوشولین بھی اردو میں شعر کہتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کے بعد چین کی وسیع و عریض سرزمین کی حدود میں اردو کا کوئی نیا شاعر نظر نہ آیا۔

☆ اردو زبان کے کئی قدآور اہلِ قلم غزل کی نسبت کئی طرح کے تحفظات رکھتے اور اس صنف کو ازکارِ رفتہ گردانتے ہیں اس کے باوجود آپ نے غزل سے عمر بھر کا رشتہ قائم کرلیا؟

☆☆ پسند اپنی ہوتی ہے۔ غزل اردو شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ ٹھیک ہے کہ نظم کے مقابلے میں اس کی قوتِ اظہار ذرا کم ہے لیکن اس کی اپنی بہت سی خوبیاں بھی ہیں مثلاً اس کا ہر ایک شعر ایک مکمل مطلب ادا کرسکتا ہے۔ سامعین غزل کے ہر شعر کو سننے کے فوراً بعد ہی اس کے معنی سمجھ لیتے ہیں جبکہ نظم کے تمام اشعار باہم مل کر ایک مطلب ادا کرتے ہیں، اگر ان میں سے ایک مصرع کو نکال دیا جائے تو پوری نظم ناقص ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ سامعین جب تک پوری نظم نہیں سن پاتے تب تک نظم ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ ضروری

نہیں تمام پرانی چیزیں خراب اور تمام نئی چیزیں اچھی ہوں۔ مارکسی جدلیات کے مطابق ہر شے کے منفی اور مثبت دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ ہر نئی چیز پرانی چیز سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں کے بغیر بیٹا پیدا نہیں ہوتا۔ ماؤزے تنگ نے ۱۹۵۷ء میں چینی ادب وفن کو فروغ دینے کیلئے چینی ادیبوں اور فنکاروں کو یہ دعوت عمل دی ''قدیم چیزوں سے جدید چیزیں پیدا کرو اور سینکڑوں اقسام کے پھولوں کو ایک ساتھ کھلنے دو'' میرا خیال ہے یہ دعوت عمل ایک آفاقی اصول ہے اس لئے غزل کی تخلیق پر بھی صادق آتی ہے۔

☆ جدید دور میں اردو شاعری سے ناتا جوڑنے کے باوجود آپ کے ہاں اردو غزل کی پوری کلاسیکی روایت کیونکر در آئی؟

☆☆ ایک یہ کہ غزل کی اپنی بہت سی خوبیاں ہیں جنہیں میں پچھلے سوال کے جواب میں عرض کر چکا ہوں، دوسرے یہ کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اردو کی جو شاعری پڑھی ہے اس کا بیشتر حصہ غزل پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ بنیادی طور پر شاعری کی تاریخ ہے جبکہ شاعری کی تاریخ بنیادی طور پر غزل ہی کی تاریخ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اکثر غزل پڑھا کرے اور اس سے متاثر نہ ہو۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ کی غزل پر ایک خاص نظریے کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے اُس نظریے اور آپ کی شخصیت پر اُس کے اثرات کی بابت تفصیل سے بتلایئے؟

☆☆ ادب کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ اسے سماج کے بنیادی مسائل کی عکاسی کرنا محتاج طبقوں سے ہمدردی کا اظہار کرنا اور اپنے دل کی آواز سنانی چاہیے۔ میری غزلوں اور نظموں میں میرے دل کی دھڑکنوں کی گونج کے علاوہ دورِ حاضر کے کچھ مسائل کی جھلکیں بھی ملتی ہیں۔

☆ اگر یہ تاثر درست ہے کہ بیجنگ کے تن مَن اسکوائر کے ایک واقعے نے آپ کی شاعری کو مہمیز دی ہے تو کیا یہ ایک اچھے چینی شہری کے لیے فخر کی بات ہونا چاہیے؟

☆☆ دنیا میں روز ایسے بہت سے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے لوگ متاثر ہوتے ہیں، شاعر اور ادیب بھی مستثنیٰ نہیں۔ میرا نظریہ ہے کہ ہر ملک کے ہر اچھے شہری کو اپنے ملک کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اسے اپنے کئے پر فخر کرنا چاہیے۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ دانستہ طور پر نہایت دشوار ردیفیں استعمال کر کے اپنی مہارت ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ محض ایک غلط قیاس ہے۔

☆ آپ کے ہاں ایک ہی وقت میں روایتی اسلوب اور نئے عہد کی دھوپ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ میری شاعری کا یہ گنگا جمنی رنگ اس لئے پیدا ہوا کہ میں شاعری کی روایتی صنف یعنی غزل میں اپنے زمانے کی نئی نئی باتیں کرتا ہوں۔

☆ فارسی علم العروض پر بھی آپ کی دسترس حیران کُن ہے یہ کمال کب' کہاں اور کیسے حاصل ہوا؟

☆☆ اردو کا علم العروض دراصل فارسی کا علم العروض ہے۔ مجھے بس مختلف بحروں میں شعر کہنا آتا ہے۔ نہ میں فارسی کے علم العروض پر حیران کن حد تک دسترس رکھتا ہوں نہ میں اپنے اس حقیر ہنر کو کوئی کمال سمجھتا ہوں۔ مجھے عروض سے جو تھوڑی واقفیت حاصل ہے وہ دو پاکستانی دوستوں کی عنایت ہے۔ ایک مظفر حسین رزمی مرحوم دوسرے راغب مراد آبادی صاحب۔ قصہ کچھ یوں تھا۔ ۱۹۷۶ء میں ماؤزے تنگ کا انتقال ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر (بیجنگ) کے شعبہ اُردو میں ملازم پاکستانی دوست مظفر حسین رزمی مرحوم نے ماؤزے تنگ کی نظموں کے انگریزی ترجمے کو اردو میں منتقل کیا۔ ۱۹۷۸ء میں غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر ''چائنا پکٹوریل'' اور چائنا ریڈیو انٹرنیشنل تینوں اداروں کے شعبہ جاتِ اردو کے ایک ایک نمائندے اور رزمی صاحب پر مشتمل ایک چار افرادی گروپ قائم کیا گیا جس کا کام ماؤزے تنگ کی نظموں کے اردو ترجمے کی معنوی اعتبار سے جانچ پڑتال کرنا تھا۔ میں اس گروپ کا ایک رکن تھا۔ ''جانچ پڑتال'' کے دوران رزمی صاحب نے ہر نظم کی بحر بتائی اور ہم نے ہر مصرع کی تقطیع کی۔ جب پوری کتاب کے ترجمے کی جانچ ختم ہوئی تو میں شعر کہنے لگا۔ ۱۹۷۹ء میں میں اور پروفیسر آفتاب اقبال شمیم نے مل کر اس کتاب کے ترجمے پر آخری نظر ثانی کی۔ اس کام کے ختم ہونے پر میں نے آفتاب صاحب کو ایک نوحہ سنایا جو میری اردو میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز بنا۔ ۱۹۸۸ء کے موسم سرما میں راغب مراد آبادی صاحب چین میں مقیم پاکستانی سفیر محمد اکرم ذکی کے مہمان کی حیثیت سے بیجنگ تشریف لائے اور انہی کے گھر میں ٹھہرے۔ ایک دفعہ وہ پاکستانی سفارت خانے کے کلچرا تاشی کے ساتھ میرے دفتر میں آ پہنچے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے اور کچھ فی البدیہہ شعر کہے۔ ایک ہفتہ بعد میں ہسپتال میں داخل ہوا۔ اس کے چند دن بعد موصوف کلچرا تاشی صاحب نے ترجمہ کرانے کے لیے راغب مراد آبادی صاحب کی کوئی انہتر ستر اردو نظمیں ہسپتال میں پہنچا دیں۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ان کا کام کیا جس کے عوض انہوں نے اردو علم العروض کے متعلق کچھ لکھ کر مجھے دیا جو میرے لئے مفید ثابت ہوا۔

☆ آپ کی نظموں کو فطرت کے قریب گردانا جاتا ہے اس طرح یہ نظمیں یک رُخی نہ کہلائیں گی؟

☆☆ کنفیشس نے کہا: شاعری سے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ منظر نگاری کے پردے میں اپنے جذبے (محبت، نفرت، مخالفت وغیرہ) نظریے

یا کسی فلسفے کو ظاہر کرنا چینی شاعروں کا ایک اہم طریقۂ اظہار ہے۔ عظیم چینی شاعر سوشی (۱۰۳۷ء تا ۱۱۰۱ء) کی ایک ''جوئے جوئی'' (چینی شاعری کی ایک صنف جو دو شعروں پر مشتمل ہوتی ہے) دیکھئے۔ اس کا عنوان ہے ''شی لین مندر کی دیوار پر نوشتہ نظم'' اس نظم کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

بغل سے یہ ایک چوٹی کی طرح
سامنے سے پربتوں کا سلسلہ
نزدسے کچھ، دور سے کچھ
اوج سے کچھ، پستیوں سے کچھ لگا
کوہ لوشاں دیکھ کر بھی
اس کے اصلی رخ سے واقف نہ ہوا
ہے یہی اس کا سبب
اب ہوں میں اس میں کھڑا

شی لین مندر کوہ لوشان میں واقع ہے جس کے مختلف حصے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ پہاڑ مختلف سمتوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ پھر یہ کہ اس پہاڑ پر اکثر کہر چھائی رہتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی اصلی صورت جاننا مزید مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن اس پہاڑ کی حقیقی صورت دیکھنے میں جو رکاوٹ حائل ہوتی ہے وہ خاص طور پر دیکھنے والے کے پہاڑ کے اندر موجود ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ دراصل شاعر قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اگر آپ کا کسی واقعے سے تعلق ہے تو آپ کے لیے اس واقعے کی اصلیت جاننا مشکل ہوتا ہے۔

ماؤزے تنگ کی ایک چھی (چینی شاعری کی ایک صنف جو مختلف دھنوں میں لکھی جاتی ہے) دیکھئے۔ اس چھی کا عنوان ہے ''ثنائے گلِ آلوچہ'' جبکہ دھن کا نام ''بوسوان زی'' ہے۔ اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے (چونکہ ماؤزے تنگ کی نظموں کے اردو ترجمے کی کاپی سرِ دست میرے پاس دستیاب نہیں۔ اس لئے میں نے اس نظم کا از سرِ نو ترجمہ کیا ہے:

فصلِ گل کو لائی واپس بادوباراں
اس کے استقبال کی خاطر پہنچی برف باری
اک کھڑی اونچی چٹاں پر جم گئی ہیں برف کی موٹی تہیں
پھر بھی شاخوں پر کھلے ہیں کچھ نہ کچھ خوش رنگ پھول

یہ بہاراں پر تصرف کی ہوس میں تو کھلے ہرگز نہیں
بلکہ فصلِ گل کی آمد کی خبر سب کو سنانے کو کھلے ہیں
جب پہاڑی پھول پر جانب مہک جائیں گے تو
مسکرائیں گے یہ ان کے درمیان

یہ نظم دسمبر ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی تھی جب چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے لیے بین الاقوامی صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی۔ امریکہ کی سربراہی میں مغربی ممالک نے چین کو تقریباً پوری طرح گھیر رکھا تھا۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپی ممالک جو پہلے چین کے دوست تھے بھی چین کے حریف بن گئے تھے، اسی سال چین اور اس کے پرانے دوست بھارت کے درمیان سرحدی جھڑپیں ہوئیں۔ ملک کی اندرونی صورتِ حال بھی انتہائی خراب تھی۔ مسلسل تین سال کی قدرتی آفات کے باعث پوری قوم تین سال سے فاقہ کر رہی تھی، اس کے باوجود سوویت یونین کا قرض چکانے پر مجبور تھی۔ چینی قوم اس انتہائی حالت میں کسی دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے اور سر جھکا دینے کے بجائے پوری عزت اور وقار کے ساتھ کھڑی رہی، چینی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی اس امید کو نہیں کھویا کہ ایک نہ ایک دن ساری دنیا عالمی انقلاب کی لپیٹ میں آ جائے۔ اس نظم میں شاعر نے گلِ آلوچہ سے چینی کمیونسٹ پارٹی اور چینی قوم کی تشبیہہ دی ہے۔ گلِ آلوچہ سردیوں کے آخر میں کھلتا ہے اس لئے اس پھول سے خطرے کے سامنے ثابت قدم رہنے والے کی تشبیہہ دی جاتی ہے اور اسے موسمِ بہار کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔

سوشی اور ماؤزے تنگ کی یہ دونوں نظمیں فطرت کے قریب ہیں۔ لیکن اک زخمی ہونے کے بجائے تہ دار اور معنی خیز ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ فطرت کے قریب ہونے سے نظم اک رخی ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ممکن ہو میری نظمیں یک رخی ہوں۔

☆ پاکستان کے کتنے ملی نغمیں اور فلمی گیت آپ نے چینی زبان میں منتقل کیے اور کون سے زیادہ پسند کیے گئے؟

☆☆ پندرہ بیس ملی نغمے اور اتنے ہی فلمی گیت۔ کچھ فلمی گیت خاصے پسند کئے گئے۔

☆ غیر ملکی غنائی شاعری میں کن ممالک کی شاعری کا ترجمہ کیا اور زیادہ متاثر کس ملک کی شاعری سے ہوئے؟

☆☆ ''غیر ملکی غنائی شاعری کی لغت'' دراصل ایک شعری مجموعہ ہے جس میں عرب ممالک، ایران، پاکستان، بھارت، انڈونیشیا، برما، تھائی لینڈ، فلپائن، سنگاپور، ویت نام، جاپان، کوریا، روس، سابق سوریت یونین، البانیہ، بلغاریہ، پولینڈ، سابق چیکوسلاواکیہ، رومانیہ، سابق یوگوسلافیہ، ہنگری، برطانیہ ان ممالک جہاں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے، اٹلی ان ممالک جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے۔ ہسپانیہ، لاطینی ممالک اور امریکہ کی غنائی شاعری شامل ہے۔ میں نے حصۂ پاکستان کی بیشتر نظموں کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں شامل تمام نظمیں بہترین اور متاثر کن ہیں۔

☆ اردو کا عروض، منتخب ادب پارے، معلوماتِ پاکستان کی ترتیب وتدوین کن مقاصد کے تحت کی اور اُن سے استفادہ کی صورت کیا ہے۔

☆☆ ان تینوں کتابوں کی ترتیب کلاس میں طلبا کو پڑھانے کے لیے کی گئی ہے، اس لئے صرف چینی کمیونی کیشنز یونیورسٹی اور بیجنگ فارن اسٹڈیز

یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے طلبا نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

☆ انتخاب عالم صاحب! آپ کے علمی اور ادبی کام کو ناقدینِ اردو نے کس نظر سے جانچا اور پرکھا ہے؟

☆☆ ناقدینِ اردو نے بہت کم میرے ادبی وعلمی کام پر لکھا۔ جنہوں نے لکھا انہوں نے ازراہِ محبت اور مروّت ولحاظ کرتے ہوئے میرے علم وادبی کام کو سراہا ہے۔

☆ کبھی آپ کی مہم جو طبیعت نے تنقید کے کوہِ گراں سے ٹکرانے کی بابت غور نہیں کیا؟

☆☆ ایک طرف بقول آپ کے میری طبیعت قدرے مہم جویانہ ہے (شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے چینی نژاد ہوتے ہوئے برِصغیر کی زبان اردو میں شاعری کرنے کی جرات کی ہے) دوسری طرف میرا خیال ہے کہ میں خاصا قدامت پسند ہوں، کیونکہ میں غزل جیسی قدیم صنفِ سخن کو پسند کرتا ہوں۔ اسی قدامت پسندانہ مزاج نے مجھے ابھی تک ادبی تنقید کے کوہِ گراں سے باقاعدگی سے ٹکرانے نہیں دیا، بہرحال کبھی کبھی یومِ اقبال کے موقع پر بیجنگ میں مقیم پاکستان کالج میں منعقد ہونے والے سیمینار میں اقبال پر مضمون یا مقالہ پڑھا کرتا ہوں۔ پندرہ سال قبل ایک مقالہ بعنوان ''چینی اور اردو شاعری کا تقابلی جائزہ'' لکھا، ممکن ہے عنقریب ہی ترمیم وتصحیح کے بعد اسے ای میل کے ذریعے آپکی خدمت میں پیش کردوں۔

☆ آپ نے عظیم چینی رہنما ماؤزے تنگ کے کلام کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق یہ عظیم سیاسی رہنما شاعر کس قد کاٹھ کے تھے؟

☆☆ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ماؤزے تنگ کی نظموں کا ترجمہ مظفرحسین رزمی مرحوم نے کیا تھا۔ میں نے صرف ترجمے کی جانچ پڑتال اور نظر ثانی میں حصہ لیا تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے اگرچہ ماؤزے تنگ عمر بھر قومی، فوجی، سیاسی اور نظریاتی امور میں مصروف رہنے کے باعث پرگو شاعر نہیں تھے لیکن بڑے قدآور شاعر تھے۔ بہت کم چینی شاعران کے معیار تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ پھر یہ کمال ہے کہ بہت سے نظمیں لانگ مارچ، جاپانی جارحیت کے خلاف جنگِ مزاحمت اور جنگِ آزادی کے دوران گھوڑے پر سوار گنگنا کر لکھی تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپانی جارح فوج شکست فاش کھا کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی اور یوں جاپانی جارحیت کے خلاف چینی قوم کی جنگ مزاحمت ختم ہوگئی لیکن جلد ہی خانہ جنگی چھڑ گئی۔ خانہ جنگی بند کرکے پُرامن طریقے سے قومی تعمیر کرنے کے لیے ۱۹۴۶ء میں حکومتِ چین کے زیراہتمام چین کی تمام سیاسی تنظیموں کے نمائندوں کی ایک سیاسی مشاورتی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں چینی کومنتانگ پارٹی کے چیئرمین جیانگ کائی شیک اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین ماؤزے تنگ دونوں شریک ہوئے۔ کانفرنس کے دوران کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ماؤزے تنگ کی ایک تازہ چھپی شائع کی جس کا عنوان تھا ''برف باری''، ''چھین یوان چھون'' کی دھن میں لکھی گئی یہ چھپی بعد میں بہت مشہور ہوئی (چھپی چینی کلاسیکی شاعری کی ایک صنف ہے جس کی کوئی سو مقررہ دھنیں ہوتی ہیں اور ہر دھن کا ایک نام ہے۔ ہر دھن میں لکھی جانے والی چھپی کے مصرعوں کی تعداد، لمبائی اور اوزان متعینہ ہوتے ہیں) اس چھپی نے ادبی وسیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا اور چینی انقلابیوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ جب جیانگ کائی شیک نے یہ چھپی پڑھی تو بہت جلے اور کہا کہ اس چھپی کا لہجہ بڑا شاہانہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کئی ادیب وشاعر دوستوں کو حکم دیا کہ وہ اسی دھن میں اور اسی عنوان پر ماؤزے تنگ کی چھپی سے اچھی ایک ایک چھپی لکھ کر شائع کریں، مگر کانفرنس ختم ہونے تک ماؤزے تنگ کی چھپی سے اچھی کوئی چھپی نہ لکھی گئی۔ سچ پوچھیئے تو آج تک اس دھن میں ماؤ کی چھپی ''برف باری'' سے کوئی چھپی نہیں لکھی گئی۔ اس چھپی کی طرح ماؤزے تنگ کی بہت سی نظمیں چینی شاعری کے بہترین نمونے بن چکی ہیں اور چین میں زبان زدعام وخاص ہیں۔

☆ سُنا ہے! عظیم چینی رہنما چوئن لائی اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل تھے۔ ہمارے قارئین کو اُن کی بابت بھی کچھ بتلایئے؟

☆☆ چواین لائی بے حد ذہین، لائق اور ہردلعزیز شخصیت تھے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ اوصاف، بلکہ اعلیٰ ادبی ذوق کے بھی حامل تھے۔ تقریباً بیس بائیس سال کی عمر میں جب وہ قومی آزادی کی راہ کی تلاش میں عازمِ جاپان ہوئے تو روانگی کے موقع پر ایک نہایت خوبصورت کلاسیکی نظم ''چھی لوئی'' لکھی (چینی شاعری کی ایک صنف جو چار شعروں پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ ہر مصرع کے ساتھ چینی کیریکٹرز پر مشتمل ہوتا ہے۔) جس کے آج تک چینی لوگ رطب اللسان ہیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا تمام وقت سیاست میں صرف کیا، اس لئے ادبی تحقیق نہیں کی، ورنہ وہ اعلیٰ پائے کے ادیب یا شاعر ہوتے۔

☆ گوتم بدھ، کنفیوشس اور لاؤزی کی نسبت اہلِ چین خاص عقیدت ومحبت رکھتے ہیں۔ چینی ادب وشاعری میں ان بڑے مفکروں کے حوالے سے کس قدر لکھا گیا ہے اور آپ کی ذاتی پوزیشن اس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ گوتم بدھ ساکیہ منی، کنفوشس اور لاؤزی (ساتویں یا چھٹی صدی ق م) تقریباً ایک ہی زمانے کے تین عظیم حکماء تھے۔ لاؤزی چونکہ شاہی خاندان کے وزیرِ آداب رہ چکے تھے۔ ایک کنفیوشس نے آداب کے بارے میں ان سے تحصیلِ علم کی تھی۔ گوتم بدھ مت کے، لاؤزی تاؤ مت کے اور کنفیشس کنفیوشزم کے بانی تھے۔ ۶۷ء میں بدھ مت چین میں متعارف ہوا اور جلد ہی پھیل گیا۔ بعد میں اسلام اور عیسائیت بھی یکے بعد دیگرے چین میں متعارف ہوئے۔ اہلِ چین کنفیشس اور مذکورہ چاروں مذاہب کے بانیوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چینی زبان سے مراد چین کی بان زبان ہے جو چین کی بان قومیت کی زبان ہے۔ بان زبان کی شاعری پر کنفیوشس، لاؤزی اور گوتم بدھ تینوں کی تعلیمات کے اثرات ملتے ہیں، جن میں سے کنفیوشزم کی چھاپ سب

سے نمایاں ہے۔تمام چینی دانشوروں کی طرح میری شاعری اور فکر پر بھی کنفیوشزم کے نشانات نمایاں اور گہرے ہیں۔

☆ عوامی جمہوریہ چین میں تعلیمی تناسب کیا ہے۔چین کی نوجوان نسل کن علوم کی جانب ذوق شوق رکھتی ہے اور فنونِ لطیفہ سے اُن کی رغبت کا تناسب کیا ہے؟

☆☆ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق گزشتہ تیس سال کے دوران چینی معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ شرحِ تعلیم بھی بلند ہوتی رہی۔ پورے ملک میں نو سالہ لازمی تعلیم کی شرح ۲۰۰۹ء میں ۹۵ فیصد سے تجاوز کر چکی ہے، نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگوں میں شرحِ خواندگی ۵ فی صد سے نیچے گر گئی ہے۔ یونیورسٹیوں میں داخلے کی شرح ۲۱ فیصد ہے۔نوجوان نسل سائنس اور معاشیات پڑھنے کا زیادہ شوق رکھتے ہیں، فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لینے والے نوجوان نسبتاً کم ہیں۔

☆ چین کی کتنی درسگاہوں میں عالمی لسانیات پڑھانے کا انتظام ہے۔ خاص کر اردو زبان کے حوالے سے صورتحال کیا ہے؟

☆☆ لسانیات کے معنی زبانوں کے بجائے زبانوں کے متعلق علم ہیں۔ عالمی زبان سے مراد وہ زبان ہے جو ساری دنیا میں بولی جاتی ہو۔اس معیار کے مطابق صرف انگریزی عالمی زبان کہلا سکتی ہے۔چین کی تقریباً تمام درسگاہوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے جن میں پرائمری اسکول، مڈل اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں شامل ہیں، بعض درسگاہوں میں انگریزی کو ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، بعض درسگاہوں میں انگریزی کا انسٹی ٹیوٹ یا شعبہ ہے، جبکہ بعض درسگاہوں میں صرف انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن، جاپانی، ہسپانوی، عربی وغیرہ غیر ملکی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔چین کی چار یونیورسٹیوں میں اردو کا شعبہ ہے اور ان میں اردو کا بنیادی کورس چار سالہ ہوتا ہے، جبکہ ان میں سے ایک یعنی بیجنگ یونیورسٹی میں اردو کی ایم اے اور پی ایچ ڈی تک تعلیم بھی ہوتی ہے۔

☆ اردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد اور اُن کی ترجیحات میں اُردو کے انتخاب کی بابت آگاہ کیجیے؟

☆☆ مذکورہ بالا یونیورسٹیوں میں تقریباً ہر چار سال کے بعد اردو کی ایک جماعت کا داخل ہوتا ہے اور ہر جماعت کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ سو طلباء وطالبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب ایک جماعت گریجویٹ ہوتی ہے تو دوسری جماعت داخل ہوتی ہے۔کبھی کبھار بیجنگ یونیورسٹی میں تین سال کے بعد نئے طالب علموں کا داخلہ ہوتا ہے۔

چین ایک ترقی پذیر ملک ہے۔اگرچہ یہ گزشتہ تیس پینتیس سال سے خاصی تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے اور اس کی مجموعی قومی پیداوار کی مالیت دنیا بھر میں امریکہ کے بعد سب سے زیادہ ہے، لیکن آبادی بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے عوام کا معیارِ زندگی ابھی بھی بہت پست ہے اور دنیا کے تمام ممالک میں چینیوں کی فی کس اوسط آمدنی نمبر ننانوے پر ہے۔ اس لئے یونیورسٹیوں کے بیشتر طالب علم ان مضامین کو ترجیح دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر اچھی سی نوکریاں مل سکیں تا کہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی بہتر بنا سکیں۔ یہی وجہ ہے مضامین کے انتخاب میں اردو کو ترجیح دینے والے طلباء خال خال ہیں۔

☆ اردو کے قاری کی سہولت کے لیے چینی شاعری کی اصناف اور اُن کے برتاؤ کی بابت کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ چینی شاعری سے مراد چین کی بان زبان کی شاعری ہے۔یہ زبان چین کی قومی زبان بھی ہے۔چینی زبان وادب کی تاریخ بہت طویل ہے۔چینی شاعری کی کئی اصناف ہیں جن کی اپنی اپنی ہیئت اور اپنا اپنا ارتقائی عمل ہے۔

(۱) گیت: گیت چینی شاعری کی ابتدائی شکل ہے۔چینی شاعری کا پہلا مجموعہ کنفیوشس کی مرتب کردہ ''شاعری کی کتاب'' ہے جس کا ایک تہائی حصہ لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔لوک گیت ہر تاریخی دور میں شاعری کی ایک اہم صنف رہا۔شاعری کے تخلیق کردہ گیتوں پر لوک گیتوں کے اثرات نمایاں ہیں۔لوک گیتوں اور شاعروں کے تخلیق کردہ گیتوں کی مشترکہ خصوصیات یہ ہیں: ان کے مصرعے چھوٹے اور برابر ہوتے ہیں، مصرعوں کی تعداد مقرر نہیں ہوتی، زبان عام فہم ہوتی ہے، قافیے باندھے جاتے ہیں اور موسیقیت نمایاں ہوتی ہے۔

(۲) چھوچھی: شاعری کی یہ صنف برسرِ پیکار ریاستوں کے دور اور مغربی ہان شاہی دور میں رائج رہی۔اس کے نمائندہ شاعر چینی ادب کی تاریخ کے پہلے عظیم شاعر چھوئی یوان تھے۔''چھوچھی'' سے مراد ریاست چھو کی شاعری ہے۔اس صنفِ سخن پر ریاست چھو کے لوک گیتوں کا اثر نمایاں ہے۔اس کے مصرعے نسبتاً لمبے ہوتے ہیں، ہر نظم میں مصرعوں کی تعداد معین نہیں ہوتی، قافیے باندھے جاتے ہیں۔ بیشتر نظمیں غنائی ہیں اور زیادہ تر مصرعوں میں ایک چینی کریکٹر ''ہی'' استعمال ہوتا ہے۔

(۳) یوئے فو (محکمۂ موسیقی) گیت: برسرِ پیکار ریاستوں کے دور کے بعد آنے والے بہت سے شاہی ادوار میں سرکاری محکمہ موسیقی ہوتا تھا جس کا کام لوک گیت جمع کرنا، ان کی بنیاد پر مختلف مواقع پر گائے جانے والے نئے گیت لکھنا اور گیتوں کے لئے دھنیں تیار کرنا تھا۔بہت سے قدیم شعراء انہی گیتوں کے نمونے پر شعر کہتے تھے۔یوں یوئے فو گیت چینی شاعری کی ایک اہم صنف کی حیثیت اختیار کر گیا۔اس صنفِ شاعری پر لوک گیتوں کے اثرات واضح ہیں۔مصرعے چھوٹے ہوتے ہیں، زبان سہل ہوتی ہے، موسیقیت نمایاں ہوتی ہے، مصرعوں کی تعداد معین نہیں ہوتی۔

(۴) فو: یہ چھوچھی سے ملتی جلتی ایک صنفِ سخن ہے لیکن اس میں کیریکٹر ''ہی'' کا استعمال نہیں ہوتا۔اس کی دو قسمیں ہیں ایک قسم کو ''پیان فو'' یا ''لوئی فو'' کہتے ہیں جس کے مصرعوں کی لمبائی معین ہوتی ہے، لیکن تعداد مقررہ نہیں ہوتی۔اس قسم کی فو میں قافیے باندھے جاتے ہیں۔دوسری قسم کی فو کو ''وین فو'' یا ''سان فو'' کہتے ہیں جو اصل میں ایک طرح کی نثر ہے۔فو کا آغاز برسرِ پیکار ریاستوں

کے دور میں ہوا۔ بان دور میں یہ اپنے عروج پر پہنچا۔

(۵) لوئی شی: چینی شاعری کی یہ صنفِ تھانگ شاہی عہد کی ایجاد تھی اور اسی عہد میں اپنے عروج پر پہنچی۔ یہ کلاسیکی چینی شاعری کی ایک اہم ترین صنف ہے جو چار شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لوئی شی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی لوئی شی کو چھی لوئی کہتے ہیں جس کا ہر مصرع سات چینی کریکٹرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی لوئی شی کو وولوئی کہتے ہیں جس کا ہر مصرع پانچ چینی کریکٹرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ دونوں قسم کی لوئی شی کے پہلے، دوسرے، چوتھے، چھٹے اور آٹھویں مصرعے میں قافیہ باندھنا لازمی ہوتا ہے۔ دوسرے اور چوتھے شعر کے دونوں مصرعوں کے دو ہم مقام کریکٹر زیا الفاظ ایک ہی نوع کے ہوتے ہیں (مثلاً دونوں اسم، دونوں صفت، دونوں فعل ہوں) معنی کے اعتبار سے دونوں باہم متضاد (مثلاً اچھا اور برا، اونچا اور نیچا، آنا اور جانا) یا ہم پلّہ (مثلاً زمین اور آسمان، مہمان اور میزبان، بادوباراں) ہوتے ہیں۔ ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے ہر دو ہم مقام کریکٹرز کے سُر ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں (چینی کریکٹرز کے چار سُر ہیں۔ پہلے اور دوسرے سروں کو ''پھینگ شینگ'' یعنی ہموار سُر کہتے ہیں، جبکہ تیسرے اور چوتھے سُروں کو ''زے شینگ'' یعنی ناہموار سُر کہتے ہیں)۔ چھی لوئی میں ہر شعر کے مصرعِ ثانی کے پہلے چار کریکٹرز (وولوئی میں پہلے دو کریکٹرز) اور نچلے شعر کے مصرعِ اول کے پہلے چار کریکٹرز (وولوئی میں پہلے دو کریکٹرز) کے سُر یکساں ہوتے ہیں، جبکہ دونوں مصرعوں کے آخری تین ہم مقام کریکٹرز کے سُر ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔

چھی لوئی اور وولوئی کے علاوہ لوئی شی کی ایک اور قسم ہے جسے پھائی لوئی (مسلسل لوئی شی) کہتے ہیں۔ اس قسم کی لوئی شی کچھ زیادہ شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عام طور پر لوئی شی سے مراد چھی لوئی اور وولوئی ہوتی ہے۔

(۶) جوئے جوئی: جوئے جوئی سے مراد قطعہ ہے، یعنی یہ لوئی شی کا کٹا ہوا حصہ ہے یہ دو شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم چھی جوئے ہے جس کا ہر مصرع سات چینی کریکٹرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسری قسم وو جوئے ہے جس کا ہر مصرع پانچ چینی کریکٹرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ وزن کے لحاظ سے جوئے جوئی آدھی لوئی شی جیسی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے ہم مقام کریکٹرز زیادہ الفاظ ہم نوع اور باہم تضاد یا ہم پلّہ ہوں۔ لوئی شی کی طرح جوئے جوئی بھی تھانگ شاہی عہد کی ایجاد تھی اور یہ بھی اسی دور میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

(۷) چھی: چھی کو سونگ چھی بھی کہتے ہیں۔ لوئی شی اور جوئے جوئی کی طرح یہ بھی چین کی کلاسیکی شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ یوں تو چھی لکھنے کا آغاز تھانگ عہد میں ہوا مگر یہ سونگ عہد میں اپنے عروج پر پہنچی، اس لئے یہ سونگ چھی بھی کہلاتی ہے۔ یہ چھو چھی سے بالکل مختلف صنفِ سخن ہے۔ اس کی سو سوا سو مقررہ دھنیں ہوتی ہیں جن کا اپنا اپنا نام ہے۔ ہر چھی دو بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر بند کے مصرعوں کی تعداد، لمبائی اور اوزان متعینہ ہوتے ہیں۔

(۸) چھوئی: یہ صنفِ سخن یوان شاہی خاندان کے عہدِ حکومت میں لکھی جانے لگی اور اسی دور میں اپنے عروج پر پہنچ گئی، اسی لئے اسے یوان چھوئی بھی کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم سان چھوئی ہے جسے کوئی گلوکار یا گلوکارہ کسی ساز کی سنگت کے بغیر اکیلے گا سکتی ہے۔ سان چھوئی کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم شیاؤ لینگ (متفرق چھوئی) ہے دوسری قسم سان تھاؤ ہے جو کئی چھوئیوں کا مکمل سیٹ ہوتی ہے۔ یوان چھوائی کی دوسری قسم جوئی چھوئی یعنی اوپیرا کی چھوئی ہے۔ ہر اوپیرا میں بیسیوں جوئی چھوئیاں شامل ہوتی ہیں جنہیں اوپیرا کے مختلف کردار سازوں کی سنگت کے ساتھ ساتھ گاتے ہیں۔ یوان چھوئی کی مختلف دھنیں ہوتی ہیں۔ ہر دھن میں لکھی جانے والی چھوئی کے مصرعوں کی لمبائی، تعداد اور اوزان مقررہ ہوتے ہیں اور قافیے باندھے جاتے ہیں۔

(۹) دوئی لیان: دولیان سے مراد شعر ہے۔ یہ چینی شاعری کی ایک خصوصی صنف ہے۔ یہ شعر جشنِ بہار، شادی، جنازے، سالگرہ اور اہم تقریبات کے موقع پر دروازے کے دونوں اطراف یا ستونوں پر چسپاں کاغذ کے مستطیل نما پرچوں پر لکھے جاتے ہیں۔ بہت سے مکانوں، دکانوں، مندروں، درسگاہوں، عجائب خانوں، مقابروں اور یادگار عمارتوں وغیرہ کے دروازوں پر اکثر دولیان نوشتہ یا کندہ دکھائی دیتے ہیں۔ دوئی لیان کے دونوں مصرعوں میں شامل کریکٹرز کی تعداد برابر ہوتی ہے، ہم مقام کریکٹرز یا الفاظ ایک ہی نوع کے ہوتے ہیں جو معنی کے اعتبار سے باہم متضاد یا ہم پلّہ ہوتے ہیں، جبکہ ان کے سُر ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ چین میں دوئی لیان لکھنے کا رواج بہت پرانا ہے، مینگ شاہی خاندان کے عہدِ حکومت میں اس کی تخلیق اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

(۱۰) آزاد نظم: پچھلی صدی کے دوسرے عشرے میں یورپی ثقافت، فن، ادب اور افکار و نظریات چین میں زور و شور سے متعارف ہونے لگے جن کے زیرِ اثر چین میں نئی ثقافت کی ایک پرزور تحریک چل گئی۔ اس تحریک کا ایک اہم واقعہ چار مئی ۱۹۱۹ء کو بیجنگ میں برپا ہونے والی ''چار مئی تحریک'' ہے۔ نئی ثقافت کی تحریک میں سامراجیت اور جاگیرداریت کے خلاف نعرے بلند کئے گئے جمہوریت کی تبلیغ کی گئی اور سائنس کے فروغ کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ زبان و ادب کی دنیا میں مشکل پرانی زبان کے بجائے عام فہم زبان میں ادب تخلیق کرنے کی ترغیب دی گئی۔ آزاد نظم کی ظہور پذیری اسی تحریک کی مرہونِ منت ہے۔ چینی زبان کی آزاد نظم کے مصرعوں کی لمبائی اور تعداد مقررہ نہیں ہوتی، کچھ نظموں میں ڈھیلے ڈھیلے قافیے باندھے جاتے ہیں، کچھ میں بالکل نہیں۔ اوزان کی بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ شعریت، موسیقیت، زبان و بیان کی نزاکت اور مضمون کی جدّت و ندرت آزاد نظموں کی جان ہیں۔

دورِ حاضر میں چین کے بیشتر نوجوان اور ادھیڑ عمر کے شعراء آزاد نظمیں لکھتے ہیں، جبکہ عمر رسیدہ شعراء لوئی شی، جوئے جوئی اور چھی لکھنا پسند

کرتے ہیں، کچھ شعراء کلاسیکی اور آزاد نظمیں لکھتے ہیں۔

☆ چینی شاعری اور نثر کا معیار اور موضوعات نیز چینی ادب کے تراجم کی صورتحال کیا ہے؟

☆☆ چین شاعری کا دیس ہے۔ چینی شاعری کی تاریخ ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے طرح طرح کی اصناف ایجاد کیں، لاکھوں شان دار نظمیں پیش کیں اور سیکڑوں عظیم شعراء کو جنم دیا۔ چینی شاعری کا معیار ہمیشہ سے بہت بلند رہا، خاص طور پر تھانگ اور سونگ ادوار میں یہ تقریباً سات سو سال تک اپنے عروج پر قائم رہی۔ اوسوس کے موجودہ دور میں چینی شاعری کی حالت زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ نثر کی حالت ذرا بہتر ہے۔ چینی شاعری کے موضوعات ہمیشہ سے عشق و محبت، حب الوطن، انصاف وصداقت، غریبوں سے ہمدردی وغیرہ ہیں۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا آغاز مینگ شاہی خاندان کے عہدِ حکومت میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری نے چینی میدانِ ادب میں نظم گوئی اور اوپیرا نگاری کی جگہ لی۔ ''تین سلطنتوں کا رومانس''، ''دلدل کے ہیرو'' اور ''مغرب کی یاترا'' جیسے عظیم شاہکار مینگ عہد کی یادگار ہیں، جبکہ چھینگ عہد کے شاہکاروں ''ایوانِ احمر کا خواب''، ''لیاؤ چائے کی کہانیاں'' اور ''دانشوروں کی سنی سنائی کہانیاں'' وغیرہ نے ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے جدید فنی معیار تک رسائی کر لی۔ سچ تو یہ ہے کہ چینی زبان میں اب تک ''ایوانِ احمر کا خواب'' سے بہتر کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔ چینی ناولوں اور افسانوں کے موضوعات ہمیشہ سے سماجی مسائل رہے ہیں۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔ چینی ادب کے موضوعات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہ خاص طور پر یہ ہیں: شہری زندگی دیہی زندگی کی جگہ لے رہی ہے۔ سیاسی و نظریاتی رنگ ہلکا ہو رہا ہے، تفریحی رنگ گہرا ہو رہا ہے اور عشق و محبت پر پہلے سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں چینی ادب کے تراجم بہت کم ہیں۔

☆ وقت اور حالات کے بدلتے مزاج کے ساتھ چینی ادب میں کس قسم کا ارتقائی عمل نمو پذیر ہونے کے امکانات ہیں اور کیا اردو ادب میں بھی اُس کے اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں؟

☆☆ گذشتہ جوابات میں علی الترتیب چینی شاعری اور نثر کے تاریخی ارتقائی عمل پر سرسری روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب حالیہ تین عشروں کے چینی ادب کے ارتقائی عمل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے گی۔

(ا) گذشتہ تیس سالوں میں چینی ادب ارتقاء کے تین ادوار سے گزرا۔ پہلے دور کے ادب کو ''نئے دور کا ادب'' کہتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں دس سالہ پُر آشوب ثقافتی انقلاب ختم ہوا، اس کے بعد اس انقلاب کی غلطیوں کی تصحیح کی گئی، اس دوران پیدا ہونے والے مسائل حل کیے گئے۔ پھر اصلاحات اور اوپن پالیسی نافذ کی گئی۔ اس دور کے چینی ادب میں ان اہم سیاسی و سماجی تحریکوں کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ دوسرے دور کے ادب کو ''نویں عشرے کا ادب'' کہتے ہیں جس میں چین میں ظہور پذیر مارکیٹ اکانومی کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ اگر ''نئے دور کے ادب'' میں نظریاتی اور سیاسی رنگ گہرا تھا تو اس دور کے ادب میں زر و دولت کی بُو تیز تھی۔ تیسرے دور کے چینی ادب کو ''نئی صدی کا ادب'' کہتے ہیں جس کا مرکزی موضوع شہری زندگی ہے، جبکہ نئے چین کے قیام کے عمل میں آنے کے بعد سے پچھلی صدی ختم ہوتے تک دیہی زندگی ہی چینی ادب کا اہم ترین موضوع رہی۔

نئے دور کے چینی ادب کا ایک اہم جزوِ ترکیبی انٹرنیٹ ادب ہے جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں غیر پیشہ ور یا شوقیہ نوجوان قلم کاروں کا بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اپنی تصانیف کو فلمانا یا ٹی وی پروگرام بنوانا بہت سے مصنفین کی کوشش ہے۔ مختصر افسانے (یا افسانچے) اور کہانیاں طویل و ضخیم ناولوں سے زیادہ مقبول ہیں۔ ادب میں نظریات کے اثرات کم اور تفریح کے عناصر زیادہ ہو گئے ہیں۔

چینی ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیاں چینی معاشرے کی تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ چونکہ جدید چینی ادب کا اردو میں بہت کم ترجمہ کیا گیا ہے، اس لئے اردو ادب پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

☆ عوامی جمہوریہ چین میں سرکاری اور عوامی سطح پر پاکستان اور اردو سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ عوامی جمہوریہ چین میں سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر پاکستان کو بہترین ہمسایہ اور دوست ملک اور پاکستانی عوام کو بھائی اور وفادار ساتھی سمجھا جاتا ہے، دونوں سطحوں پر پاکستان کا خیال رکھا جاتا ہے یعنی چینی حکومت اور چینی عوام دونوں پاکستان کی ترقی و خوش حالی کے لیے دعا گو ہیں، دونوں پاکستان کی مشکلات کو اپنی ہی مشکلات سمجھتے ہیں، دونوں وقتِ ضرورت پر پاکستانی حکومت کی دست گیری کے خلوصِ دل سے شکر گزار ہیں اور دونوں کو چین پاک دوستی بے حد عزیز ہے۔ حکومتِ چین اردو کی تعلیم پر بڑی توجہ دیتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس توجہ میں اضافہ ہوتا رہا ہے، لیکن پھر بھی اردو پڑھنے والے طلباء کم ہیں۔

☆ چلئے! اس سوال کو ایک اور طرح سے لیتے ہیں۔ اشتراکی چین اور اسلامی جمہوری پاکستان دوستی کے گہرے رشتے میں بندھے ہیں اگر آپ سے دونوں ممالک کی دوستی کے غیر جانبدارانہ تجزیے کی درخواست کی جائے تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ اشتراکی چین اور اسلامی جمہوری پاکستان نے سچی دوستی کے گہرے رشتے میں بندھ کر ساری دنیا کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ مختلف نظریاتی اور سماجی نظاموں کے حامل ممالک نہ صرف پرامن طریقے سے مل کر رہ سکتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے بہترین دوست بن سکتے ہیں۔ اگر دوستی خلوص،

محبت، انصاف اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہو تو نظریات، مذاہب اور سماجی نظام اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ تاریخ گواہ ہے اور زمانہ شاہد ہے کہ چین اور پاکستان کی دوستی ایسی ہی خالص، پاکیزہ اور مقدس دوستی ہے۔ دوست وہ جو وقت پر کام آئے۔ ۱۹۵۱ء میں چین پاک سفارتی تعلقات کے قیام کے عمل میں آنے کے بعد چین اور پاکستان ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے چلے آئے ہیں۔ چین پاک دوستی جہاں دونوں ممالک کے عوام کے لیے باعثِ فخر ہے وہاں دوسرے ممالک کے لیے قابلِ تقلید بھی ہے۔ اگر دنیا کے تمام ممالک چین اور پاکستان کی طرح پرامن اور دوستانہ طریقے سے مل کر رہتے تو جنگ کی تیاری نہیں ہوتی جس سے بہت پیسے بچ جاتے۔ اگر ان پیسوں سے غریب محتاج لوگوں کی مدد کی جاتی تو ہماری دنیا میں بھوک نہیں رہتی۔ اگر جنگ نہیں ہوتی تو لوگوں کی قیمتی جانیں گولہ بارود سے تلف نہیں ہوتیں اور ہماری دنیا میں یتیم بچے، بے یارومددگار بیوائیں اور بے وارث ضعیف العمر والدین نہیں ہوتے۔ میری دعا ہے کہ چین پاک دوستی تا ابد قائم ودائم رہے اور اس کے اثرات دنیا بھر میں پھیلتے چلے جائیں۔

☆ پاکستان میں آپ کا قیام کب کب اور کتنے عرصے پر محیط رہا۔ پاکستانی لوگوں خاص طور سے اہلِ قلم کی خامیوں اور خوبیوں کی بابت آپ کی دیانت دارانہ رائے بہت کارآمد ہو سکتی ہے؟

☆☆ پاکستان میں میرا قیام مختلف سالوں میں مختلف عرصوں پر محیط رہا۔ ہر دفعہ قیام کے آغاز وانجام کی ٹھیک ٹھیک تاریخیں یاد نہیں رہیں، اندازاً پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۸۰ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء، دوسری دفعہ ۲ تا ۱۹ اگست ۱۹۸۸ء، تیسری دفعہ ۲ تا ۱۵ مئی ۱۹۹۱ء، چوتھی دفعہ ۳ تا ۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء، پانچویں دفعہ یکم تا ۸ دسمبر ۱۹۹۵ء، چھٹی دفعہ ۲ تا ۱۵ نومبر ۱۹۹۸ء، ساتویں دفعہ ۱۰ تا ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۰ء، اور آٹھویں دفعہ ۱۱ تا ۱۸ اپریل ۲۰۱۰ء رہا ہر قیام کے دوران پاکستانی عوام خاص طور پر اہلِ قلم دوستوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مجھ سے ایسا سلوک کیا جیسا وہ اپنے سگے بھائیوں سے کیا کرتے ہیں۔ ان کی صحبت میں رہ کر جہاں مجھے ان سے علم وفن اور شعر و ادب کے بارے میں سیکھنے کے بہت سے قیمتی مواقع ملے وہاں قریب سے ان کے دلوں کی گہرائی میں جھانکنے اور ان کے اخلاق کے تمام پہلوؤں کو دیکھنے کی سہولیتیں بھی میسر آئیں۔ اس غیر دانستہ طویل المدت مشاہدے اور معائنے کے مطابق میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پاکستانی قوم کے تمام افراد بالعموم اور اہلِ قلم بالخصوص مخلص، نیک دل، فیاض اور دوست نواز ہیں۔ ان میں کوئی خامی ڈھونڈنا بال کی کھال کھینچنے کے برابر ہے۔ شاید میرا نظریہ کچھ یک طرفہ ہو، مگر یہ میرے تجربے سے اخذ کیا گیا ہے۔ تجربے سے ہٹ کر کسی کی جو بھی خامی نکالی جائے وہ محض بے جا دشنام طرازی ہوگی۔ اگر ان کی کوئی خامی بتانا لازمی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ چینیوں سے بالعموم اور مجھ سے بالخصوص حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں، جس کے عوض تمام اہلِ چین کی طرح مجھے بھی ان سے جنون کی حد تک محبت ہے اور محبت میں گرفتار عاشق کو معشوق کی خامیاں دکھائی نہیں دیتیں۔

☆ گزرتے وقت کے ساتھ ''اردو'' ایک عالمی زبان کا روپ اختیار کر چکی ہے۔ اس حوالے سے آپ کے تعلقات کا دائرہ بھی یقیناً وسیع ہونا چاہیے۔ پاکستان کے علاوہ کن ممالک کے اہلِ قلم سے آپ کے قریبی روابط ہیں اور کس ملک کے اہلِ قلم آپ کو دل کے قریب محسوس ہوتے ہیں؟

☆☆ یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اردو زبان برصغیر پاک وہند کی حدود سے نکل کر دنیا کے بہت سے حصوں خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں بھی ترویج پا رہی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ برصغیر سے باہر جو لوگ اردو بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں ان میں سے بیشتر سمندر پار پاکستانی اور بھارتی ہیں۔ مقامی باشندوں میں سے بہت ہی کم لوگ اردو استعمال کرتے ہیں، اس لئے اردو کو ابھی عالمی زبان گردانے کی دلیل ذرا کمزور ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت، متحدہ عرب امارات، قطر، سعودی عرب، امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں بھی میرے کچھ دوست ہیں جن سے اردو شعر وشاعری کے وسیلے سے دوستانہ رشتہ پیدا ہوا۔ یہ سب اجتماعی حیثیت کے بجائے انفرادی حیثیت سے میرے دوست ہیں، اس لئے کسی ملک کے دوستوں کو دل کے قریب یا دل سے دور قرار دینا مناسب نہیں۔

☆ عالمی سطح پر امریکہ اور چین کے درمیان مستقبل کی قیادت کے لیے جو سرد جنگ جاری ہے کیا عام چینی اُس سے باخبر ہے اگر ہے تو اس کے نتائج کی بابت کس طرح کے قیاسے زیرِ بحث رہا کرتے ہیں؟

☆☆ جہاں تک مجھے معلوم ہے عالمی سطح پر چین اور امریکہ کے درمیان مستقبل کی قیادت کے لیے کوئی سرد جنگ نہیں ہو رہی ہے۔ اگر چین اور امریکہ کے درمیان بعض معاملات میں جھگڑے ہوتے ہیں تو وہ مستقبل کی قیادت کیلئے نہیں، کم از کم اہلِ چین ان کی نوعیت ایسی نہیں سمجھتے۔ جو کچھ جھگڑے ہوتے ہیں وہ مذکورہ دونوں ممالک کے پالیسیوں کے باہم ٹکرانے کے مظاہر ہیں، جبکہ پالیسیوں کے پسِ پردہ مفادات کارفرما ہیں۔ چین اپنے اور تیسری دنیا کے ممالک کے مفادات خود مختاری، علاقائی سالمیت، عوام کے جان و مال، سماجی امن و امان، اقتصادی وسماجی ترقی، قومی وقار وغیرہ کی حفاظت کرنا چاہتا ہے، امریکہ اپنے مفادات ساری دنیا کے وسائل پر قبضہ، تمام ممالک پر کنٹرول کے لیے بحیرۂ جنوبی چین اور بحیرۂ مشرقی چین پر قبضہ کرنا، تائیوان کو چین سے علیحدہ کرنا، عراق کی سابق حکومت کو الٹ دینا، اسرائیل کی جارحانہ پالیسی کی حمایت کرنا، جاپان اور دنیا کے دوسرے بہت سے ممالک میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنا، خود مختار ممالک میں امریکہ نواز طاقتوں کی حمایت و مدد کرنا، کچھ ملکوں کے ساتھ فوجی اتحاد کا معاہدہ کرنا، دوسرے ممالک کے اندرونی امور میں مداخلت کرنا اور ان کے فوجی، سیاسی اور اقتصادی راز چرانے کے لیے وہاں اپنے جاسوس بھیجنا چاہتا ہے۔ اپنے اپنے مفادات کے حصول اور حفاظت کے لئے فریقین کا

جھگڑنا ناگزیر ہے۔ان تمام جھگڑوں میں امریکہ کا اقدام جارحانہ اور چین کا اقدام دفاعی ہے ۔ جب اہلِ چین نہیں مانتے کہ چین عالمی سطح پر مستقبل کی قیادت کے لیے امریکہ سے سرد جنگ لڑ رہا ہے تو اس کے نتیجے کے بارے میں کیوں قیاس کریں؟

☆ ہر دو شکل میں آپ پاکستان اور اردو زبان کا مستقبل کس طرح کا دیکھتے ہیں؟

☆☆ پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہوگا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ پاکستانی عوام محنتی، ذہین اور بہادر ہیں، پاکستان کی سرزمین وسیع وعریض، زرخیز اور قدرتی وسائل سے مالامال ہے اور پاکستان کی آب وہوا زراعت وگلہ بانی کی ترقی کے لیے موزوں ہے۔علاوہ ازیں پاکستان کے بہت سے سچے دوست ہیں جو ضرورت کے وقت کام آسکتے ہیں۔ان مفید عوامل کے علاوہ یہ روشن مستقبل کچھ بنیادی شرائط کا متقاضی ہوگا۔قومی یکجہتی، بےلوث قیادت اور امن واستحکام، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں میں ہونے والی فضول اور لامتناہی کشمکش قومی یکجہتی کو پاش پاش کر دیتی ہے، بےلوث قیادت کی بدولت ہی رشوت ستانی، بدنظمی، فرقہ بندی اور بدعنوانی وغیرہ سماجی برائیوں کی بیخ کنی ممکن ہے، امن وامان عوامی زندگی کی حفاظت اور قومی معیشت کی ترقی کا ضامن ہوتا ہے جبکہ دہشت پسندی امن وامان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

میرے خیال میں اردو کا مستقبل بھی روشن ہوگا لیکن یہ بھی کچھ شرائط کا متقاضی ہوگا۔اردو کا مستقبل روشن ہونے کے دلائل یہ ہیں: اول، یہ ایک خاصی بڑی زبان ہے جس کی جڑیں برصغیر کی زمین میں مضبوطی سے پیوست ہیں جبکہ برصغیر کی آبادی روزافزوں تعداد میں بڑھتی جارہی ہے۔دوم، اہلِ پاک وہند اردو سے بہت محبت کرتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے اپنے ملک میں اردو بولتے اور لکھتے ہیں بلکہ بیرونِ ملک سکونت پذیر ہوتے ہوئے بھی اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔سوم، اہلِ پاک وہند کے علاوہ سمندر پار پاکستانی اور ہندوستانی بھی دنیا بھر میں اردو کی ترویج کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ چہارم، بہت سے ممالک میں اردو کی تعلیم پر توجہ دی جارہی ہے۔ان سازگار عوامل کے ساتھ کچھ ناموافق عوامل بھی موجود ہیں اور رہیں گے: اول، مواصلاتی ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملکوں، قوموں اور لوگوں میں آمدورفت آسان اور زیادہ ہوتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملنے ملانے میں انگریزی استعمال کرنے کے مواقع میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔غیر ملکیوں سے تبادلۂ خیال کرنے اور غیرملکی کمپنیوں میں نوکری کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ نوجوان اردو پر انگریزی کو ترجیح دینے لگے ہیں۔اس صورتِ حال میں اردو کے مستقبل کو روشن کرنے کی سعی بہاؤ کے خلاف کشتی چلانے کے برابر ہے۔اس لئے اردو کی بقاوترویج کی جو کوشش پہلے سے ہورہی ہے اسے دوچند کر کے جاری رکھنا چاہیے ورنہ اردو کا مستقبل خاصا تشویش ناک ہوگا۔

☆

''جینے کا ہنر''

ایک طرف ہم اپنے عظیم ہمسایہ چین کی دوستی پر فخر کرتے نہیں تھکتے دوسری طرف اردو کے بارے اپنے چینی بھائیوں کی احتیاط پسندی پر حیران بھی ہوا کرتے ہیں۔جس طرح اس باوقار قوم نے پوری دنیا کو جینے کا چلن اور زندہ رہنے کا ہنر سکھلایا ہے اسی طرح ایک ارب سے اوپر کی آبادی میں اردو ادب کا اکلوتا صاحبِ دیوان شاعر پیدا کر کے یہ بھی جتلا دیا ہے کہ عددی کثرت کے ساتھ احتیاطِ لفظی بھی چینی قوم کے مزاج کا وصفِ خاص ہے۔ جناب انتخاب عالم اگرچہ ایک ہیں مگر اردو دنیا کے لیے نیک بھی ہے اور بااعتبار کارکردگی انیک بھی ہیں۔ہمیں پوری امید ہے کہ چین کی زرخیز مٹی میں یہ اکلوتا تخنی شجر اپنی بہار دکھلا کر مرجھانے کے بجائے اور بھی بہت سے ادبی شگوفے کھلائے گا اور نہ صرف پاک ، چین کے درمیان اخوت وبھائی چارے کو فروغ دے گا بلکہ پوری دنیا کو امن وآشتی ،محبت اور بھائی چارے کا درس بھی دیتا رہے گا۔

سید ضمیر جعفری

(●)

''شہرِ منور''

محترم انتخاب عالم کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب

فیصل عظیم (کینیڈا)

(چمنِ وطن کی تازہ ہوا کی نذر)

خمیرِ اوجِ فلک ارض سے اٹھا تو ہے
تہِ نشیب، بلندی کی ابتدا تو ہے

صبا نے چھیڑ دیا، پھول کھلکھلانے لگا
ہجومِ خار میں گو یہ گھرا تو ہے

ابھی نسیمِ بہاری اگرچہ کم کم ہے
ہر ایک درختِ چمن جھومنے لگا تو ہے

شرر کو عمر بہت مختصر ملی لیکن
ضیائے شمع کو اس نے جنم دیا تو ہے

ثمر ضرور لگے گا، ابھی بہت ہے وقت
من پہ ڈال نظر، یہ ہرا بھرا تو ہے

ذرا طویل ہے رستہ تو کیا ہوا عالمؔ
کہ بادبان ہوا میں کھلا ہوا تو ہے

نوٹ: ۱۹۷۸ء کے اواخر میں چین میں اصلاحات اور کھلے دروازے کی پالیسی نافذ ہوئی جس کی بدولت چین کے تمام شعبہ جات زندگی میں خوش آئند تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس پالیسی پر تا حال عمل درآمد جاری ہے۔

(نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں ایڈوانسڈ اردو کا دو سالہ کورس مکمل کر کے بیجنگ واپس آنے کے موقع پر اسلام آباد، دسمبر ۱۹۸۲ء)

مری جدائی کی گل نے سنی خبر کیسے
دمِ سحر ہی ہوئی اس کی چشم تر کیسے

ہوا ہے وقتِ سفر، طائروں نے پر کھولے
اداس صحنِ چمن ہے ہر شجر کیسے

وہی ہے شہرِ منور، وہی ہیں شمس و قمر
بجھے سے آج نظر آ رہے ہیں پر کیسے

مرے گلے میں کوئی ہار بھی نہیں لیکن
چمک رہے ہیں گریباں پہ یہ گہر کیسے

کبھی تھی ایک گھڑی ایک ماہ پر بھاری
یہ ماہ ایک گھڑی میں ہوا بسر کیسے

یہ دن جدائی کے عالمؔ گزر ہی جائیں گے
نہ پوچھ ہم سے کہ آؤ گے لوٹ کر کیسے

○

ہر بھرا تھا چمن، پر شجر اکیلا تھا
شجر پہ برگ بہت تھے، ثمر اکیلا تھا

بقائے نور فلک پر بھی ہوگئی مشکل
اڈ رہی تھیں گھٹائیں، قمر اکیلا تھا

اندھیری شب تھی تو محفل میں تھے چراغ بہت
یہ کیا ہوا کہ چراغِ سحر اکیلا تھا

یہی تو ایک تماشا پسِ تماشا تھا
تماش بیں تھے بہت، دیدہ ور اکیلا تھا

رفاقتوں سے یہ تنہائی کم نہیں ہوتی
شریکِ بزم تو تھا میں ، مگر اکیلا تھا

گناہِ عشق کی کیسی سزا ملی ہم کو
کہ سنگ بار زیادہ تھے، سر اکیلا تھا

کیا تھا ہم نے سفر ساتھ ساتھ یوں عالم
کہ میں اکیلا ، مرا ہم سفر اکیلا تھا

○

بشر بس غم منانے کے لئے دنیا میں آتا ہے
دمِ آمد وہ روتا ہے دمِ رخصت رلاتا ہے

جہاں بھر میں کسے، کس پر، کہاں، کب رحم آتا ہے
شجر سوکھے ہوئے پتوں کو شاخوں سے گراتا ہے

ستارے دیکھتے رہتے ہیں شب بھر مہر کا رستہ
افق پر مہر آتے ہی مگر ان کو بجھاتا ہے

زمین جو آسمان کو سر پہ رکھتی ہے ہمیشہ سے
ہمیشہ اس پہ الٹا آسماں بجلی گراتا ہے

اندھیرے کے مقابل حوصلہ مندوں کی یہ قلّت
کہ سورج بھی دمِ شب چھپ کے اپنی جاں بچاتا ہے

مجھے اس پیڑ کی قسمت پہ آتا ہے بہت رونا
جو اپنے کاٹنے والے کو چھاؤں میں بٹھاتا ہے

فراقِ یار میں اکثر وصالِ یار ہوتا ہے
کبھی وہ میرے وہموں میں کبھی خوابوں میں آتا ہے

وہ آنے میں جھجک کیسی، یہ جانے کی تڑپ کیسی
ہمارا یار کس انداز سے یاری نبھاتا ہے

وفا کرتا رہا ہوں میں ، جفا کرتا رہا ہے تو
یہ فرقِ حرفِ واحد ہم میں کیسا فرق لاتا ہے

بھروسے کا ہمارے دور میں فقدان ہے کیسا
میاں بیوی سے بھی قصّہ محبت کا چھپاتا ہے

بھری محفل میں جامِ چشم لیکر گھومتا ہے وہ
یہ عالم دیکھتے ہیں ہم کہ وہ کس کو پلاتا ہے

ازل سے چشمِ دنیا کو فقط گل راس آتے ہیں
عالم ایک پتّا ہوں جو پھولوں کو سجاتا ہے

(یہ غزل دو ہم زمیں غزلوں کا امتزاج ہے)

نجمِ واحد بادلوں کے درمیان موجود تھا
بجھ چکی تھی کہکشاں، اس کا نشاں موجود تھا

باغ سے اُڑ کر بھی رہتا تھا وہ طائر باغ میں
شاخِ نخلِ دل پہ نقشِ داستاں موجود تھا

دھوپ میں ہم لوگ جھلسے خشک تنوں کی طرح
اور ہمارے پاس ہی اک سائباں موجود تھا

قطرے قطرے کو ترستا ہی رہا میں عمر بھر
میرے گھر کے سامنے گو اک کنواں موجود تھا

گاہے گاہے ان سے ملتا تھا خیال و خواب میں
ایک رشتہ میرے ان کے درمیاں موجود تھا

چھاؤں میں سوتا تھا عالم بیٹھتا تھا دھوپ میں
میرا بھی اس شہر میں کوئی مکاں موجود تھا

○

کاش اتنا فرق آتا فصلِ خوئے یار میں
دشتِ دل بدلے گھڑی بھر کیلئے گل زار میں

گو ہمیشہ وہ ہمارے دل میں ہی آباد ہے
پھر بھی ساری عمر گزری جادۂ دیدار میں

مانتا ہوں دل میں کوئی بات پوشیدہ نہیں
گو کہ تھوڑی سی جھجک ہے لہجۂ گفتار میں

آپ ہی کے منہ سے سن کر آپ ہی کا حالِ دل
رہ گیا حیراں کہ دل ہے سینۂ سرکار میں

مت ہماری بے دلی کو بے دلی ہی جانیئے
دل ہمارا سیر کو نکلا ہے شہرِ یار میں

گرچہ اپنی تھی تمنّا، گرچہ اپنی تھی زبان
ان کے آگے پر حروف اٹکے رہِ اظہار میں

دردشناسی دل شناسی کی طرح دشوار ہے
ہے نہاں کچھ رنگِ دیگر غازۂ رخسار میں

دور دورہ دورِ صنعت میں ہے مصنوعات کا
ہے ندارد عشقِ اصلی عشق کے بازار میں

کاش ہوتا اتنا سا انصاف قلبِ دہر میں
دل کے بدلے دل ہی ملتا دل کے کاروبار میں

پردۂ آبِ خنک میں بھی سلگتی ہے شراب
موجزن ہے درد کا دریا دلِ نادار میں

چیر کر دریا پہاڑوں کو بناتا ہے ڈگر
طے نہیں ہوتا مقدر غیب کے دربار میں

سائباں کی کیا ضرورت؟ بیٹھتا ہوں دھوپ ہو
یا شجر کی چھاؤں میں یا سایۂ دیوار میں

پتھروں پر ہے کلامِ نرم عالم بے اثر
کچھ اضافہ اور ہو تیغِ سخن کی دھار میں

(فلسطینی مجاہدین کے نام)

آؤ تھوڑی دیر بیٹھیں روبرو ہم اور تم
پھر پئیں خونِ جگر کے کچھ سبو ہم اور تم

اک طرف بہری ہے دنیا، اک طرف گونگے ہیں ہم
دل ہی دل میں رکھتے ہیں دل کی آرزو ہم اور تم

بولنے کا حق گیا، رونے کا باقی ہے مگر
آج اشکوں سے کریں گے گفتگو ہم اور تم

ظلمتِ شب میں ستارے گر کے غائب ہوگئے
آؤ مل کر دیں صدائیں کوبکو ہم اور تم

دہر ڈوبا ہے اندھیرے میں، بجھے ہیں سب چراغ
اب چراغِ دل جلادیں سوبسو ہم اور تم

آدمی پر آسماں کے سارے رستے بند ہیں
پھر بھی حق کی کر رہے ہیں جستجو ہم اور تم

زندگی کی جاں ہے آزادی، علامت سانس ہے
جاں بچالیں گے بہا کر یہ لہو ہم اور تم

پتھروں کو چیر کر دریا بناتے ہیں ڈگر
پیروی ان کی کریں گے ہو بہو ہم اور تم

دیکھ لی ویرانیٔ باغِ خزاں دل تھام کر
فصلِ گل میں دیکھ لیں گے رنگ وبو ہم اور تم

ذلّتوں ہی سے جنم لیتی ہیں عالم عزّتیں
وقت آئے گا تو ہوں گے سرخ رو ہم اور تم

(بابری مسجد میں ہونے والے قتلِ عام پر)

خزاں گزیدہ چمن میں بہار باقی ہے
کہ تیغِ گل پہ مرا اعتبار باقی ہے

ہر ایک چیز کی باری ہے دورِ دوراں میں
جو لوگ جیت گئے ان کی ہار باقی ہے

شراب ختم ہوئی ہے، سبو بھی ٹوٹے ہیں
رہا تو کچھ بھی نہیں، کچھ خمار باقی ہے

رتوں کے ساتھ بدلتا ہے جوشِ ہر دریا
گزر چکا ہے چڑھاؤ، اتار باقی ہے

رہی ہے دل کی لگی ، دل لگی مگر نہ رہی
کہ دل رہا نہ رہا، دل فگار باقی ہے

نگار خانہ گرایا گیا تو گرنے دو
دلِ زمانہ میں روئے نگار باقی ہے

مٹے ہیں روئے زمیں سے تمہارے نقشِ قدم
ضمیرِ دہر میں اک یادگار باقی ہے

چلے گئے ہیں اگرچہ جہاں سے وہ عالم
نفوسِ وقت میں ان کا شمار باقی ہے

''آپ کی دعا کیا ہے''

ڈاکٹر توصیف تبسم
(اسلام آباد)

''گلبانگِ وفا'' چینی نژاد اردو شاعر انتخاب عالم (چانگ شی شوان) کا اولین مجموعہ کلام ہے۔ یہ مجموعہ اردو زبان وادب کی ہمہ گیر مقبولیت کا ثبوت ہے جس کا تعلق ہمارے اپنے عہد سے ہے۔ یوں تو کسی غیر ملکی کا اردو زبان میں دادِ سخن دینا اور اپنا شعری مجموعہ ترتیب دینا پہلا واقعہ نہیں، کیونکہ اس سے قبل اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف میں متعدد برطانوی، پرتگیزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی، آرمینین اور دوسرے یورپین شاعر اردو میں نہ صرف شعر لکھتے رہے بلکہ ایسے شعراء بھی تھے جنہوں نے اپنے دیوان مرتب کر کے شائع کیے مثلاً الیگزینڈر بیدرلی آزاد کا دیوانِ اردو ۱۸۶۳ میں پہلی بار شائع ہوا۔ بیدرلی آزاد فنِ شعر میں مرزا اسداللہ خان غالب کے بھانجے زین العابدین عارف کے شاگرد تھے۔ اسی طرح جارج پیش شور، جنرل جوزف بروٹ، تھامس بیل اور مونٹروز مضطر کے نام لئے جاسکتے ہیں جن کے اردو دیوان منظر عام پر آئے۔ مونٹرمضطر کے چاروں دیوان جو اس نے مرتب کئے غالباً تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ غیر ملکی شعراء بیشتر اپنی منصبی ذمہ داریوں کے سبب برصغیر میں مقیم رہے۔ انہوں نے یہاں کی زبان کو یہاں رہ کر سیکھا اور تحریر وتقریر میں اہلِ زبان جیسی مہارت بہم پہنچائی۔

اس تاریخی ادبی منظر نامے میں ہمارے خیال میں ''گلبانگِ وفا'' کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا ممتاز شعری مجموعہ ہے جو کم وبیش سو برس کے بعد اردو زبان میں کسی غیر ملکی شاعر نے مرتب کیا۔ دوم ''گلبانگِ وفا'' اولین شعری سوغات ہے جو کسی چینی شاعر کی طرف سے اردو میں پیش کی گئی ہے۔ اگرچہ قدیم زمانے سے چین اور برصغیر پاک و ہند کے تہذیبی روابط قائم رہے ہیں مگر اس نوعیت کی دوسری مثال کہیں نظر نہیں آتی۔

غالباً چینی سے بھی شیریں ہے اردو دیکھئے
چین کا عالم بھی اس میں غزل خواں ہوگا

گزشتہ مرتبہ دواوین کے مقابلے میں ''گلبانگِ وفا'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ شاعری ہمارے دور کے طرزِ احساس کی حامل ہے جبکہ گذشتہ مرتب شدہ دواوین اپنے عہد کی شعری روایات سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاریخی طور پر ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔

اس مجموعہ میں شامل غزلوں کی منفرد فضا جو اشارتی اسلوب اور غزل کے مخصوص علائم ورموز کے استعمال سے پیدا ئی ہے ان غزلوں کو شاعر کی نظروں سے الگ کرتی ہیے۔ اس چینی نژاد شاعر نے غزل کے مخصوص مزاج کو نہ صرف اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ اس کو بہت کامیابی سے برتا بھی ہے۔ وہ غزل کہتے ہوئے عموماً تازہ اور کسی قدر دشوار ردیفیں اختیار کرتا ہے اور بڑے مستحکم انداز میں ان کو استعمال کرتا ہے کہ کہیں بھی شعر پر شاعر کی گرفت کمزور پڑتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ کچھ غزلیں بعض مخصوص سانحات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں جن کی وضاحت ذیلی نوٹ کے ذریعہ کر دی گئی ہے۔ ان غزلوں میں بھی تغزل کی وہی فضا ہے جو دوسری عام غزلیات کی خصوصیات ہے جبکہ یہ امکان بھی تھا کہ شاعر غزل کی حدود کو توڑ کر نظم کی حدود میں داخل ہو جاتا۔ انتخاب عالم کی ایسی غزلیں صنف غزل کے امکانات کی مظہر ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس صنفِ سخن میں ہر قسم کے تاثر کو سمیٹ لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ شرط صرف سلیقے اور قرینے کی ہے۔ مظاہرِ فطرت سے وابستگی چینی شاعری کی روایت رہی ہے۔ انتخاب عالم چونکہ بنیادی طور پر چینی زبان کے شاعر ہیں اس لیے ان کی اردو غزل بھی اس وصف سے خالی نہیں۔ ان کے یہاں غزل کی روایتی اسالیب کے پہلو بہ پہلو، مظہرِ فطرت کا تذکرہ بھی غزل کے ایمائی انداز میں موجود ہے جس سے ان کی غزل پڑھ کر ایک خاص طرح کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔

ہرا بھرا تھا چمن، پر شجر اکیلا تھا
شجر پہ برگ بہت تھے، ثمر اکیلا تھا
بقائے نور فلک پر بھی ہوگئی مشکل
اڈ رہی تھیں گھٹائیں، قمر اکیلا تھا

کوئی بھی ابر ہو
آخر میں بکھر جاتا ہے

آب سے دل کے فلک اور نکھر جاتا ہے
وقت دریا ہے کوئی جھیل نہیں ہے عالم
راہ میں غم ہو، خوشی ہو، یہ گزر جاتا ہے

فطرت نگاری کے اس رجحان کی بدولت انتخاب عالم کی غزل کا رخ کسی حد تک داخل سے خارخ کی طرف ہو جاتا ہے مگر غزل گو شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس سفر سے اس کی غزل کی مجموعی تغزل کی فضا میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔ انتخاب عالم کی شخصیت پر چونکہ ایک خاص نظریہ کی چھاپ ہے، اس لئے وہ حقائقِ زندگی کو اپنے مخصوص زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔ درد مندی ان کی غزل کا نمایاں وصف ہے مگر وہ بیدلی نہیں ہے جو زندگی سے فرار اور

بیزاری پیدا کرتی ہے بلکہ ان کا شعر زندگی کے روشن مستقبل کا امین اور احساسِ رجائیت سے مملو دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے خفتہ مقدر کو جاگنا تو ہے
بہت کیا ہے ،ذرا اور انتظار سہی

اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے شاعر حسبِ ضرورت خوبصورت اور نئی تراکیب وضع بھی کرتا ہے۔ان تراکیب سے ایک طرف شاعر کی زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے شعر میں ایک تازگی از خود ہو جاتی ہے۔ فارسی علمِ عروض پر شاعر کی دسترس حیران کن حد تک مکمل ہے۔شعر پڑھتے ہوئے کہیں بھی کسی جھول یا سقم کا احساس نہیں ہوتا۔ انتخاب عالم کی غزل پڑھتے ہوئے اس کی ندرتِ بیان، معنی آفرینی اور قدرتِ کلام کے نمونے قدم قدم پر دل کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔کہیں کہیں وہ شوخی سے بھی کام لیتے ہیں۔

نہ کھائیں عمر سے دھوکا کہ میں تو
دورنِ دل جواں تر ہوں جواں سے

یہ مانتا ہوں کہ میرے لئے دعا گو ہیں
مگر سوال یہ ہے آپ کی دعا کیا ہے

''گلبانگِ وفا'' میں شامل نظمیں تین قسم کی ہیں۔اول وہ نظمیں جو سرزمینِ پاکستان اور یہاں کی بعض شخصیات سے شاعر کی محبت کی آئینہ دار ہیں۔ دوم وہ نظمیں جو طبع زاد ہیں اور جن کا موضوع عام زندگی ہے اور سوم شاعر کی وہ نظمیں جو اولاً چینی زبان میں کہیں اور بعد میں خود اردو میں ان کا ترجمہ کر کے مجموعے میں شامل کیں۔

انتخاب عالم کی ان نظموں میں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بڑا تنوع ہے جو اس مجموعے کو قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔شاعر کا فطرت نگاری کا رجحان ان نظموں میں اس قدر قوی ہے کہ اس پر فطرت پرستی کا گمان گزرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض نظمیں محض فطرت نگاری کے زمرے میں آتی ہیں جن کا مقصد اپنے جذبۂ تحیر میں دوسرے کو شریک کرنا ہے، جیسے ان کی نظم ''جڑواں آبشار'' یا ''رات کی روشنیاں'' مگر شاعر کو جہاں موقع ملتا ہے وہ فطرت کے مظاہر میں انسانی بصیرت کے سامان کو ضرور تلاش کرتا ہے۔انتخاب عالم کی یہ نظمیں ہمیں اردو کے معروف شاعر مجید امجد کی یاد دلاتی ہیں۔شاعر نے آزاد اور نثری ہیتوں میں ان نظموں کو مکمل کیا ہے جو تنوع ہی کی ایک صورت ہے۔

غرض یہ مجموعۂ کلام فکر و فن کے لحاظ سے شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند اور چین کے درمیان ثقافتی لین دین کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ پاکستان اور چین کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کی مستحکم روایت جو موجودہ دور میں قائم ہوئی ہے یہ شعری مجموعہ اس کا ایک تازہ اور منفرد ثبوت ہے۔

''یادوں کا سرمایہ''

جناب مکرّم چانگ شی شوان صاحب،
السلام علیکم۔

میں واپسی پر بیمار ہو گیا تھا ورنہ فوری خط لکھتا۔اب چند روز سے کچھ بہتر ہوا ہوں امید ہے آپ بخیر و عافیت واپس بیجنگ پہنچے ہوں گے۔

آپ نے سیمینار اور مشاعروں میں میری خاطر شرکت کر کے مجھے بے حد ممنون کیا۔ پھر آپ نے اپنی نثر اور نظم میں میرے متعلق جن خوبصورت خیالات کا اظہار کیا وہ میری یادوں کا عزیز سرمایہ ہیں۔آپ کی باغ و بہار شخصیت سے متعارف ہو کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں۔میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلفی سے لکھئے۔

میرے کون کون سے شعری مجموعے آپ کے پاس ہیں۔یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جو نہیں ہیں وہ میں فوراً آپ کو بھجوا دوں۔حال ہی میں میرا نیا مجموعہ کلام ''لوحِ خاک'' چھپا ہے۔ وہ بھی آپ کو پیش کرنا چاہوں گا۔ ویسے میرے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں۔

رم جھم، جلال و جمال، شعلۂ گل، دشتِ وفا، محیط، دوام، لوحِ خاک۔

اپنا رسالہ ''فنون'' بھی ساتھ میں بھجواؤں گا۔امید ہے آپ اپنا رسالہ اور کلام بھجواتے رہیں گے۔

احمد ندیم قاسمی

(●)

''گناہِ عشق کی سزا''

نقاش کاظمی
(کراچی)

علم حاصل کرو خواہ چین تک جانا ہو، پاک چین دوستی زندہ باد، پاکستانی چینی بھائی بھائی، لانگ مارچ، ریڈ آرمی، ثقافتی انقلاب چیئرمین، دیوارِ چین، چائنا ٹاؤن، چائنیز ریسٹورنٹ، دیوارِ چین فلسفۂ پر امن بقائے باہمی۔ عوامی جمہوریت وغیرہ وغیرہ سنتے سنتے اور جانتے عمر بیت گئی۔ لیکن یکم مارچ ۱۹۸۸ء کی ایک خوبصورت صبح جب ابوظہبی کے صحرا میں جشنِ بہاراں یعنی ''جشنِ احمد ندیم قاسمی'' کے موقع پر اردو دنیا کے شاعر اور ادیب حضرات کی آمد آمد تھی۔ ناشتے کی میز پر ایک چینی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہ دوست ''چین'' سے آئے ہوئے اردو زبان کے معتبر شاعر، ادیب اور استاد ہیں بلکہ چین کے مقبول ترین سرکاری ماہنامے ''چین باتصویر'' کے ایڈیٹر ہیں اور یہ رسالہ ہمارے پاس پہلے ہی آتا ہے۔ چونکہ ہمارے دوست رشید بٹ اور معروف صحافی احفاظ الرحمٰن وہاں اردو سکھانے کے ماہرین کے طور پر متعین تھے۔

یہ صاحب چینی زبان میں ''چانگ شی شوان'' (ZHANGSUIXUAN) اور اردو میں ''انتخاب عالم'' کہلاتے ہیں اس تین روزہ سیمینار اور مشاعرے میں دوسری زبانوں کے دیگر اردو دان حضرات بھی آئے ہوئے تھے جن میں برطانیہ کے جناب ڈیوڈ میتھوز اور ان کی اہلیہ، متحدہ عرب امارات (دوبئی) سے ڈاکٹر زبیر فاروق اور سعودی عرب سے جناب سالم السعید لوس شامل تھے۔ اس عالیشان اور باوقار جشن کے روح رواں جناب اظہار حیدر مرحوم تھے۔

ناشتے کے بعد تمام مندوبین کو ایک دوسرے سے رسمی طور پر متعارف کرایا گیا اور بدست حضرت احمد ندیم قاسمی گفٹ وغیرہ دیئے گئے اور گلابوں کے سرخ سرخ پھولوں والے ہار پہنائے گئے۔ ان دنوں اس خطے میں گلاب کے پھول نہیں ہوتے تھے۔ کئی لوگوں نے پوچھا یہ ہار کہاں سے آئے تو جواب ملا کراچی سے نقاش کاظمی کے ذریعے منگائے گئے ہیں۔ گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں کو دیکھ کر جس شخصیت نے بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہ جناب ''انتخاب عالم'' صاحب تھے۔ انہوں نے کہا پاکستان سچ مچ گلابوں کا چمن لگتا ہے۔ اس سیمینار کے تقریباً سب ہی شعراء نے گلاب کے حوالے سے اشعار کہے ہیں۔ اور میں نے انہیں ایک اپنا شعر سنا دیا:

دن بھر کے بعد کس طرح چہرے ہوئے گلاب
میری طرح تو دھوپ میں کوئی جلا نہ تھا

انتخاب عالم صاحب نے کہا جب میں اردو سیکھ رہا تھا تو میر تقی میرؔ کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

انتخاب عالم کے ساتھ ہم تین دن اور تین رات متحدہ عرب امارات میں رہے اس دوران ان کی چینی لہجے میں اردو گفتگو، شاعری اور قصے سن کر محظوظ ہوتے رہے۔ انتخاب عالم صاحب جلد ہی یعنی اگست ۱۹۸۸ء میں ایک بار پھر ملے لیکن پاکستان میں۔ وہ چین میں شائع کردہ اردو کتابوں کی نمائش کرنے تشریف لائے تھے۔ (انہوں نے ہمیشہ مجھ سے یہ بھی کہا میرے کانوں میں آپ کی نظامت اور پڑھنے کی آواز گونجتی ہے)

انتخاب عالم صاحب نے فون کیا کہ وہ ''آواری ٹاورز'' ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اگر ملاقات ہو جائے تو بہت خوشی ہوگی۔ میں جب ان سے ملنے پہنچا تو گفتگو کے دوران انہوں نے کہا آپ سیف اللہ خان صاحب کے یہاں مجھے لے جا سکتے ہیں؟ میں نے کہا آپ جہاں جانا چاہتے ہیں میں لے چلونگا۔ لطف اللہ خان صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے اسٹوڈیو میں دنیا بھر کی آوازیں ریکارڈ کی جاتی ہیں اور انہیں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ لہٰذا انتخاب عالم صاحب کو بھی اسی خیال سے مدعو کیا گیا۔ خان صاحب کے دولت کدہ جانے سے قبل ہم نے انتخاب عالم صاحب کو کلفٹن کی سیر کرائی۔ ساحلی منظر سے ہم لطف اندوز ہوئے پانی کے قریب اس جگہ پہنچ گئے جہاں کھانے کو گول گپے یعنی پانی کے بتاشے اور بھٹے بالٹیوں میں لڑکے چنے، مونگ پھلیاں اور مصالحے دار دالیں بیچتے ہیں اور چند لوگ کیتلیوں اور تھرماس میں گرم کہہ کر ٹھنڈی چائے فروخت کرتے ملتے ہیں۔ قریب ہی گھوڑے والے اور اونٹ والے بھی آوازیں لگاتے رہے۔ یہاں سیپیاں، گھونگے، کیچوے اور کیکڑے ٹہل رہے ہوتے ہیں اور آہٹ سن کر دبک جاتے ہیں یا تیز لہروں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ انتخاب عالم کو غیر ملکی ٹورسٹ سمجھ کر عادتاً پیچھے پڑ گئے کہ اونٹ پر بیٹھئے اور سمندر کنارے صحراؤں کے مزے لوٹیے۔ چونکہ اونٹ کو صحرائی جہاز بھی کہا جاتا ہے پھر یوں ہوا کہ ہم علیحدہ علیحدہ اونٹوں پر بیٹھ کے گھومتے رہے۔ البتہ رسّی یا لگام اونٹ والوں کے ہاتھ میں ہی رہی۔ اسکے بعد ایک بڑی ''ہود'' والی سواری ملی جس پر دونوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی یہ سواری طرح طرح کے رنگوں کی جھالروں، گھنگروؤں، کوڑیوں، گھنٹیوں اور پالتو جانوروں کی زیبائش وغیرہ سے آراستہ تھی۔ اس موقع پر انتخاب عالم صاحب نے کہا:

''یہ جو لوگ یہاں گھوم پھر رہے ہیں انہیں کیا معلوم کہ ادبی دنیا کے دو مشہور شاعر اونٹ کی سواری فرما رہے ہیں۔''

اور قہقہہ لگایا، تھوڑی دیر ساحل پر لطف اندوز ہونے کے بعد ہم

لطف اللہ خان صاحب کے دولت کدے پہ پہنچ گئے۔ میرے ''کلام شاعر بزبان شاعر'' کی ریکارڈنگ پہلے ہو چکی تھی۔ سو انتخاب عالم صاحب کی زبانی انکا کلام ریکارڈ کیا گیا۔ اختتام کے بعد کسی صاحب نے آ کر اطلاع دی کہ صدر پاکستان ضیاء الحق صاحب کا طیارہ ملتان کے قریب گر گیا ہے۔ کوئی نہیں بچا۔ یہ 17 اگست کی شام تھی۔ کسی ایمرجنسی کے خوف سے ہم نے انہیں ان کے ہوٹل پہنچا دیا۔

انتخاب عالم صاحب نثر و نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ موصوف نظموں اور غزلوں میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نظموں میں منظر نگاری اور غزلوں میں دلداری ان کا وصفِ خاص ہے۔ انہوں نے مجھے ابوظہبی اور دبئی کے قیام کے دوران کچھ غزلیں، نظمیں اور اشعار سنائے تھے۔ جس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے یہاں الفاظ کی نشست و برخاست کی عمدہ نظمیں تشبیہات، استعارات کی معنی آفرینی، لفظیات و معنیات کا ایک خوبصورت ذخیرہ بدرجہ اتم موجود ہے ان کا ایک شعر جو انہوں نے مجھے اس وقت سنایا تھا ملاحظہ کیجیے اور محسوس کیجیے کہ یہ شعر اردو زبان کے کسی شاعر کی تخلیق سے کم نہیں ہے۔

جو بجھ گئے ہیں ستارے تمام شب جل کر
انہیں کی راکھ سے روشن ہوئی سحر تو ہے

انتخاب عالم (عالمؔ) کو ہم نے بعد بھی کئی مشاعروں اور ذاتی محفلوں کے علاوہ آمنے سامنے بھی سنا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ معیاری اشعار کہتے ہیں اور ''بحر'' میں کہتے ہیں۔ غزلیں زیادہ تر مکمل کہنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے قدرت نے انہیں چین میں رہتے ہوئے شاعری کے منصب پر بطور خاص فائز کیا ہے۔ انتخاب عالم کی ظاہری و باطنی شاعری یا اُن کے اندازِ سخن کو سمجھنے کے لیے ان کا ذاتی پس منظر بھی جاننا ضروری ہے۔ جیسا کہ مطالعے کا اصول رہا ہے۔

انتخاب عالم 22 مئی 1940ء کو چین کے ایک گاؤں (یانگ چانگ) میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن تک تعلیم حاصل کرتے وقت صحافت اور ''اردو زبان'' کے مضامین کو اپنایا۔ البتہ ایڈوانس اردو کی تعلیم کے لیے ''نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز'' اسلام آباد کا انتخاب کیا۔ اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمات کی انجام دہی پر حکومت پاکستان کی جانب سے ''ستارہ قائداعظم'' اور ''تمغۂ پاکستان'' کے اعزازات عطا کئے گئے۔ اسی طرح کے ایوارڈز دنیائے اردو کے دیگر اداروں نے بھی دیئے۔ حکومت چین نے بھی ان کی خدمات کو قابل تحسین سمجھتے ہوئے ''خصوصی الاؤنس'' کا اعزاز دیا ہے وہ سالہا سال ''چین با تصویر'' مجلّے کے ایڈیٹر، سینئر ایڈیٹر اور ایڈیٹر انچارج رہے۔ اس منصب کے بعد پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے متعین رہے۔ اور اب بھی اردو زبان و ادب کیلئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انتخاب عالم صاحب ملک ملک کے شعراء اور مشرق و مغرب کے اردو دانوں اور شعر و ادب کے مزاج سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ اردو شاعری ان کی ذات میں رچ بس گئی یہی وجہ ہے کہ وہ غیر زبانوں کے اردو شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان کی کئی عدد تصانیف، تخلیقات و تالیفات بھی منظر عام پر آ چکی ہیں بلکہ تراجم کی کتابیں بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

''گلبانگِ وفا'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ جبکہ دوسرا مجموعہ ''آبلہ پا'' زیر ترتیب ہے۔ پاکستان کے فلمی گیتوں اور قومی نغمات کا ترجمہ بھی چینی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ اردو چینی لغت بھی ان کا اہم کام ہے۔ زیادہ توجہ کی بات یہ کہ انہوں نے ''اردو عروض پر'' بھی ایک کتاب تحریر کی ہے۔ غرضیکہ ان کی ادبی خدمات میں تقریباً ڈیڑھ سو مضامین مطبوعہ و غیر مطبوعہ اہلِ فکر و نظر کی توجہ چاہتے ہیں۔

انتخاب عالم انتہائی شرمیلی طبیعت کے مالک ہیں۔ سادہ مزاج اور خوش خلق ہونے کے ساتھ بات کو جلدی سمجھتے ہیں اور اپنی ذات میں سمیٹ لیتے ہیں۔ انہیں انڈس کالج (پاکستان) کے مشاعروں اور مذاکروں میں بھی مدعو کیا جا چکا ہے جو میرے اور انکے رابطوں میں اضافہ کا باعث ہوا۔ انہوں نے پاکستان، بھارت، متحدہ امارت کے علاوہ امریکہ اور دیگر ممالک میں بھی اپنی اردو دانی کا جادو جگایا ہے اور اسلام آباد تو ان کا گھر آنگن ہے۔

انتخاب عالم کی نظموں میں ''سیرِ کشمیر'' ''چاند'' ''مینار پاکستان'' ''فلسطین مجاہدوں کے نام'' سرفہرست ہیں۔ ان کی نظموں کی چند لائن ملاحظہ فرمائیں:

دیکھ کر یاں کوہ پر لٹکا ہوا اک آبشار
مٹ گیا ہے اس جگہ پر فرقِ ارض و آسمان
چاند کا کیا ہے۔ اب پوچھتا کوئی نہیں

اس طرز کی زبان و بیان، گہرائی و گیرائی ایک غیر زبان والی شخصیت کے قلم سے یقیناً چونکا دینے والی حقیقت ہے ان کے کلام میں مجھے جا بجا ایسا ہی کمالِ فن نظر آیا ہے۔ جیسے ''کوہ پر لٹکا ہوا آبشار'' ''ارض و آسماں کا فرق'' ''چاند کا کیا حال ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں میرا مقصد کوئی تنقیدی اظہار نہیں ہے بلکہ میں شاعر کا تعارفی اور تاثراتی مطالعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

انتخاب عالم کی غزلوں کو بھی دیکھیں تو ان کا احساسِ جمال اور ندرتِ خیال ''دیوارِ چین'' کی طرح فرشِ زمین پر کنڈلی مارے کسی خوبصورت کو برے کی طرح براجمان نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مرے گلے میں کوئی ہار بھی نہیں لیکن
چمک رہے ہیں گریباں پہ یہ گہر کیسے

بولنے کا حق گیا، رونے کا باقی ہے مگر
آج اشکوں سے کریں گے گفتگو ہم اور تم

باقی صفحہ نمبر ۳۳ پر ملاحظہ فرمایئے

''اقرارِ وفا کا بڑا دروازہ''

آفتاب اقبال شمیم

(اسلام آباد)

چانگ شی شوان جس کا پاکستانی نام انتخاب عالم ہے اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں۔ دراصل انتخاب عالم ان کے چینی نام کا اردو ترجمہ ہے جسے ہمارے دوست حامد علی ہاشمی نے کوئی ستائیس اٹھائیس برس پہلے ان کے لیے تجویز کیا اور اب یہی نام پاکستان میں انکی شناخت بن گیا ہے۔

چانگ شی شوان یعنی انتخاب عالم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء کے کسی مہینے میں ہوئی۔ اس وقت انتخاب عالم چین کے اردو رسالے ''چین باتصویر'' کے نائب مدیر تھے اور میں پیکنگ (بیجنگ) یونیورسٹی میں طلباء کو پڑھانے پر مامور تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں عام چینیوں سے ان کے قدرے بڑھے ہوئے قد کاٹھ لطیف حسِ مزاح، بے تکلفی اور بالخصوص انکی اردو زبان کے ساتھ نئے نئے عاشقوں جیسی اٹھکیلیوں نے مجھے متوجہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وارداتِ عشق کے اس ابتدائیے کی پینگ کو بڑھتے ہوئے دیکھتا مجھے پاکستان لوٹنا پڑا۔

جب میں ۱۹۷۸ء میں دوسری بار چین گیا تو میں نے انتخاب عالم کو اردو زبان سے تاک جھانک کے مرحلے سے بہت آگے دشتِ شاعری میں بادیہ پیمائی کرتے ہوئے پایا۔ اور مجھے اس سنی سنائی بات کا عملی ثبوت ملا کہ عشق اپنے فاصلے پاؤں پر نہیں، جستوں میں طے کرتا ہے۔ ان دنوں انتخاب عالم ہمارے مرحوم دوست مظفر حسن رزمی کے ساتھ مل کر ماؤزے تنگ کی نظموں کا منظوم ترجمہ کر چکے تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کے ساتھ نشست در نشست بیٹھ کر اس ترجمے پر نظر ثانی کرنے کا اعزاز ملا۔ اور انکشاف یہ ہوا کہ انتخاب عالم کو اردو شاعری کے فنِ عروض، سر و تال اور عشوہ و ادا کی خاصی درک ہو چکی تھی، کچھ اکتساب و ریاضت کے ذریعے اور کچھ قدرت کی ودیعت کردہ موزونیِ طبع کے طفیل۔ لیکن اس سے بڑھ کر کلاسیکی چینی شاعری کی بے مثال مشکل پسندی اور خود ماؤزے تنگ کی بیشتر نظموں کا کلاسیکی آہنگ، انتخاب عالم کے لیے فنِ غزل گوئی پر دسترس پا لینے کا باعث بنے۔ پھر ایک روز خبر ملی کہ انتخاب عالم نے عشق بازی چھوڑ کر پیشۂ عشق اختیار کر لیا ہے۔ یہ ۱۹۷۹ء کے اوائل کی ایک شام کا واقعہ ہے کہ انتخاب عالم اچانک میرے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ ایک تسمہ کھلا ہوا، گریبان چاک تو نہیں تھا، لیکن خلافِ معمول کھلا ہوا ضرور تھا، بال بکھرے ہوئے، چہرہ تمتمایا ہوا اور سانس میں تھوڑا سا لرزہ۔۔۔۔ مجھے اچانک سبطِ علی صبا یاد آ گیا جو اسی شانِ نزول کے عالم میں میرے پاس آتا تھا اور سانس کو بے ترتیب کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح کھولتے ہوئے کہتا تھا: ''غزل ہو گئی'' بالکل یہی جملہ انتخاب عالم نے بھی دہرایا: ''غزل ہو گئی'' اور اس کے بعد ہم تینوں یعنی انتخاب عالم، غزل اور میں حافظ کے اس معروف شعر کی حلقہ بگوشی میں آ گئے:

درایں جہان رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل است

۱۹۸۱ء میں جب میں چین سے واپس آیا تو اس وقت انتخاب عالم اسلام آباد میں نیمل (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز) کے شعبۂ اردو میں زیرِ تعلیم تھے، لیکن ان کے اصل اتالیق شعبے سے باہر واقع تھے۔ اسلام آباد کے کسی سیکٹر میں جہاں ''بزمِ جام'' کی ہفت روزہ شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں وہ باقاعدگی سے داد سمیٹنے جایا کرتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے ''یار ایسی محفلیں تو کسی ثقافت کی جان ہوتی ہیں۔ اس طرح کی شعری نشستیں چین میں بھی ہونے لگیں تو کیا اچھا ہو'' اور ہاں یاد آیا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۱۳۰۰ سال پہلے تھانگ خاندان کے دور میں چینی شاعر اسی طرح کی شعری نشستیں منعقد کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ نشستیں خوبصورت مقامات پر کھلی فضا میں لگتی تھیں اور شاعر اس دوران چٹانوں پر اپنے منتخب اشعار کی خطاطی بھی کرتے تھے لیکن بند کمروں میں بپا ہونے والی شعری نشستیں بھی انتخاب عالم کو بہت بھائیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان محفلوں میں فکر و فن کے تہذیبی اثاثے کی آبیاری ہوتی ہے اور اہلِ فن ایک دوسرے کے خیال و جذبے کے نو دریافتہ علاقوں سے روشناس ہوتے ہیں۔

انتخاب عالم سے میری تیسری ملاقات ۱۹۸۹ء میں اس وقت ہوئی جب چین میں ''۴ جون'' کا مشہورِ زمانہ واقعہ مطلعِ غیب سے منظرِ شہود پر آنے والا تھا۔ بیجنگ جو ہمیشہ سے کبھی دھوپ کی لمبی اونگھ میں اور کبھی زمستان کی سرد خوابی میں سکون کی چادر اوڑھے دراز نظر آتا ہے، اچانک حالتِ اضطراب میں آ گیا تھا۔ اور ایسی فضا شاعر سے زیادہ اور کسے متاثر کر سکتی ہے! خالص غیر سیاسی ذہن رکھنے والے انتخاب عالم پر اس سرایت پذیر فضا کا یہ اثر ہوا کہ وہ غزلائے گئے اور تازہ غزل نئی غزلوں کے کھڑے، متفرق اشعار اور سب سے بڑھ کر سامعین کی تلاش۔ وہاں پر احفاظ الرحمان، اقبال احمد خان اور میرے سوا ان کا سامع کون تھا؟ ہاں ایک صاحب اور بھی تھے سفیرِ پاکستان اکرم ذکی لیکن وہ ذرا دور رہتے تھے اور انتخاب عالم کے ان تابڑ توڑ غزلیہ حملوں سے محفوظ تھے۔ بہر طور غزلوں کی اس پے در پے گل باری کا سب سے زیادہ اثر مجھ پر پڑا۔ اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی ثقافت کی فضا میں مجھ پر یہ بات کھلی کہ غزل شاید کوئی انوکھا گلِ لالہ ہے جس سے مئے عشق بلکہ مئے مردافگنِ عشق کشید ہوتی ہے جس کا ایک جُرعہ زمانی اور مکانی دوریاں مٹا دیتا ہے۔ چنانچہ میں جو صرف اور صرف نظم لکھا کرتا تھا اچانک غزل کہنے لگا۔ یہ انتخاب عالم کا مجھ پر ایک احسانِ خاص ہے جس نے مجھے ثقافتی تنہائی میں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔

چین میں میرا چوتھا پڑاؤ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک رہا۔ اب انتخاب

عالم اردو کے ایک مستند اور پختہ کار شاعر بن چکے تھے۔ بیجنگ میں ہماری آوارگیاں اب تواتر کے ساتھ ہونے لگیں۔ کبھی پبلک بسوں اور زیرِ زمین ٹرینوں میں ایک طویل اور بے مقصد سفر پر نکل گئے، کبھی گوتم بدھ، کنفیوشس اور لاؤزی کے مندروں کا طواف کیا، کبھی نیو جیئے کی مسجد کے مضافات سے ہو کر لوٹ آئے اور کبھی بھرے بازاروں میں سودا سلف خریدنے کے بہانے پہروں گھوم لیا۔ واپس آ کر معلوم ہوا کہ چلتے ہوئے بے خیالی میں دوسروں سے کندھے ٹکرانے کا درد اور بے ترتیب چلنے کا خمیازہ بعد میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اور آوارگیوں کا ایک عکس آئینہ خیال میں رہ رہ کر ابھرتا ہے کہ میں سر جھکائے بے ترتیب سا چل رہا ہوں اور انتخاب عالم افق سے کچھ اوپر نظریں جمائے مجھ سے کوئی ایک فرلانگ آگے نکل گئے ہیں اور اس وقت اُس کوئے شعر میں گامزن ہیں جس میں چلتے ہوئے سنگِ راہ کی ٹھوکر بھی کچھ یوں لگتی ہے جیسے اس میں زمانہ ہو۔ یہ آوارگیاں اور ہمارے مشترکہ دوستوں اقبال احمد خان اور نسیم باز خان کی بے قاعدہ اور بے ساختہ نشستیں اور فون پر اکثر یہ اعلان ''بھئی ہوگئی غزل چلے آؤ'' یہاں غمِ جہاں کا حساب کرتے ہوئے کسی یاد کی بے حسابیوں کا گنوانا مقصود نہیں بلکہ ایک ثقافت کے سمندر میں دوسری ثقافت کے ابھرتے ہوئے جزیرے کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جہاں سے چُنے ہوئے غزل کے مرجان و گوہر اب ایک کتاب ''گلبانگِ وفا'' میں ضوفشانی کر رہے ہیں۔ اور حیرت ہے کہ عجمی مزاج کا یہ نوشینہ جسے ہم غزل کہتے ہیں اپنے اندر چینی ذائقوں اور رنگوں کو سمو لینے کی کیسی بے مثال صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی لذّتِ دگر ہے جسے ہم اپنی ثقافتی تاریخ میں پہلی بار چکھ رہے ہیں۔

''گلبانگِ وفا'' کا چھپنا ایک ثقافتی واقعہ ہے۔ یہ بات اپنے طور پر بھی کچھ کم باعثِ اعزاز نہیں کہ انتخاب عالم نے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام لکھوالیا ہے۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک فرزندِ چین نے زبانِ شعر میں اپنی ساری محبتیں ہم پاکستانیوں پر لٹا دی ہیں۔ ہم اُس وراثت کے جانشین ہیں جو شاعری کو روحانیت کا درجہ دیتی ہے۔ سچی شاعری مئے مردافگنِ عشق کا ایک گھونٹ پیے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے غیر مشروط محبت کا اقرار تو ''گلبانگِ وفا'' کی شاعری کا مرکزی دھارا ہے ہی لیکن اس سے قطعِ نظر فی سطح پر کسی شاعر کا ایک اجنبی زبان اور بالخصوص اس کے شعری مزاج پر عبور حاصل کر لینا بجائے خود ایک معجزے سے کم نہیں۔

ہم اس امر سے تو واقف ہیں کہ اہلِ چین دیوار بنانے میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ لیکن اس بار ہم پر یہ بھی منکشف ہوا کہ وہ دروازہ بنانے میں بھی بے نظیر ہیں۔ میری نظر میں ''گلبانگِ وفا'' اقرار وفا کا وہ بڑا دروازہ ہے جسے انتخاب عالم نے وارفتگیٔ شوق میں چین اور پاکستان کے درمیان کھولا ہے اور جو ہمیشہ کھلا رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اُن کا ہم پر یک طرفہ احسان ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے ابھی تک کسی پاکستانی سے چینی مزاج کی شاید ہی کوئی نظم سرزد ہوئی ہو۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق

'' دستخط کرو ''

چینی بھائیوں میں جو انکساری وملنساری ہے اس نے انتخاب عالم کو بڑا مقام عطا کیا ہے۔ عجز انسان کو طاقتور بناتا ہے۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہے۔ پاؤں پکڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی پانی موج میں آئے تو دریاؤں کے دل چیر دیتا ہے۔ چینیوں نے انقلاب کی تاریخ میں بھی اپنی بلندیوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ کسی غیر زبان میں اتنی مہارت سے شاعری کرنا عظمتوں کی ایک الگ روایت ہے۔۔۔۔ بابر کے ایک اور شخص نے اردو کے ایک کلاسیکی ادب، جدید ادب اور اس علاقے کے تمدن کا اتنا گہرا مشاہدہ کیسے کر لیا۔۔۔۔ میں نے بہت سے غیر ملکی افراد کی اردو تخلیقات دیکھی ہیں، شاعری بھی سنی ہے مگر جو تفکر اور فلسفہ انتخاب عالم کے ہاں پایا جاتا ہے اس سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انتخاب عالم نے چینی زبان میں بھی اس قسم کی شاعری کی ہے؟ یہ خوبصورت باتیں، الفاظ پر یہ قدرت۔۔۔۔ یار انتخاب، تم کیا بلا ہو! سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شخص کو کیسے داد دوں۔۔۔ بس یہی سمجھ میں آتا ہے کہ میں ایک اسکول گرل ہوتا تو انتخاب عالم کے سامنے اپنی آٹو گراف بک پیش کر کے کہتا ''۔۔۔۔ دستخط کرو۔۔۔۔ اس آٹو گراف بک پر صرف تمہارے دستخط ہوں گے''

اشفاق احمد

(●)

''ذرا انتظار اور سہی''

امجد اسلام امجد
(لاہور)

ہمارے خفتہ مقدر کو جاگنا تو ہے
بہت کیا ہے، ذرا انتظار اور سہی

ہمّت، ارادے اور امید سے چھلکتا ہوا یہ شعر ایک چینی شاعر چانگ شی شوان کا ہے جس کے نام کا اردو ترجمہ انتخاب عالم ہے۔ یہ اردو کا پہلا چینی نژاد صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کا شعری مجموعہ ''گلبانگِ وفا'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

پاک چین دوستی اب اللہ کے فضل سے اپنی چھٹی دہائی مکمل کرنے والی ہے۔ اس دوران میں دونوں ملکوں کی حکومتوں اور عوام کے باہمی تعلقات میں جس گرمجوشی اور تسلسل کا مظاہرہ کیا گیا، وہ آج کل کی مفادات سے وابستہ عالمی سیاست میں اپنی جگہ پر ایک درخشاں مثال ہے۔ ۶۵ء اور اے کی جنگوں اور ان کے بعد پیدا ہوانے والے کئی بحرانوں میں چین نے پاکستان کا ہمیشہ کھل کر اور بھرپور ساتھ دیا اور پاکستان نے بھی کسی امتحان کے موقع پر لغزش نہیں کی، لیکن اس سے بھی زیادہ روشن اور قابلِ فخر تعلق کی وہ فضا ہے جو دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان قائم اور بڑھ رہی ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے دونوں ملک، ثقافتی وفود کے تبادلے کے ایک معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ ایک برس ادھر کے شاعر، ادیب اور قلمکار ادھر جاتے ہیں اور اگلے برس یہی سلسلہ ایک جوابی دعوت کے طور پر چلتا رہتا ہے۔ ۱۹۹۲ء کے پاکستانی وفد کے ساتھ ہمیں بھی چین جانے کا موقع ملا۔ ہمارے پروگرام میں چار چینی شاعر بیجنگ، شنگھائی، بانگ چو اور سوچو شامل تھے۔ پندرہ روزہ اس دورے کے دوران ہمیں بس اتنا ہی چین دیکھنے کا موقع مل سکا (جو یقیناً دیگ کا دانہ چکھنے سے بہت زیادہ تھا) مگر اس دوران میں ہر جگہ اور ہر مقام پر چینی حکومت کے عہدیداروں، ادیبوں اور عام لوگوں نے جس غیر معمولی محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا، اسکا خوشگوار احساس ابھی تک ہماری یادوں میں پھیلا ہوا ہے جس کا ذکر ہم نے اپنے سفرنامے ''ریشم ریشم'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ چانگ شی شوان عرف انتخاب عالم سے تعارف اگرچہ اس سے پہلے ہو چکا تھا اور اچھی خاصی ملاقات بھی تھی مگر بیجنگ میں اس سے ملنے کا اور ہی لطف تھا کہ یہاں نہ صرف آپس میں تبادلۂ خیال کا بار بار اور تفصیلی موقع ملا بلکہ ہم نے اس کی وساطت سے ایک اصلی چینی گھر بھی دیکھا۔ چینی معاشرے اور معاشرت کا یہ روپ ایسا ہے جو کسی سرکاری دورے کے دروان ملنا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ ایک بڑی سی عمارت کی تیسری یا شاید چوتھی منزل پر ایک سادہ اور چھوٹے سے فلیٹ میں جس کی سیڑھیوں پر درجنوں کے حساب سے سائیکلیں پارک کی گئی تھیں، وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس گھر میں اشیا تو زیادہ نہیں تھیں لیکن محبت، گرمجوشی، اعتماد اور گرہستی کی مہک اُمڈ پڑ رہی تھی۔ اسکی بیگم نے بیماری کے باوجود پاکستانی کھانوں سے ہماری تواضع کی اور ہمیں چین کے خاندانی نظام، معاشرتی روایات اور انقلاب کے بعد کی ثقافتی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ پہلی بار انتخاب عالم کے کلام کو تفصیل سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

ایک ایسا شخص جس نے ایک بالکل اجنبی زبان عمر کے درمیانی حصے میں سیکھی ہو اور جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد اسکے ڈیڑھ ارب آبادی والے ملک میں محض چند سو افراد پر مشتمل ہو، اس زبان میں ایسے اچھے، گٹھے ہوئے، نک سک سے درست اور تخلیقی اشعار کیسے کہہ سکتا ہے! یہ بات شاید ہم کبھی دل سے تسلیم نہ کر پاتے، اگر بچشمِ خود اس کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا۔ پہلے چند شعر دیکھئے:

وقت دریا ہے، کوئی جھیل نہیں ہے عالم
راہ میں غم ہو، خوشی ہو، یہ گزر جاتا ہے

ذرا طویل ہے رستہ تو کیا ہوا عالم
کہ بادبان ہوا میں کھلا ہوا تو ہے

دیکھتی آنکھوں سے ہم چپ چاپ سنتے ہی رہے
گفتگو جاری تھی رنگِ گل پہ نابیناؤں میں

بشر بس غم منانے کے لئے دنیا میں آتا ہے
دمِ آمد وہ روتا ہے، دمِ رخصت رلاتا ہے

کتابِ دہر میں جس کا جواب درج نہیں
تمام عمر وہی ہم سوال کرتے ہیں

بولنے کا حق گیا، رونے کا باقی ہے مگر
آج اشکوں سے کریں گے گفتگو ہم اور تم

کبھی ''نہیں'' کے بجائے ذرا کہو ''ہاں'' بھی
''نہیں'' کے لفظ سے یہ لفظ مختصر تو ہے

مجھے کس درجہ عادت پڑ چکی ہے دھوکا کھانے کی
کوئی آتا نہیں تو در کو خود ہی کھٹکھٹاتا ہوں

اب اگر ان اشعار سے انتخاب عالم کا نام ہٹا دیا جائے تو انہیں بہ آسانی کسی بھی پاکستانی جدید شاعر کا کلام کہہ کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت اور جدید اظہاری پیرایوں پر یہ غیر معمولی دسترس چانگ شی شوان کو ہم عصر دنیا میں ان تمام لکھنے والوں سے ممتاز اور منفرد کرتی ہے جن کے لیے اردو ایک غیر ملکی اور اجنبی زبان ہے۔

انتخاب عالم کا یہ مجموعہ ''اکادمی ادبیات پاکستان'' نے شائع کیا ہے۔ کتاب کی نوعیت، اہمیت، انفرادیت اور پاک چین تعلقات کی گہرائی اور وسعت کے پیشِ نظر اس کی طباعت کا معیار کچھ ایسا زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ مانا کہ گزشتہ دور میں اکادمی کی مطبوعات کی پیشکش میں اِسراف کا مظاہرہ کیا گیا تھا لیکن مستثنیات سے قطعِ نظر وہ کتابیں خاصی دیدہ زیب اور پیشکش کے قابل تھیں۔

چلتے چلتے اس معاملے کے ایک اور پہلو کی بات بھی ہو جائے۔ قیام پاکستان کے بعد کے تیس برسوں تک ابنِ انشاء مرحوم کی ''چلتے ہو تو چین کو چلیئے'' اور اشفاق احمد کی ''چنگو ہ پا چستان'' سے قطعِ نظر چین کے بارے میں کوئی قابل ذکر تحریر دیکھنے میں نہیں آئی۔ ثقافتی اور ادبی وفود کے تبادلے کے پروگرام میں اگرچہ پچاس کے قریب ادیب، شاعر اور قلم کار چین جا چکے ہیں مگر اسلم کمال، حسن رضوی، عنایت اللہ فیضی اور ہمارے علاوہ غالباً کتابی شکل میں کسی نے اپنے سفر اور مشاہدات کی روداد نہیں لکھی (اے حمید صاحب نے کچھ مضامین اور کوکب خواجہ نے ''نی ہاؤ'' کے عنوان سے ایک کتاب ضرور لکھی ہے) ہمارے علم اور معلومات کے مطابق اکادمی کی اپنے ہی پروگرام سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ آج تک ان کتابوں کو چین سے متعارف کرانے یا چینی میں ترجمہ کرانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی، حالانکہ دونوں ملکوں کے عوام اور لکھنے والوں کی سطح پر جو کام یہ کتابیں کر سکتی ہیں، وہ شاید یہ وفود بھی نہیں کر سکتے۔

بقیہ:

نقاش کاظمی

سائباں کی کیا ضرورت بیٹھتا ہوں دھوپ میں
یا شجر کی چھاؤں میں یا سایۂ دیوار میں

صبا نے چھیڑ دیا پھول کھلکھلانے لگے
ہجومِ خار میں گو یہ گھرا ہوا تو ہے

گناہِ عشق کی کیسی سزا ملی ہم کو
کہ سنگِ بار زیادہ تھے سر اکیلا تھا

وقت دریا ہے کوئی جھیل نہیں ہے عالم
راہ میں غم ہو خوشی ہو یہ گزر جاتا ہے

انتخاب عالم صاحب عالمِ اردو میں قدرت کا ایک اچھوتا انتخاب معلوم ہوتے ہیں اور دوست اس قدر کہ ابھی گذشتہ دنوں فون پر ان سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے پھر مجھے تاکید کی آپ کسی بھی طرح کسی ادبی وفد میں چین ضرور آیئے۔ میرے مطالبے پر آیئے۔ جس طرح آپ بھائی گلزار جاوید کے مطالبے پر میرے لیے مضمون لکھ رہے ہیں اس مضمون کی تکمیل ہونے پر مجھے لگا کہ شاید میں ''چین'' کا سفر کر آیا۔

بقیہ: چمن پہ ڈال نظر

آجکل علمی حلقوں کی اہم بحث مغرب کا زوال اور مشرق کی دریافت ہے۔ بعض مستشرقین نے اہلِ مشرق کی مذہبی زندگی اور اخلاقی اقدار میں روحانی سکون کا ذکر کیا ہے کہ میرے کچھ خوش فہم بھائی کسی لطیفۂ غیبی کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو کر امریکہ اور یورپ کی بربادی کے خواب دیکھنے میں محو ہیں۔ دوسری طرف تہذیبِ فرنگ پر جان چھڑکنے والے حضرات مغرب کی ترقی و خوش حالی پر بحثیں کر کے خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہماری درخواست یہ ہے کہ مغرب کا اِدبار یا ترقی اہلِ مغرب کا مسئلہ ہے، ہمارا نہیں۔ لہٰذا اسے اہلِ مغرب ہی کو حل کرنے دیں۔ ہم مشرق والوں کا اصل مسئلہ ہماری اپنی عظمتِ رفتہ، ہمارے تہذیبی ورثے اور ہماری قومی و ثقافتی روایات کی بازیافت ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب مشرق کے عوام میں خود آگاہی اور قومی بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے مغرب کے صنعتی معاشرے کے زوال کی صدا لگا کر اس بیماری کا علاج مشرق کی روحانیت میں تلاش کرنے کا مقصد مشرقی اقوام کو بھٹکا کر اصل جدوجہد سے ہٹانا ہے۔

یہ نکتہ انتخاب عالم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اہلِ مشرق کے سامنے اصل سوال اپنی سماجی اور معاشی پس ماندگی دور کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصول ہے۔ عالم کو ''بیجنگ میں اوور پاس پلوں کا جنگل'' اسی لئے اچھا لگتا ہے کہ اس طرح کے منصوبے مشرق کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ ویسے بھی انتخاب عالم نے اکبر الٰہ آبادی کا کہا مانتے ہوئے خود کو مشرق تک محدود رکھا ہے اور اپنے حافظے کو یورپ کی داستانوں کا خزینہ نہیں بننے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''دیوارِ چین''، ''مینارِ پاکستان'' اور ''لاہور'' پر کہی ہوئی اس کی نظمیں اہلِ مشرق کو ان کا تابناک ماضی یاد نہیں دلاتیں بلکہ ایک خوش آئند مستقبل کا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔

''یہ دن جدائی کے''

عطاء الحق قاسمی

(لاہور)

شہروں میں شہر لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور اب ہمارا ملکوں کے حوالے سے یہ خیال ہے کہ جس نے چین نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ تاریخ، ثقافت اور مناظرِ فطرت کے لحاظ سے یہ غالباً دنیا کے ''امیر ترین'' ملکوں میں سے ہے۔ ہمیں پاکستان کے اس عظیم ترین برادر ملک کی ''امارت'' کا ایک اندازہ چانگ شی شوان سے مل کر ہی ہوا۔ چانگ شی شوان سے ہماری ملاقات بیجنگ میں ہوئی جب چین کی رائٹرز ایسوسی ایشن نے پاکستانی ادیبوں کے وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا۔ استقبالیے کے اختتام پر ایک چینی دوست ہماری طرف آئے اور ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے اردو میں کہا: ''میرا نام انتخاب عالم ہے'' اس پر ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا جس پر ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے کہا ''اصل نام چانگ شی شوان ہے'' جس کا اردو میں ترجمہ ''انتخاب عالم'' ہے۔ ''اچانک ہمیں یاد آیا کہ موصوف تو کچھ عرصہ اسلام آباد میں بھی گزار کر آئے ہیں'' چینی ہوتے ہوئے اردو میں شعر کہتے ہیں اور عالم تخلص فرماتے ہیں۔

اس ملاقات تک ہم جناب چانگ شی شوان کے بارے میں صرف یہی کچھ جانتے تھے لیکن اس کے بعد ان سے مختلف مواقع پر ہونے والی ملاقاتوں مین ہم پر ان کی شخصیت کے بہت سے بھید کھلے۔ پہلے تو ہم ان کے چہرے پر نظر آنے والی سدا بہار مسکراہٹ سے متاثر ہوئے۔ آپ یقین جانیئے کہ بیجنگ میں جتنی دفعہ بھی ہماری ان سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات جتنی دیر جاری رہی، موصوف کے چہرے پر ہم نے مسلسل ایک نہایت خوبصورت مسکراہٹ دیکھی، ایسی مسکراہٹ جو چہروں کو طلوعِ سحر کی طرح دلکش بنا دیتی ہے۔ چانگ شی شوان میں حسنِ ظرافت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اچھے فقرے پر کھلکھلا کر ہنستے بھی ہیں اور اچھا فقرہ کہنے سے چوکتے بھی نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت میں دوسرا خوبصورت عنصر خلوص اور دوستانہ وارفتگی کا جذبہ نظر آیا۔ وہ ہم سے ایسے ملتے تھے جیسے برسوں کے آشنا ہیں اور اس برسوں کی آشنائی میں شبہ بھی کوئی نہیں ہے، بلکہ سچ پوچھیں تو یہ شناسائی برسوں پر نہیں، صدیوں پر محیط ہے اور اس صدیوں پرانے تعلق کا اندازہ ہمیں ان کی اردو شاعری سن کر اور پڑھ کر ہوا۔

یہ جو بیان ہم نے دیا ہے ان کی اردو غزل پڑھ کر دیا ہے جس میں اردو کی پوری کلاسیکی روایت اس خوبصورتی سے در آئی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ غزل کے یہ شعر ایک ایسے شاعر نے کہے ہیں جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور جس کی مادری زبان کی شعری روایت اردو کی شعری روایت سے، جس کا اظہار اس کی غزل میں ہو رہا ہے، کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ چانگ شی شوان کی اردو غزل پڑھتے ہوئے انسان ایک عجیب طرح کی حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ یہ چینی شاعر اس قدر پختہ تخلیقی اظہار پر قادر کیونکہ ہوا؟ چین تو یوں بھی پاکستان کا دوست ہے، لیکن ہمارے ورثے سے گہرے تعلق کی بناء پر چانگ شی شوان کی پاکستان سے محبت باقاعدہ غزل کے روپ میں ڈھلتی نظر آتی ہے، چنانچہ جب چانگ شی شوان انتخاب عالم پاکستان میں کچھ عرصہ گزار کر دسمبر ۱۹۸۲ء میں اپنے وطن چین کیلئے روانہ ہونے والے تھے تو انہوں نے سوز و گداز میں ڈوبتی ہوئی ایک غزل کہی، اس کے چند شعر آپ بھی سنیں:

مری جدائی کی گل نے سنی خبر کیسے
دمِ سحر ہی ہوئی اس کی چشم تر کیسے

ہوا ہے وقتِ سفر، طائروں نے پر کھولے
اداس صحنِ چمن میں ہے ہر شجر کیسے

وہی ہے شہرِ منوّر، وہی ہیں شمس و قمر
بجھے سے آج نظر آ رہے ہیں پر کیسے

مرے گلے میں کوئی ہار بھی نہیں لیکن
چمک رہے ہیں گریباں پر یہ گہر کیسے

کبھی تھی ایک گھڑی ایک ماہ پر بھاری
یہ ماہ ایک گھڑی میں ہوا بسر کیسے

یہ دن جدائی کے عالم گزر ہی جائیں گے
نہ پوچھ ہم سے کہ آؤ گے لوٹ کر کیسے

جناب چانگ شی شوان جب بیجنگ میں سفیر پاکستان جناب محمد اکرم ذکی کے گھر پر منعقد ہونے والی کسی شعری نشست میں اپنا کلام سناتے ہیں تو وہ اپنے لب ولہجہ اور تلفظ کے حوالے سے بھی بہت پیارے لگتے ہیں۔

واضح رہے سفیرِ پاکستان جناب محمد اکرم ذکی خود بھی ایک قادر الکلام اور بہت خوبصورت شاعر ہیں، بیجنگ میں ان کی موجودگی کی وجہ سے اس طرح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں جن میں سے ایک محفل میں ہم نے بھی جناب عالم کو پڑھتے سنا اور ان کی ادائیگی پر بھی فریفتہ ہوئے۔

''چمن پہ ڈال نظر''

غالب رضا گیلانی
(قاہرہ، مصر)

انسانی زندگی میں حصول علم کی ابتداء اسکول جانے سے شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ساری عمر جاری رہتا ہے۔ لیکن جو باتیں ہم لوریوں کی صورت میں ماں کی زبان سے سنتے ہیں ان کا نقش ہماری شخصیت پر مثبت ہی نہیں ہوتا بلکہ روح میں کہیں بیٹھ جاتا ہے جس کا اظہار تاحیات مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ارضِ پاک کی مائیں مسلم فاتحین کے حالاتِ زندگی بتا کر اپنے بچوں کے حوصلے بڑھاتی ہیں اور برادر ملک چین کے جغرافیائی حسن کے ماورائی قصے سنا کر ان کا دل خوش کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ چین کی سرزمین اور چینی عوام ہم پاکستانیوں کے لیے غیر معمولی اہمیت اور عزت و تکریم کے حامل ہیں۔ شاید اس تقدس کا نتیجہ ہے کہ ہم امام غزالی کے قول ''علم حاصل کرو خواہ چین ہی جانا پڑے''۔ کو اکثر حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔

میں نے بھی چین کا نام صغرِ سنی میں اس طرح کے کئی حوالوں میں اپنی والدہ سے سنا تھا۔ انہیں دلپذیر حوالوں میں سے ایک حوالہ مشکِ ختن کا بھی تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ ختن کی خوشبو سے دماغ کے ساتھ ساتھ انسان کی روح بھی معطر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ چین پہنچنے کے بعد میں نے ان حوالوں کی تفسیر اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنا شروع کی۔

بیجنگ میں آمد کے تقریباً دس ہی روز بعد پاکستان کالج میں ۹ نومبر ۱۹۹۷ء کو ''یومِ اقبال'' کی تقریب میں راقم کو بطور میزبان جناب چانگ شی شوان انتخاب عالم اور شعبۂ اردو بیجنگ یونیورسٹی کے مندوبین کا استقبال کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ چینی دوستوں کے شگفتہ چہروں اور اظہارِ محبت نے مجھے رنجِ مسافرت بھلا دیا۔

اس تقریب میں جناب انتخاب عالم نے شاعرِ مشرق کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ نظم کا ایک ایک لفظ محبت و احترام میں ڈوبا ہوا تھا جسے سن کر دماغ معطر اور دل شاد ہو گیا۔ دل و دماغ کی شادابی کی ایسی کیفیت دیوارِ چین اور بعض دوسری جگہوں پر بھی محسوس ہوتی۔ اسی دوران مجھے ''گلبانگِ وفا'' کا تحفہ مرحمت ہوا جسے پہلی ہی نشست میں پڑھ چکنے کے بعد دماغ کے ساتھ ساتھ روح بھی معطر ہوئی اور یوں مجھے مشکِ ختن کی تفسیر مل گئی۔ پاکستان کے ایک سچے دوست کے سچے جذبات نے مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری کی جو انتخاب عالم پر قیامِ پاکستان کی دوران ''نرم و نازک بادِ بہاراں'' نے کی تھی۔ یہ احساس اس قدر پر کیف اور روح پرور تھا کہ میں آپ کو بھی اس میں شامل کرنا چاہوں گا۔

چل رہی ہے لے بہ لے
ہلکی ہلکی نرم بادِ مشک بار
میرے تن سے خاکِ راہ
چپکے چپکے لے اڑی
بہرِ استقبال اتری عرش سے
ہلکی ہلکی بارشِ مہمان دار
میرے تن سے راستے بھر کی تھکن
چپکے چپکے دھو گئی۔

جس طرح چینی اور اردو شاعری طریقہ ابتداء اور ارتقاء کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ان دونوں زبانوں کی شاعری کے موضوعات اور اصناف میں بھی فرق ہے۔ اردو شاعری تصوف کے اثر کی وجہ سے داخلیت کی طرف مائل ہے جبکہ چینی شاعری میں مظاہرِ فطرت کا بیان بھرپور طریقے سے ہوتا ہے۔ انتخاب عالم کی شاعری میں ان دونوں رنگوں کی آمیزش ہے۔ ''گلبانگِ وفا'' کی نظمیں ایسے ہی مرقعے ہیں جن میں شاعر کے ذاتی جذبات و احساسات کا رچاؤ بھی ہے اور فطرت کی بوقلمونی بھی۔ عالم کی غزلیات بھی اپنا ایک منفرد مزاج رکھتی ہیں۔ ان غزلوں میں غمِ جاناں بھی ہے غمِ کائنات بھی، ذاتی الجھنیں بھی ہیں اجتماعی مسائل بھی لیکن یہ رنگِ تغزل مجموعی طور پر وہ غم آلودہ اور قنوطی فضا پیدا نہیں کرتا جو ہمارے اکثر غزل گو شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے اور جسے پڑھنے کے بعد قاری شاعر کی ناکامیوں اور محرومیوں کو خود اپنا مقدر سمجھ کر زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس عالم کے ہاں دکھ کا اظہار بھی جرات سے ہوتا ہے اور شاعر کا عزم قاری کو حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ابھی نسیمِ بہاری اگرچہ کم کم ہے
ہر ایک درختِ چمن جھومنے لگا تو ہے
ثمر ضرور لگے گا ابھی بہت ہے وقت
چمن پہ ڈال نظر، یہ ہرا بھرا تو ہے
ذرا طویل ہے رستہ تو کیا ہوا عالم
کہ بادبان ہوا میں کھلا ہوا تو ہے

روشن ضمیر اقوام کے ادیب اور فنکار حق پرست اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سماجی مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے استبدادی قوت کے خلاف جہاد میں شامل ہوتے ہیں۔ فلسطینی مجاہدین کی جہدِ آزادی پر عالم نے کئی مسلسل غزلیں تخلیق کی ہیں۔ خاص طور پر ''بیرون مسجد ہونے والے قتلِ عام'' پر لکھی گئی غزل تو شاہکار کا درجہ رکھتی ہے جس میں شاعر نے انتہائی کرب کے عالم میں بھی امید کی جھلک دکھائی ہے

خزاں گزیدہ چمن میں بہار باقی ہے
کہ تخمِ گل پہ مرا اعتبار باقی ہے

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیے

''شیشوں کے مسیحا''

جناب انتخاب عالم کے نظمیہ کلام سے نمائندہ انتخاب

عطیہ سکندر علی (سکھر)

نذرِ ماوزے تنگ

چین کا تُو تھا تشخص، چین کا تو تھا نشاں
جانتا تھا چین کو تیرے سبب سارا جہاں!

چین کو ہے ناز تجھ پر، چین کو ہے تجھ پہ فخر
چین کی تو آبرو تھا، چین کی تو آن وشاں!

تیرے دل میں ساری دنیا کے عوام آباد تھے
پر خیالِ ذات کا کچھ بھی نہ تھا نام ونشاں!

انقلابِ چین کا تو ہی علم بردار تھا
تورہِ تحصیلِ آزادی میں میرِ کارواں!

تیرا کہنہ خواب تھا خوش حالیٔ قوم وعوام
بزمِ تعمیرِ وطن کی تو رہا روحِ رواں!

معجزوں کا اک مرقع ہے تری راہِ حیات
جس کی ہر تصویر کرتی بیاں اک داستاں!

تونے گروایا اندھیروں کا ہر اک کوہِ گراں(۱)
جن کے نیچے دب کے ساری قوم تھی گریہ کناں!

بیج بوئے نور کے ہر طرف لمبی کُوچ نے(۲)
بن گئیں آخر سحر غاروں کی مدھم بتیاں(۳)!

تھام کر اک ہاتھ میں شمشیر، دیگر میں قلم
رزم میں بھی تو ہوا کرتا تھا اکثر شعرخواں(۴)!

اک مفکر، اک مدبر، اک سخن ور بھی تھا تُو
تو تھا علم وفن کا اک لبریز بحرِ بے کراں!

عزم تیرا سخت تر تھا آہن وفولاد سے
حوصلہ تیرا بلندی میں تھا رشکِ آسماں!

مہر کو گرہن لگے تو بھی رہے گا مہر ہی
کم نہیں کرتیں تری عظمت تری کوتاہیاں!

جب تلک جاری رہے گی گردشِ لیل ونہار
فکر تیری مثل مہر و مہ رہے گی ضوفشاں!

کوئی کہتا ہے فنا ہو جائے گا مرکر بشر
قلبِ دنیا میں ہے تیری زندگانی جاوداں۔

۱۔ اندھیروں کا ہر اک کوہِ گراں: سامراج، جاگیرداری اور نوکر شاہانہ سرمایہ داری جو چینی قوم پر ظالمانہ حکومت کرتی تھیں۔

۲۔ لمبی کُوچ: لانگ مارچ۔ بقول ماؤزے تنگ لانگ مارچ ایک بوائی کی مشین ہے جس نے انقلاب کے بیج بوئے تھے، ایک تبلیغی جماعت ہے جس نے انقلابی نظریات پھیلائے تھے۔

۳۔ غاروں کی مدھم بتیاں: ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک چینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی شمالی چین کے پہاڑی شہر یان آن میں مقیم تھی۔ اس دور میں ماؤزے تنگ اور ان کے رفقائے کار نے وہاں کے مکان نما غاروں میں رہتے ہوئے جاپان کے خلاف جنگِ مزاحمت اور جنگِ آزادی کے ابتدائی مرحلے کی کمان کی۔ ماؤزے تنگ نے راتوں کو تیل کی بتیوں کی مدھم روشنیوں میں چینی انقلاب کے متعلق بے شمار اہم مضامین لکھے۔

۴۔ رزم میں شعرخواں: ماؤزے تنگ نہایت اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ ان کی بہت سی نظمیں جنگ کے دوران گنگنا کر لکھی تھیں۔

سیرِ کشمیر

یار کہتا ہے کہ ہم ہیں وادیٔ کشمیر میں
میں مگر کہتا ہوں ہیں فردوس کی تصویر میں
مٹ گیا ہے اس جگہ پر فرقِ ارض و آسماں
سبز پربت پر اتر آئی ہے پوری کہکشاں
دیکھ کر یاں کوہ پر لٹکا ہوا اک آبشار
میں نے پوچھا خود سے بدلا کس نے رنگِ زلفِ یار؟
لوگ کہتے ہیں یہ دھرتی ہے سدا باغ و بہار
آتشِ گل کا گماں دیتے ہیں پت جھڑ میں چنار
یہ زمیں یہ دیس ہے مہمان پرور کس قدر
میں نے پائے ہر قدم پر کوہ و دریا ہم سفر
چشمِ گل میں جام پی کر آ گیا میں جوش میں
دستِ باراں مجھ کو لیکن کھینچ لایا ہوش میں
میں نے پوچھا ابر سے روتا ہے کیوں تُو بار بار؟
تو وہ بولا دیس میرا ہے لہو سے دغدار

چاند

چاند نے جب رات کو
آسماں کے اوج سے
ارض پر ڈالی نظر
تو اسے تاریکیوں میں غرق دنیا پر ترس آیا بہت
اور اس نے ارض پر کچھ نور لانے کا ارادہ کر لیا
جب وہ اترا آسمان سے
تو مقدّر نے اسے لٹکا دیا
اک صلیبِ نخل پر
اور دنیا سو رہی تھی رات کی آغوش میں
چاند کا کیا حال ہے؟ پوچھتا کوئی نہیں!

فیض کے ساتھ سرگوشیاں

سب ہیں اہلِ گلشنِ شعر و سخن نغمہ سرا
آہ! چپ ہے تُو مگر اے طائرِ شیریں نوا
اڑ رہا ہے راہِ منزل پر غبارِ پا، مگر
حیف! تجھ سے آج ہے محروم فن کا قافلہ
گونجتی ہے جب صدائے شعر بزمِ گوش میں
گونج اٹھتا ہے فضائے دل میں تیرا زمزمہ
شاخِ آزادی پہ کھلتا ہے گلِ نو جب کوئی
اس سے آتی ہے تری مانوس خوشبوئے وفا
مصر کا بازار پہلے کی طرح ہی گرم ہے
چل رہا ہے آج بھی سوداگری کا سلسلہ
ہے خزاں اک گوشۂ گلشن پہ اب بھی حکمراں
تک رہے ہیں اب بھی گل سوئے گزرگاہِ صبا
طالبِ نشتر تھی کل اپنی یہ دنیا جس طرح
دے رہی ہے اب بھی شیشوں کے مسیحا کو صدا
پاسِ وعدہ کر ذرا اے شاعرِ نور و سحر
پھر قلم کی لرزشوں سے سونے والوں کو جگا

○

دیوارِ چین

تُو کہ ہے فخرِ زمیں اپنے جلال و جاہ میں
کوئی شے جچتی نہیں تجھ بن نگاہِ ماہ میں
گو بنی ہے خاک سے تُو، ایستادہ خاک پر
عکس اپنا ڈالتی ہے تُو مگر افلاک پر
ارض کو تُو نے ملایا آسمان کے تاج سے
بادِ صحرائی کو جوڑا بحر کی امواج سے
پیرہن تیرا شفق، قوسِ قزح، ابر و سحاب
تیرے زیور ہیں نجوم و ماہتاب و آفتاب
ہے کہاں دنیا میں تجھ سا دیو پیکر شہسوار
اسپ تیرے ہیں سوئے افلاک اٹھتے کوہسار
تُو ہے بامِ آسماں پر دستِ انساں کی کمند
تُو نے دیکھا عزمِ انساں ہے فلک سے بھی بلند
تُو نے دیکھا سب سے پہلے صفحۂ قرطاس کو
اولیں حرفِ رواں کو، اولیں کمپاس کو
تُو دیکھا چین میں بارود کی ایجاد کو
اور خون و اشک سے تر منظرِ برباد کو
تُو مجاہد ہے، رہی ہے تُو وفادارِ وطن
اور وفا کا اک نشاں ہے تیرا ہر زخمِ بدن
تُو طویل و دائمی شیرازۂ تاریخ ہے
ایک خشتِ نیلگوں، اک صفحۂ تاریخ ہے

مینارِ پاکستان

تو قد اور مردِ آہن کی طرح
ارض پر پاؤں جمائے
عرش کو سر پر اٹھائے
توڑ کر لایا کبھی
آسماں کے نام سے
اک درخشندہ ستارہ
ایک تابندہ ہلال
سبز پرچم کے لئے
مثلِ فولادی قلم
تو نے اپنی سرزمین کے صفحۂ تقدیر پر
کر دیا منسوخ حکمِ مرگ کو
اور اس پر زندگی لکھ دی ہمیشہ کے لیے
تو ہے اونچی حدِّ فاصل نقشۂ تاریخ کی
دو زمانوں میں کھڑی اک آہنی دیوار ہے
اک طرف تاریک کل
اک طرف امروزِ پُر انوار ہے
تو ہے انجامِ زمانہ
تو ہے آغازِ زمانہ
تو کہ استقلال کی تصویر ہے
اور اِک تاریخ کی تفسیر ہے

نذرِ اقبال

تیری ہر اک نظم میں گنجینۂ معنی نہاں
ہر غزل جذبات کا ہے موجزن سیلِ رواں

گوہروں کا اک خزینہ ہے ترا ہر شاہکار
ساحرانہ ہے زباں، ہے منفرد طرزِ بیاں

گاہے محوِ خود کلامی ، گاہے محوِ گفتگو
گاہے کرتا ہے کسی محرم سے تو سرگوشیاں

گوتماشائے زمیں پر ہے جمی تیری نظر
ذہن پر پرواز کرتا ہے ترا تا آسماں

تو نے صنفِ نظم کو بخشی ہے کتنی آبرو
تیری نظموں پر مجھے ہوتا ہے غزلوں کا گماں

تو ہے دشمن ظلم کا، اور ترجمان انصاف کا
آدمیت کا تو علم بردار، حق کا پاسباں

دفترِ افکار ہے تو، بحرِ علم و فن ہے تو
تو امورِ دین ودنیا کا ہے یکساں رازداں

ہے خودی کا فلسفہ سرچشمۂ عزم ویقین
ہیں توانا باز سے تیرے طیورِ ناتواں

اپنی امت کے لیے تو صورتِ پیغامبر
تو رہا ہے راہِ جنگِ حق میں میرِ کارواں

تیرے دل میں ساری مخلوقِ خدا آباد ہے
اے مفکر، عمر بھر تجھ کو رہی فکرِ جہاں

اصل میں تیرا ہے تحفہ پاک دھرتی کا سحر
فلسفہ تیرا تھا سورج، ظلمتِ شب میں نہاں

دورِ فرسودہ سے تو لڑتا رہا تا زندگی
شاعری شمشیر و خنجر، شاعری تیر وکماں

تو نے ہر ظلمت زدہ دل کو چراغاں کر دیا
کوہِ یخ بستہ کو تو نے کر دیا آتش فشاں

قطب تارہ تھا شبِ تاریک کا تو اے حکیم
قافلے کے واسطے تو تھا منارِ ضوفشاں

فن ہے تیرا غیر فانی، فکر تیری لازوال
تیری شوکت دائمی ہے، تیری عظمت جاوداں

○

شب کراچی

انتخاب عالم

ستمبر میں بیجنگ گردشِ فلک وزمین کے زیرِ فرمان موسمِ خزاں کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا پودوں کے ملبوسات کے رنگ ہلکے اور انسانوں کے ملبوسات کے رنگ گہرے ہورہے تھے۔ مگر ہمارے دوست ہمسایہ ملک پاکستان کے شہر کراچی کا ساحل ابھی تک موسمِ گرما سے ہم کنار تھا۔ وہاں تو ابھی چہارسو آتشِ گل بھڑک رہی تھی اور پتوں سے سبز رس ٹپک رہا تھا۔ مرد سفید اور عورتیں پھول دار لباسوں میں کہیں محوِ خرام اور کہیں نشستہ نظر آرہے تھے۔ جن گھروں میں ایئر کنڈیشن کا انتظام نہیں تھا وہاں پنکھے اپنی دراز ہوائی درانتی کی مدد سے بندہ وآقا کے چہروں پر مسلسل اگنے والی پسینے کی فصلیں کاٹ رہے تھے۔

دن بھر کے طویل سفر کے بعد تھکا ہارا سورج مغرب میں گہری نیند سوچکا تھا اور دن بھر کی رقص وسرور کی پیشکش کے بعد چڑیاں بھی اپنے اپنے آشیانے میں رنگارنگ خواب دیکھ رہی تھیں، مگر دن بھر کے کام دھندے کے بعد اہلیانِ کراچی تھے کہ نیلگوں آسمان پر جاگتے ستاروں کی طرح ذرا سی تکان بھی محسوس نہیں کررہے تھے۔ رتجگا اہلیانِ کراچی کی عادت وخصلت میں شامل ہے۔ کراچی کی راتیں دنوں سے زیادہ روشن اور پُرکشش ہوتی ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے ہر شام کی طرح، سرِ شام آسمان پر ستارے اور زمین پر بتیاں لگ بھگ بیک وقت روشن ہوگئیں۔ میرے لیے یہ بتانا بڑا مشکل ہے کہ ستاروں نے بتیوں کو جلایا تھا یا بتیوں نے ستاروں کو۔ چھوٹی بڑی سڑکوں پر ایستادہ کھمبوں پر جگمگاتی بتیاں روشنیوں کا ایسا دریا لگ رہی تھیں جس سے نکلتی شاخیں چاروں طرف بہی رہی ہوں۔ کھمبوں سے پرے ہٹ کر دکانوں کی قطاریں تھیں جو رنگین روشنیوں سے دلہنوں کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ کچھ دکانوں کی اونچائی کھمبوں جتنی تھی اور کچھ تو آسمان کو چھونے کی کوشش کررہی تھیں۔

شاہراہوں پر گاڑیوں کے قافلے رواں دواں تھے۔ وہ دن کی معمول کی رفتار سے کچھ زیادہ ہی تیزی سے چلتے نظر آرہے تھے۔ ان قافلوں میں سرخ سرکاری بسیں، رنگین نجی بسیں، پیلی ٹیکسیاں اور طرح طرح کی رنگ برنگی ذاتی گاڑیاں شامل تھیں۔ یہ گاڑیاں دوش بدوش مارچ کرتی ہوئی ایسا سماں پیش کررہی تھیں جیسے شہر کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہو۔ شاہراہوں کے کناروں پر مرد اور عورتیں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں چل رہے تھے شاید وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے یا شاپنگ کرنے جارہے ہوں۔ کچھ لوگ تن تنہا چل رہے تھے جن میں سے بیشتر ونڈو شاپنگ کرنے والے تھے۔ شاہراہوں کی دونوں جانب بڑی چھوٹی گلیوں میں واقع روشنیوں کے دس بارہ جزیروں میں قہقہوں، گانوں اور شہنائیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن میں مرغ پلاؤ کی اشتہا انگیز خوشبوئیں بھی رچی بسی تھیں۔ ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ شادی گھروں میں رونق زوروں پر ہے۔

کئی ہوٹلوں، کلبوں، کالجوں اور کھیل کود کے میدانوں سے نکلتی ہوئی مائیکروفون کی مترنم یا واضح زیروبم کی حامل آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ جنہیں ''واہ واہ'' کی آوزیں وقتاً فوقتاً کاٹ رہی تھیں۔ یہ مشاعروں اور نجی شعری نشستوں کی آوازیں تھیں۔

بے شمار کنبے اپنے گھروں کے صحنوں میں اگے ہوئے سبزے پر میزیں اور کرسیاں لگا کر ہلکی ہلکی خوشگوار سمندری ہوا میں غسلِ مہتاب کرتے ہوئے چائے اور شربت سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ کم کم لوگ کمروں میں بیٹھے ٹی وی پروگراموں سے تفریح طبع کررہے تھے۔ سارے افراد روزمرہ کی گھریلو زندگی کی خوشی سے سرشار تھے کچھ صحنوں میں کہیں چار پانچ، کہیں دس بارہ اہلِ قلم بیٹھے اپنی نئی کاوشوں پر تبادلہ سماعت کررہے تھے جن میں سے بیشتر نظمیں غزلیں تھیں۔ وہ اپنے ہم جلیسوں کو اچھی تخلیقات پر ضرور داد دیتے لیکن ناقص پیشکش پر تنقید کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

تاحدِ نظر پھیلا ہوا بحیرہ عرب نیم غنودگی کے عالم میں کنارے کو دستِ موج سے مسلسل اور آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ دبی آواز میں بول بھی رہا تھا گویا ایک عظیم وشفیق ماں اپنی گود میں لیٹے ہوئے لاڈلے لختِ جگر کو تھپک تھپک کر لوری دے رہی ہو مگر کراچی کی آنکھ تھی جھپکتی ہی نہیں تھی۔ آدھی رات کے بعد یہ سمندر کی آنکھ کا تارا آہستہ آہستہ خاموش ہونے لگا، لیکن یہ خاموشی اضافی تھی کیونکہ رات جتنی پرسکون ہوتی جارہی تھی شعر پڑھنے اور داد دینے کی آوازیں شبنم میں اتنی ہی دھلتی جارہی تھی، لہٰذا یہ آوازیں اور زیادہ صاف اور دل آویز ہوتی گئی تھیں۔ گاہے گاہے بحری جہازوں اور ریل گاڑیوں کی سیٹیاں، طیاروں کی گڑگڑاہٹیں، حتیٰ کہ آخر میں مسجدوں سے اُٹھنے والی بلند صداہائے اذان بھی ان میں شامل ہوگئیں۔ یہ آوازیں گہری رات کی پُراسرار سمفنی بن کر فضائے بسیط میں اس وقت تک گونجتی رہیں جب تک صبائے سحری نے فلک کے ستاروں کو گل نہ کردیا۔

دراصل کراچی کی رات زندگی کی مسحور کن خوشبوئیں بکھیرنے والی ایک شیریں غزل کی طرح ہوتی ہے۔ میں والہانہ رغبت سے اسے چشمِ دل سے پڑھتا، گوشِ دل سے سنتا اور زبانِ دل سے چکھتا رہا، ایک بار، دوبار.....ان گنت بار۔

☆

''چہارسُو''

''افلاک کی تسخیر''

نعت

(کتنی راہیں کھول دیں افلاک کی تسخیر نے!)

آستانِ احمدِ مرسلؐ کا یہ اعجاز تھا
دل ابھی دھڑکا نہ تھا وہ گوش بر آواز تھا

میں کہاں اور سامنے میرے سنہری جالیاں
یہ فقط اُنؐ کی نگاہِ لطف کا اعجاز تھا

راہِ حق کی جستجو تھی، راہ طیبہ مل گئی
میرے آقاؐ کے کرم کا یہ بھی اِک انداز تھا

ذاتِ حق کا سیدِ عالمؐ سے از خود رابطہ
عالمِ انسانیت کا یہ عجب اعزاز تھا

کتنی راہیں کھو ل دیں افلاکی تسخیر نے
پھر بشر کے راستے میں ہر کوئی درباز تھا

کچھ درودوں کی صدائیں تھیں حریم ناز میں
اور جبریلِ امیںؑ بھی گوش بر آواز تھا

عظمتیں راحتؔ بیاں کیا ارضِ رحمت کی کریں
قریۂ طیبہ جہانِ لطف کا غماز تھا

○

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

نعت

جہاں اپنا ہے آبادِ مدینہ
جہاں میں ہوں وہیں یادِ مدینہ

عجب آباد ہے برباد نگری
دلِ ناشاد ہے شادِ مدینہ

مری نعتیں بلاوے کے لیے ہیں
ملے گی کب مجھے دادِ مدینہ

مرا گریہ ہے گریہ اس کی خاطر
مری فریاد ہے یادِ مدینہ

میں کب سے سوچتا ہوں مرے حق میں
نہ جانے کیا ہو ارشادِ مدینہ

ہیں امن و دوستی تعمیر اس کی
سکونِ دل ہے ایجادِ مدینہ

محمدؐ بس رہے ہیں اسی میں ثاقبؔ
مرا سینہ ہے ہم زادِ مدینہ

○

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

نعتِ رسولِ پاکؐ

جِرا کُنتُ نَبِیاً جلوہ گاہے!
بہت ہی یہ پُرانہ سلسلہ ہے!!

محمدؐ سے ہمیں جو بھی ملا ہے!
خدائے عزّ وجل کی یہ عطا ہے

سُبک رو چل رہی بادِ صبا ہے
یہاں سرکارؐ کا خلوت کدہ ہے

نبیؐ کے سامنے کوئی جچا ہے
فلک کا چاند بھی پھیکا لگا ہے

ازل سے دِل دوانہ آپؐ کا ہے
شرابِ عشق پی کر جھومتا ہے

گلابوں سا مہک جاتا ہے وہ بھی
نگاہوں سے جو روضہ چومتا ہے

درود پاک پڑھنا عاجزی ہے
نبی سے بات کرنے میں مزہ ہے

مری آنکھوں میں کعبہ کا ہے منظر!!
مرے دل میں مدینہ بس گیا ہے

نبیؐ کے اک اشارے پر ہی انجم
جو پورہ ہو وہی تو معجزہ ہے

○

حفیظ انجم کریم نگری (کریم نگر، بھارت)

نعتِ محبوبِ خدا ﷺ

مثلِ غنچہ ہیں لب ورُخسارِ محبوبِ خدا ﷺ
روئے گل ہے مطلعِ انوارِ محبوبِ خدا ﷺ

رقص کرتا ہے نگاہِ شوق میں شام وسحر
خلد کا نقشہ پسِ دیوارِ محبوبِ خدا ﷺ

دوسروں کی منفعت کو آپ ﷺ نے ترجیح دی
یہ تھا لوگو جذبۂ ایثارِ محبوبِ خدا ﷺ

اُسوۂ اعلیٰ پہ چل کر زندگی اپنی بنا
ہے مثالِ آئینہ کردارِ محبوبِ خدا ﷺ

نور کے غنچے کہیں ہیں اور کہیں رحمت کے پھول
کم نہیں ہے خلد سے گلزارِ محبوبِ خدا ﷺ

اس جہانِ رنگ و بو میں ذات باری کے سوا
جانتا کوئی نہیں اسرارِ محبوبِ خدا ﷺ

کارنامے آپ کے یوں تو ہیں دُنیا میں بہت
ہے فروغِ دینِ حق شہکارِ محبوبِ خدا ﷺ

نور کا پیکر کہو، خوشبو کہو، غنچہ کہو
مختلف رنگوں میں ہیں انوارِ محبوبِ خدا ﷺ

آمدِ قدسی نہیں ہوتی ہے صابرؔ اُس جگہ
جس جگہ ہوتے نہیں اذکارِ محبوبِ خدا ﷺ

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

'اِسکی' کی سالگرہ

(تازہ اور غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

(یو۔ایس۔اے)

گم صم، چپ چاپ، سہا سہا سا، وہ اس پجاری کی طرح کھڑا تھا جس کا خدا مر گیا ہو اور اسے پوجا کرنے، ماتھا رگڑنے کے لیے کسی نئے مندر کی چوکھٹ کی تلاش ہو۔ اس کی آنکھیں جذبات سے عاری تھیں، چہرہ سپاٹ اور کاغذ سا سپید، بے حرف، کورا... لیکن اس کے خشک ہونٹوں کے کناروں پر ایک سوکھی، مریل سی مسکان تھی، جو اس کے جذبے سے خالی چہرے کو اور بھی اجنبی بنا رہی تھی۔

میں نے اس کو خود سے لگ بھگ پانچ گز کی دوری پر کالے، گورے، چینی، کوریائی ٹورسٹوں کی قطار میں کھڑا دیکھا تو پہلے تو میں اسے پہچان نہ پایا۔ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا، یعنی کسی ایسے شخص کا جسے پہلے ایک دو بار ہی دیکھا ہو۔ پھر جب اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں، اور زیر لب کہا، ''یا اللہ! پروفیسر صاحب!'' تو میں اسے پہچان گیا۔

وہ محمد دین تھا جو ارلنگٹن میں میرے کچھ پاکستانی واقف کاروں کے گھر میں رہنے آ گیا تھا۔ دیگر کئی نو وارد تارکین وطن کی طرح وہ بھی غیر قانونی طور پر رہائش پذیر تھا۔ کسی بحری مال بردار جہاز کے عملے میں صفائی کرنے والے کے طور پر کام کرتے ہوئے وہ بالٹی مور کی بندرگاہ پر ایک دن کی ''شور لیو'' لے کر اترا تھا اور سیدھا ٹرین پکڑ کر واشنگٹن آ گیا تھا۔ اس کا یوں غائب ہو جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ستر اور اسّی کی دہائی میں ایسے سینکڑوں نوجوان جنہیں انگریزی بولنا بھی نہیں آتا تھا، امریکا پہنچے تھے اور جہازوں سے اترتے ہی اپنی جیب میں رکھے ہوئے کسی پتے پر پہنچنے کے لیے دو نزدیکی شہروں واشنگٹن یا نیویارک میں سے کسی ایک کا رخ کرتے تھے۔ محمد دین بھی ٹرین پکڑ کر امریکا کے دارالخلافہ میں پہنچا تھا اور مضافاتی علاقے ارلنگٹن میں ایک ہی بیڈروم میں رہائش پذیر چھ دیگر پاکستانی نوجوانوں کے ساتھ ایسے مل جل گیا تھا جیسے برسوں سے ہی وہاں رہ رہا ہو۔ کام تو یہی تھے، جو بغیر کسی حجت کے مل جاتے تھے، کاریں دھونا، لوگوں کے لان میں مشین سے گھاس کاٹنا، ریستورانوں میں پلیٹیں دھونا یا باورچی کا کام کرنا، لیکن اپنے ملک میں بیکار رہنے کے مقابلے میں یہ آمدنی بھی کافی تھی۔ اور ''حوالہ'' کے ذریعے واپس گھر رقم بھیجنا بھی بے حد آسان تھا۔ میری اطلاع کے مطابق چار برس پہلے جب آخری بار میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ''سیون الیون'' پر کام کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ انگریزی بولنا سیکھ گیا ہے اور اس کی فی گھنٹہ تنخواہ بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

مجھے جب بھی کسی کے ساتھ پنجابی بولنے کی 'طلب' ہوتی (وہی طلب جو تمباکو نوش کو یا پان چبانے والے کو ہوتی ہے) تو میں ان بے حد ملنسار پاکستانی دوستوں کے گھر چلا جاتا۔ کچھ لوگ رات کی ڈیوٹیاں کرتے تھے اور دن کے وقت گھر پر ہی ہوتے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک بڑی نعمت تھی کہ امریکا میں انگریزوں کو انگریزی پڑھانے والا ایک پروفیسر ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، تاش کھیلتا ہے، بیئر پیتا ہے اور امیگریشن کے معاملات میں فارم بھرنے یا تصدیق کروانے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

واشنگٹن ڈی سی امریکا کا دارالخلافہ تو ہے ہی، لیکن اس کی شناخت اس لیے بھی ہے کہ ہر ہفتے اور اتوار کو امریکا جیسے بڑے رقبے کے ملک کے ہر کونے سے آئے ہوئے سیاح یہاں آ کر 'مال' پر بکھر جاتے ہیں، جو پوٹامک دریا کے شمالی کنارے سے لے کر سینیٹ ہال کیپیٹل ہل تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی مال کے عین وسط میں اور دونوں کناروں پر بنی ہوئی ان درجنوں یادگاروں کی عمارات اور امریکی تاریخ کے عظیم فرزندوں کے بُت اور مینار ہیں جو واشنگٹن میں آنے والے ہر سیاح کے دیکھنے اور یادگاری تصویریں لینے کے مراکز ہیں۔ ان میں ابراہام لنکن کا وہ اونچا بُت بھی ہے جس میں لنکن کو کرسی پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اور جارج واشنگٹن میموریل کا وہ مینار بھی ہے جس پر چڑھنے کے لیے ٹورسٹوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور قطار کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی باری مشکل سے ایک گھنٹے کے بعد آتی ہے۔ محمد دین اسی قطار میں کھڑا تھا اور میں قطار کے باہر کھڑا پتنگ بازی میں مصروف لوگوں کے رنگ برنگے اور مختلف شکلوں والے پتنگوں کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

چار سالوں کے بعد محمد دین کو یوں صمّ بکمّ کھڑے دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا لیکن اس طرح کہ قطار میں کھڑے ہوئے دیگر لوگوں کو یہ شک نہ ہو کہ میں اپنی جان پہچان کے ایک شخص کو دیکھ کر نامناسب طور پر قطار میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

تب اس نے دوسری بار اردو میں کہا۔ ''الحمدللہ... آپ پروفیسر صاحب یہاں؟''

میں نے پنجابی میں اس سے بات کرتے ہوئے پوچھا، ''کیا حال چال ہے، میرے دوست، تمہارے پیچھے والے جہلم کے گھر میں؟''

اس کے ہونٹوں کی خشک مسکراہٹ زیادہ خشک ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر اپنی زبان پھیری، پہلے کچھ نہ بولا، پھر کہا، ''پتہ نہیں، چھ ماہ سے کوئی خط نہیں آیا۔''

اتنا کہہ کر وہ جیسے تھک سا گیا۔ اس نے میری طرح ہی اوپر اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھا۔ ان آبی پرندوں کی طرف بھی جو ہر طرف ہوا میں اور

گھاس پر بکھرے ہوئے تھے اور ٹورسٹوں کے پھینکے ہوئے آدھے کھائے چاکلیٹ، برگر، مکی کے بھنے ہوئے دانے وغیرہ اچک رہے تھے۔ پھر جب اس نے میری طرف نظریں گھمائیں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بے جان تھیں۔

میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد پوچھا، ''یہ کیا شکل بنا رکھی ہے محمد دین تم نے؟''

وہ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ ادھر دیکھتا رہا جدھر پتنگ اور غبارے بیچنے والوں کے اسٹال تھے۔ ایک دو منٹ اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یونہی دیکھتا رہا، پھر پوچھا، ''آپ انڈیا گئے تھے؟''

''ہاں!'' میں نے کہا، ''ان چار برسوں میں دو بار جا چکا ہوں۔ یہاں یونیورسٹی کی نوکری ابھی چھوڑی نہیں ہے۔ پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں جانے کے لیے پاکستانی سفارخانے میں ویزا لینے گیا تھا لیکن ویزا نہیں ملا، اس لیے انڈیا جا کر ہی لوٹ آیا۔ میرا گاؤں، تم جانتے ہو، ضلع چکوال میں ہے جو پہلے جہلم کی ایک تحصیل تھا۔ اور جہلم کون سا میرے گاؤں سے دور ہے۔ بس یوں سمجھو کہ لاری سے دو گھنٹوں کا سفر ہے۔ بچپن میں کئی بار جہلم گیا تھا، وہاں میرا ننھیال تھا، اور وہی تمہارا محلّہ، پیراغیب.... میرا تو سارا شہر دیکھا ہوا ہے۔''

محمد دین جب پہلی بار مجھے ملا تھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے جس میں ہر برس گرمی کی چھٹیوں میں میرا جانا ایک معمول بن گیا تھا۔ پھر جب مجھے پتہ چلا کہ وہ کمال بھٹی کا چھوٹا بھائی ہے، تو مجھے اور بھی خوشی ہوئی تھی۔ کمال اور میں ایک ہی عمر کے تھے اور جب بھی میں جہلم جاتا، ہم لوگ اکٹھے کھیلتے۔ محمد دین شاید ایک یا دو برس کا تھا جب وطن کی تقسیم ہوئی، تب کمال اور میں سولہ برس کے تھے۔ اس لحاظ سے وہ کمال کے چھ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر پیار سے پوچھا، ''محمد دین، کیا بات ہے؟ اداس کیوں ہو؟''

سامنے نیشنل ایئر پورٹ سے اڑتے ہوئے ہوائی جہازوں کی ہر بیس سیکنڈ کے بعد اڑانوں کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے محمد دین چپ چاپ کھڑا رہا۔ جب سامنے کی قطار آگے کی طرف کھسکنے لگی اور ہمارے وہاں جم کر کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تو پیچھے کھڑے لوگ آپس میں ہماری طرف اشارے کر کے کھسر پسر کرنے لگے۔ میں نے کھینچ کر اسے کچھ قدم آگے کر دیا لیکن خود لائن سے باہر ہی کھڑا رہا۔

''وہ چلی گئی۔'' اس نے یکا یک کہا۔

''کون....؟'' اور یہ کہہ کر مجھے افسوس ہوا۔ اصل میں مجھے علم تھا کہ چار برس پہلے ارلنگٹن کے ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس میں اس نے دوسرے دوستوں سے الگ اپنا اپارٹمنٹ لے لیا تھا جہاں ایک گوری خاتون اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ مجھے اس کا نام بھی یاد تھا۔ ڈیبرا، ہاں یہی اس کا نام تھا۔ اپنے غلط سوال کو سنوارتے ہوئے میں نے دوبارہ پوچھا، ''کون؟ ڈیبرا؟''

''ہاں،'' وہ بولا۔ ''وہ پچھلے مہینے اپنے پرانے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے کے لیے واپس چلی گئی!''

زخم کا دہانہ ذرا ذرا سا کھل گیا تھا۔ سرجیکل نشتر میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک سرجن کی طرح پھرتی اور تیزی سے اس کا استعمال میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں گندے، درد بھرے مواد کو زخم کے منہ سے دھیرے دھیرے چیر کر صاف کرنا چاہتا تھا۔ یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے علاوہ میں اسٹوڈنٹ ایڈوائزر کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا، اور یہ کام مجھے بخوبی آتا تھا۔

''ڈیبی تو اچھی لڑکی تھی....'' میں نے کہا، ''اور تم سے پیار بھی بہت کرتی تھی... اور وہ۔۔۔وہ...اس کا کیا ہوا؟'' میں نے اناڑیوں کی طرح اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میرا مطلب صاف تھا۔ جب ارلنگٹن میں اپنا مکان بیچ کر میں اور میری بیوی ریسٹن آنے کے لیے اپنا سامان ٹرک میں بھر چکے تھے تو میں اپنے پاکستانی دوستوں کو الوداع کہنے کے لیے سب کے گھر گیا تھا۔ جب محمد دین کے اپارٹمنٹ میں گیا تو مجھے ڈیبرا حاملہ دکھائی دی تھی۔ مجھے علم تھا کہ محمد دین پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور جہلم میں اس کی بیوی اور دو بچے اس کے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ سبھی اس کے واپس آنے کے انتظار میں تھے۔ ویسے ڈیبی سے محمد دین نے شادی نہیں کی تھی، لیکن لاکھوں دوسرے جوڑوں کی طرح وہ اکٹھے رہ رہے تھے۔ یوں بھی اسپتال میں بچے کی پیدائش پر برتھ سرٹیفکیٹ پر صرف ماں کے نام کا اندراج ہوتا ہے، باپ کا نہیں۔ اور اگر بچے کو ساتھ لے کر کہیں امریکا سے باہر سفر کرنا ہو تو ماں کے پاسپورٹ پر بچے کا نام درج ہوتا ہے، باپ کے پاسپورٹ پر نہیں۔ چار برس پہلے بھی ڈیبرا کو حاملہ دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا، لیکن دونوں بازار میں چلتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہتے تھے اور یہی لگتا تھا کہ دونوں میں بے حد محبت ہے۔ ڈیبرا تو پڑھی لکھی لڑکی تھی اور امریکا کے قانون سے واقف تھی۔ اگر انہیں اکٹھا نہیں رہنا تھا تو اس نے ماں بننا کیوں منظور کیا، اس بات پر مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اگر اس پڑھی لکھی لڑکی کو ایک ان پڑھ مزدور کے ساتھ رہنے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی تو مجھے کیا ضرورت تھی اس بکھیڑے میں پڑنے کی۔ میں چپ رہا تھا اور دل ہی دل میں ان کی خانگی زندگی کی کامیابی کی دعا کرتا رہا تھا۔

اس نے پھر میرے طرف خاموش اور ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔ میرے سوال کا جواب شاید اس کی زبان پر تھرتھرا رہا تھا، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی اور میں یہ سوچتا رہا کہ دن کی گود میں سلگتے ہوئے ٹھنڈے سانسوں کے گرم انگارے صرف آنسوؤں کی بوچھاڑ سے ہی بجھ سکتے ہیں، ایک دو آنسو نہیں، ایک پوری آبشار۔ اسے رونا چاہیے، اسے کھل کر رونا چاہیے....لیکن وہ رویا نہیں، چپ چاپ کھڑا رہا۔

پھر وہ بولا۔ مجھے لگا جیسے کسی کوئیں کے اندر سے کوئی بھیگی ہوئی آواز آ رہی ہو۔ ''آج اسے تین برس کا ہونا چاہیے تھا...ایلیسی آج تین سال کا ہو گیا

ہے۔ مجھے اس کو ساتھ لانا تھا، واشنگٹن میموریل کے مینار پر چڑھنے کے لیے۔ میرا وعدہ تھا اس سے!''

''الیکسی نام ہے کیا اس کا؟'' میں نے سرجیکل نشتر کو ذرا اور آگے بڑھایا۔

''ہاں، الیکسی! الیکزانڈر!! اردو میں اسکندر ہوگا، ہے نا؟ میں اسے اسی نام سے پکارتا ہوں، اسکندر، یعنی 'اِسکی'... کیسا نام ہے، پروفیسر صاحب؟''

''بہت پیارا نام ہے...'' میں نے کہا۔ ''تو آج اس کا تیسرا برتھ ڈے ہے، تو ہم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ چلتے ہیں، کہیں بیئر ویئر پیتے ہیں... یونیورسٹی میں آج میری کوئی کلاس نہیں ہے، میں تو یونہی دھوپ سینکنے کے لیے ادھر نکل آیا تھا۔''

''نہیں، سر!'' وہ ادب کے ساتھ بولا، جیسے میرا سٹوڈنٹ ہو۔ ''نہیں سر، آج تو مجھے یہیں کھڑے رہنا ہے۔ شاید وہ ماں سے ضد کرے کہ ابّا نے اسے واشنگٹن میموریل دکھانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ اس کو ساتھ لے کر آ جائے۔ میرا ڈیبی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا۔ ایک مہینے سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اسکی بیٹا اب تھوڑی تھوڑی پنجابی بھی بولنے لگ گیا تھا۔''

''پنجابی کی گالیاں؟'' میں نے ہنستے ہنستے کہا، ''تم تو ہر وقت ماں یاہ ماں یاہ کرتے رہتے ہو!''

''لاحول ولاقوۃ! آپ بھی کیا بات لے بیٹھے۔ میں اسے کیا گالیاں سکھاؤں گا سر جی؟ میں تو ان پڑھ جاہل ہوں، وہ تو امریکی ہے۔ گالیاں نہیں، صاف اچھی انگریزی بولتا ہے۔۔۔۔ اسے میں نے دھوکے میں نہیں رکھا۔ اسے اس کی بڑی ماں کے بارے میں بتایا جو پاکستان میں ہے۔ پھر اس کے بڑے بھائی بہنوں کے نام بتائے۔ پاکستان کے بارے میں بتایا۔ جہلم کے پیراغیب محلے کے بارے میں بتایا۔''

''پیراغیب محلے کی کچی گلیوں، ان میں بہتی گندی نالیوں کے بارے میں بھی؟'' میں نے ہنستے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اب وہ گلیاں کچی کہاں رہیں صاحب جی؟ آپ تو ۱۹۴۷ سے پہلے کی باتیں کرتے ہیں۔'' وہ کچھ ناراض سا ہو گیا۔

''میں کیا جانتا ہوں محمد دین! مجھے تو تمہارے ایمبیسی نے ویزا ہی نہیں دیا، ورنہ خود جا کر دیکھ آتا۔ ہمارے دونوں ملکوں کے تعلقات اچھے کم اور برے زیادہ ہیں۔ خدا جانے کب ٹھیک ہوں گے اور میں اپنی جنم بھومی کو جا کر سلام کر سکوں گا۔''

''ہاں۔۔۔'' وہ پنجابی میں بولا ''ہُن تُسی ویکھو پروفیسر ساب، اسی پنجاہ سّٹھ لوک تاں اپنے علاقے دے ای آں، انڈیا دے وی تے پاکستان دے وی، اتھوں دے گوریاں نوں کیہہ پتہ اے کہ کہیڑا کہیڑے ملکوں آیا اے۔ سارے سانوں پاکی کہندے نے جے کہ ایہی ناں ہُن مشہور ہو گیا اے۔ یا دا اے تساں نوں کہ سیون الیون دے منیجر نے اک وار تُساں نوں آکھیا سی کہ تساڈا چھوٹا بھرا اس دے سٹور وچ کم کردا اے۔ اُہ مینوں تساڈا نِکا بھرا سمجھدا رہیا۔۔۔۔'' وہ ہنسا۔ ''کتھے میں تے کتھے تُسی!''

''ارے محمد دین۔۔۔ تم کیا میرے چھوٹے بھائی نہیں ہو؟ کمال کر دیا تم نے تو!''

اس نے میری بات نظر انداز کر کے چاروں طرف نظر گھمائی۔ ''شاید وہ دونوں ماں اور بیٹا آ ہی جائیں۔ میں صبح سات بجے سے کھڑا ہوں۔ جب یہ قطار گیٹ کے پاس پہنچ جاتی ہے، تو میں لوٹ کر پھر سب سے پیچھے آ کھڑا ہوتا ہوں... شاید بیٹا اسکی آ ہی جائے۔''

بات کیسے چھیڑی جائے تا کہ وہ یہ صدمہ سہہ سکے۔ کہیں سے پکڑنے کے لیے کوئی تاگا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے احمقوں کی طرح میں نے پھر وہی جملہ دہرا دیا۔ ''تو آج اسکی کی سالگرہ ہے۔ یعنی وہ تین برس کا ہو گیا ہے آج۔ گویا اس نے چوتھے برس میں پاؤں رکھا ہے۔۔''

''ہاں، تین سال کا... سُنّت کے لیے نہیں مانتی تھی۔ کہتی تھی کہ یہ بڑا ہو گا تو اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی دوستی نہیں کر سکے گی۔ کہتی تھی کہ اس کا بیٹا کسی طرح بھی دوسرے گوروں سے مختلف نہ ہو... اس کا بیٹا!'' اس نے تلخی سے کہا۔ لیکن سنّت کی بات سے جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ہاں، اسی کا بیٹا تو ہے۔ برتھ سرٹیفکیٹ میں تو میرا نام بھی نہیں ہے۔'' وہ دور اُفق پر دیکھنے لگا، جہاں جہازوں کی اڑانیں باقاعدگی سے آ جا رہی تھیں۔ چند لمحے ناگوار سی خاموشی رہی۔

میں نے سوچا، اب وہ رو پڑے گا اور مجھے اتنے سارے لوگوں کے بیچ میں اسے بہلانا پڑے گا، اس کے آنسو پونچھنے پڑیں گے، اسے چپ کروانا پڑے گا۔''

لیکن وہ رویا نہیں، بولا، ''آپ نے ایک بار اپنی ایک اردو نظم سنائی تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ جب رات کے پاس سسکیوں کے سوائے اور کچھ بھی نہ ہو، اور دن کی گود میں صرف آہوں کے جلتے بجھتے ہوئے انگارے ہوں، تو کیسے جیا جا سکتا ہے...''

''جینا تو بہر حال پڑتا ہے، میرے چھوٹے بھائی،!'' میں نے کہا، ''ڈیبی کے لیے نہ سہی، اسکی کے لیے ہی سہی۔ کیا پتہ، بڑا ہو کر وہ کہے کہ وہ اپنے پاکستانی ابّا کے ساتھ رہنا چاہتا ہے!''

وہ چونکا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئیں۔ ''مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا، سر جی! ہاں، جونہی وہ اٹھارہ برس کا ہو جائے گا، اسے یہ اختیار ہو گا کہ وہ چاہے تو امریکن شہریت رکھے یا پاکستانی شہری بن جائے۔ ..لیکن، سر جی، پروفیسر صاحب، اس کے برتھ سرٹیفکیٹ پر تو میرا نام بھی نہیں ہے اور میں بھی ابھی تک یہاں امریکا میں غیر قانونی طور پر رہ رہا ہوں۔ میرے پاس

باقی صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ فرمائیے

زندگی دوسروں کے لئے

وقار بن الٰہی

(اسلام آباد)

اُس نے ٹرالی پر سے سارا سامان اُتار کر بِل کی ٹرے پر رکھا' دل ہی دل میں سوچا' اِس بار خاصی حجامت ہوگی۔ پھر مسکرایا' اِس بار ہی کیوں' ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہنے کو وہ کھاتا ہی کتنا ہے لیکن سامان ہے کہ ہر ماہ اُس کی جیب ہلکی کر ہی ڈالتا ہے۔ اُس نے سیلز گرل کو بل بنانے دیا اور ہر دوسرے خریدار کی طرح ساتھ کی بِل پر دھرے سامان کا جائزہ لینے لگا' جہاں معاملات تقریباً طے پا چکے تھے۔۔ارے۔۔سامان کی مقدار سے تو لگتا ہے' خاندان بڑا ہی نہیں' بسیار خوروں کا ہے کہ سامان ٹرے سے باہر گر رہا تھا۔ قدرتی بات ہے جب اِتنا سامان خریدا جا رہا ہو تو جی چاہتا ہے' خریدار کے بھی دیدار کر لئے جائیں۔ اُس کے ساتھ متعدد بار ایسا ہو چکا تھا اور وہ خود بھی وقت گزارنے کے بہانے یہ حرکت کئی بار کر چکا تھا۔ اب جو اُس نے ٹرالی سے نگاہیں ہٹا کر اُس کے پیچھے کھڑی خاتون کو دیکھا تو۔۔پل بھر کو وہ ٹھٹکا' دِل پہلے دھڑکا' پھر شاید منہ کی طرف لپکا' پھر راہ نہ پا کر واپس سینے کی اندھیری کوٹھڑی میں ہی دُبک تو گیا لیکن چال اُس کی لڑکھڑاتی ہی رہی۔ اچانک پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے یا غیر متوقع طور پر دل میں چھپی بیٹھی صورت کو یوں سامنے دیکھ کر یا کسی بھی وجہ سے اُس کی ہتھیلیاں پسینے میں ڈوب گئیں۔ پھر گھبراہٹ طاری ہوئی' یہاں سے نکلے تو کیسے' راستہ تو بند تھا ہی' وہ پھلانگ کر بھی گزر سکتا تھا لیکن۔۔لوگ کیا کہیں گے؟ وہ جھجھکا لیکن پھر کسی کی پرواہ کئے بغیر دو تین حضرات کو دھکیلتا ہوا باہر کی طرف لپکا لیکن۔۔خاتون تو کب کی اپنا بل ادا کر کے سامان اُٹھوا کر جا بھی چکی تھی۔ وہ دائیں' بائیں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ باہر فُٹ پاتھ پر حیران پریشان کھڑا سوچے ہی جا رہا تھا' وہ عارفہ ہی تھی یا کوئی خیال یا روح جو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گئی یا شاید اُس کی نظر کا دھوکا تھا' نہیں' نظر کا دھوکا نہیں ہو سکتا' وہ عارفہ ہی تھی جس نے اُسے بھی پہچان لیا تھا اور شاید اِسی وجہ سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی تھی۔

واپس اسٹور کے اندر آ کر اُس نے بل بے دِلی سے ادا کیا' سامان اُٹھوایا' باہر لے جا کر گاڑی کی ڈِگی کا دروازہ کھولا' سامان اندر پھکوا کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور اگنیشن میں چابی ڈال کر اُسے گھمانے سے پہلے سوچنے لگا۔۔''تو وہ واپس آ گئی ہے اور اِسی شہر میں ہے۔'' چابی گھُماتے ہوئے اُس کے ذہن نے قلا بازی کھائی۔ اُسے تلاش کرے تو کیسے اور اگر تلاش کر بھی لے تو۔۔وہ تو خود اُسے آج ہی نہیں برسوں پہلے کھو چکا تھا پھر تلاش کر کے کیا پالے گا اور کھویا بھی تو اُسی نے تھا۔۔؟ اتنے طویل عرصے میں دونوں طرف خاموشی ہی رہی تھی' ٹھنڈک بھری خاموشی' اب بھلا اُس ٹھنڈک' اُس برف کے پگھلانے سے کیا حاصل ہو گا' کچھ حاصل بھی ہو گا یا نہیں؟؟ یا کیا واقعی ٹھنڈک اور برف کا وجود تھا بھی یا نہیں یا۔۔نیچے ہی نیچے جلی ہلکی آنچ برف کو نہیں' اُسے مسلسل جلائے جا رہی تھی۔ بہر حال اب اِس کی گنجائش تھی ہی کہاں کہ کچھ حاصل کرنے یا کھو دینے کے بارے میں سوچا جا سکتا' اب تو دیر ہی نہیں ہو چکی بلکہ زندگی گذر چکی تھی' سب کچھ لُٹ چکا تھا۔۔انہی اُلجھنوں میں اُلجھتے ہوئے جانے وہ کتنی دیر تک شہر کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ذہن جیسے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا' ایک حصہ کچھ کہتا تو دوسرا اُسے جھٹلا دیتا' ایک حصہ کوئی تجویز پیش کرتا تو دوسرا اُسے فوراً رد کر دیتا لیکن یہ طے تھا کہ جب اُس پر یہ واہوا کہ جس صورت کو وہ سمجھتا تھا کہ برسوں سے بھُلائے بیٹھا ہے' وہ تو نہ صرف تازہ ہے بلکہ اُس کی نگاہوں میں ایسی اور اتنی گڑی ہوئی ہے کہ لاکھ کھرچنے کی کوشش کرے' کامیاب نہیں ہو گا' تو دل جیسے دھڑکنا بھول کر گہرے کوئیں میں چھلانگ لگا گیا۔۔اگر وہ پھر سامنے آ گئی تو۔۔۔اُس کا سامنا کیسے کر پائے گا۔۔کیسے۔۔اور اگر وہ کوئی سوال کر بیٹھی تو وہ۔۔۔کیا جواب دے گا؟

کہتے تو یہی ہیں کہ یاد نہیں رہتا' پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی' کیسے ملے تھے' کہاں کون ٹکرایا تھا' کون کس کے دل میں اُترا تھا لیکن اُسے تو ایک ساتھ بیتا ہوا' ایک ایک پل یاد تھا۔ وہ کلاس روم اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوما نہیں' آ کر ٹھہر گیا' جس کمرے کے در و دیوار اُن کی بات چیت' بحث مباحثوں' طنز و مزاح' شور و غُل کے امین تھے۔ ہم جماعت تو وہ تھے ہی اور اِسی بہانے آپس میں ملنا جُلنا بھی ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کتابوں کے علاوہ بھی کسی دوسرے موضوع پر بات ہو جاتی تھی لیکن بات ہی ہوتی' معاملہ اِس سے آگے کبھی نہیں بڑھا تھا اور بات جب یہیں تک محدود ہو تو کون کسی کو کہاں تک یاد رکھتا ہے۔ پھر وقت یقیناً وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ موبائل تو رہے ایک طرف' ڈھنگ کا فون بھی کسی کسی کے پاس تھا اور انٹرنیٹ ابھی ہماری سائیکی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ سو چند نوجوان ایک ساتھ چار سال ایک تعلیمی اِدارے میں ساتھی رہے اور اُس کے بعد اپنے اپنے حصے کا بوجھ اُٹھانے بکھر گئے۔ ملازمت کی بھی صورت یہی تھی کہ سفارش کی ضرورت یا حاجت نہیں پڑتی تھی' تعلیم سے فارِغ ہوئے تو بُری بھلی' چھوٹی بڑی' اعلیٰ ادنیٰ ملازمت منتظر ہوتی تھی' سفارش صرف سونے کے ساتھ سہاگے کا کام کیا کرتی تھی یا پھر جو لوگ منہ میں سونے یا چاندی کا سکہ لے کر پیدا ہوا کرتے' اُن کا ذکر اُس وقت فضول تصور کیا جاتا تھا اور آج بھی کیا جاتا ہے۔ عارفہ اور شاہد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سینگوں کے سمانے کے لئے جو جگہیں متعین تھیں' وہ وہیں پہنچ گئے۔

یہ یاد تو رہا کہ وہ کہاں اور کیسے ملے تھے لیکن یہ یاد رہا نہ علم ہوا کہ

کیسے اور کب چاہت کا پودا اُن کے سینوں میں اُگنے اور جڑ پکڑنے لگا۔ کس نے کھر پہ چلایا' کس نے کھاد ڈالی' کون آبیاری کرتا رہا کون نظریں چُرا کر دوسرے کی طرف دیکھتا رہا اور۔۔۔شاید دونوں ہی کرتے رہے۔ جماعت کے کمرے سے نکلے تو لگا' علیحدہ علیحدہ تو سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔ اپنی اپنی ملازمت میں قدم جمانے کے بعد پہلی بار ملے تو جیسے ایک دوسرے سے کہنے کے لئے اُن کے پاس ایک نہیں کئی داستانیں تھیں لیکن مل بیٹھے تو گنگ جیسے زبانیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر چھوڑ آئے ہوں۔ بے بنیاد شکوے شکایتیں' یہ بھی نہ ہوتا تو وہ کرتے بھی کیا۔ پہلی ملاقات مختصر سی رہی' پھر ملاقاتیں بڑھیں تو بڑھتی چلی گیں۔ وہ کہتا۔

''حد ہے یار' ہم لوگ اتنا قریب رہے اور احساس ہی نہ ہوا کہ ہم اگر بچھڑ گئے تو کیا ہوگا۔۔ ہمارے لئے تو سانس لینا بھی کتنا مشکل ہو جائے گا۔'' عارفہ کہتی۔

''وہ تو ٹھیک ہے شاہد لیکن سوچو تو ہم اپنے والدین کو کیسے پہلے آمادہ اور پھر راضی کریں گے۔'' شاہد بڑی معصومیت سے کہتا۔

''بھلی لوگ' ہم ساتھ ہیں تو ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔۔۔بس۔۔''

عجیب بات ہے' دو لوگ جب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں' جب ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں' ایک ساتھ مل کر سانس لینے لگتے ہیں تو اُن کے نزدیک زندگی کا نام اور مقصد ایک دوسرے کی ذات تک ہی محدود ہو جاتا ہے۔ اِرد گرد کا اُنہیں ہوش ہی نہیں رہتا۔ وہ سمجھتے ہیں' ایک دوسرے کو ہر روز خط لکھ لیا' بہانوں سے دو روز کی چھٹی لے کر ایک دوسرے سے کبھی باغ میں کبھی کسی سینما میں کبھی کسی ریستوراں میں مل لیا تو یہی زندگی ہے' اِسی طرح سفر کا آغاز کیا جاتا ہے اور ایسے ہی منزل پر پہنچا جاتا ہے۔ یہ پہلی سیڑھی ہی اِس قدر مدہوش کر دیتی ہے کہ آگے پیچھے' دائیں بائیں کوئی دیکھتا ہے نہ دیکھنا چاہتا ہے' اپنے اپنے محدود دائروں میں سبھی گھومتے رہتے ہیں۔ وہ جہاں بہت سی دوسری باتیں فراموش کر جاتے ہیں' یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ زندگی میں جہاں قربتیں ہیں وہاں دوریاں بھی ہیں اور جب دوریاں اپنا چہرہ دِکھاتی ہیں تو وہ روشن نہیں ہوتا' تاریک اور مکروہ ہوا کرتا ہے۔۔ پھر کامیابی کا معیار کیوں بندھن ہی قرار پاتا ہے۔ ایک بار شاہد اور عارفہ نے بھی اس موضوع پر بات کی تھی۔ شاہد نے کہا تھا۔

''ضروری تو نہیں کہ دو ملنے والوں کی منزل بندھن ہی ہو' وہ دوستوں کی طرح۔۔۔'' عارفہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''تم اپنے معاشرے سے واقف ہونے کے باوجود یہ کہہ رہے ہو' میں بہر حال اس طرح کے تعلق اور انجام کی قائل نہیں ہوں۔ جب قربت یہاں تک پہنچ چکی ہو تو پھر۔۔ پھر دوسرے کسی اور کے بارے میں سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے؟'' شاہد کے پاس جواب نہ تھا' تھا بھی تو اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔

خوشبو کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے اور کامیابی بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق اور چاہت کو کسی طور پھیلنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ عورت پھر اپنے جذبات پر قابو پا لیتی ہے لیکن جلد بازی کا دلدادہ مرد۔۔ ہمیشہ یہی سوچتا ہے' سو منات اُسی نے فتح کیا ہے' بے صبری میں ایسے قدم بھی اُٹھا جاتا ہے جو اُسے پاتال میں جا پھینکتے ہیں۔۔ شاہد اُلجھنوں کا شکار ہوا تو اُس کا چہرہ اُس کے منصوبوں کی چغلی کھانے لگا۔ رنگت اُڑنا شروع ہوئی تو اُڑتی چلی گئی اور گھر والے سنجیدگی سے سوچنے لگے' ملازمت کے کسی چکر میں تو نہیں اُلجھ گیا۔ ماؤں کو اپنے لاڈلوں کے بارے میں سُن گُن پہلے ہو جاتی ہے۔ اُن کے کانوں میں گھنٹیاں پہلے بجنا شروع ہوتی ہیں لیکن وہ طرح دے جاتی ہیں البتہ جب مرنے مارنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر سماج کا سہارا لیا جاتا ہے۔ سماج کے بھی کیا کہنے کہ جب تک وہ ظالم ہونے کا ثبوت نہ دے' کوئی اُسے ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔

ایک دوسرے کو خط پتر لکھتے' ایک دوسرے کے شہروں کا طواف کرتے' ریستورانوں کا طواف کرتے اور مختلف پارکوں کی خاک چھانتے اور نرم اوس میں بھیگی گھاس پر کروٹیں بدلتے بدلتے جب خاصا عرصہ گُزر گیا تو عارفہ بے چین ہونے لگی۔ جانے کیوں عورتوں کی جبلت کے عین مطابق اُس کی چھٹی حِس جیسے اُسے خبردار کر رہی تھی کہ بی بی' معاملہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے یا وہ سورج بس طلوع ہونے ہی والا ہے جب اُس کے سارے سپنے دھواں ہو جائیں گے۔ لیکن جانے کیوں شاہد پر اُسے بے پناہ اعتماد تھا' اعتماد تھا کہ وہ اُسے دھوکا نہیں دے گا۔۔ دوسری طرف شاہد اُس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کشتی کو دوسرے کنارے تک کیسے لے جائے۔ اُس کے گھر والے اُس کی بات شاید مان بھی لیتے لیکن اُنہیں اِس کتھا میں شامل کیسے کیا جائے' بس یہی ایک گُر اُسے نہیں آتا تھا۔

ہوا وہی' جس کا اُسے ڈر تھا بلکہ ایسے معاملوں میں عام طور پر ہوا بھی وہی کرتا ہے جس کا ڈر ہوتا ہے۔ عارفہ نے ایک نہیں متعدد بار اُس سے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے بات کر کے تو دیکھے لیکن ہمت تو شاہد کو کرنا تھی۔ سو وہ ٹالتا رہا۔ پھر ایک شام وہ دفتر سے فارغ ہو کر گھر کیا گیا' یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ازلی دشمن کے گھر میں گھُس آیا ہے۔ سارے بھائی بہن اور ماں اتنے سہمے ہوئے تھے کہ آپس میں بات بھی کرتے تو سرگوشیوں میں۔ اُس نے اُن سے پوچھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ڈر کے مارے کوئی بھی زبان ہلانا تو رہا ایک طرف منہ کھولنے کو بھی تیار نہ تھا، وہ پوچھنے کو در و دیوار سے بھی تیار تھا لیکن دیواروں کے تو کان ہوا کرتے ہیں' زبانیں نہیں۔ اتنے میں عقبی کمرے میں کسی نے توپ داغی۔

''شاہد' یہاں آؤ'' اُس نے گھر والوں میں سے ہر کسی کے چہرے پر نظریں ڈال کر پوچھ لیا' بات کیا ہے' جب جواب نہ ملا تو داغی گئی توپ کا دھواں نگلنے چل پڑا۔

''یہ عارفہ کون ہے؟'' ایک تو زمانے نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ بڑے جب عشق یا ہیروئن کے بارے میں استفسار کریں تو ترت ہی اُنہیں

جواب بھی دیا جا سکتا۔ دوسرے جواب یوں بھی نہیں بن پاتا کہ جس بات کو اتنا چھُپا کر رکھا گیا تھا' وہ سب کو گولی ماریئے' شیر پر ہی کیسے عیاں ہوگئی۔ بھول تو سبھی کرتے ہیں لیکن شاہد کو رازداری کا کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا۔ وہ شیر کے سامنے چُپ چاپ شکار ہونے کے لئے کھڑا رہا۔ شکار پر سکتہ طاری ہوتے دیکھ کر شیر نے گرج کر شکار کو دبوچ لیا۔

''میں نے پوچھا ہے' یہ عارفہ کون ہے؟'' لبوں پر لگی مہر جب پھر بھی نہ ٹوٹی تو۔۔

''میرے سامنے تو بھیگی بلی بن کر کھڑے ہو جاتے ہو اور اُس کے ساتھ۔۔ اُس کے ساتھ عہد و پیمان۔۔ لمبے چوڑے وعدے۔۔ میں کہتا ہوں' تم۔۔ تم' یہ کیوں نہیں سوچتے' یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے' دو چار روز کی دل لگی نہیں۔'' شیر نے شکار کو آخری جھٹکے دیئے۔ ''سنو! اگر تم اس حرکت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو' میں۔۔ میں۔۔'' یہ دیکھ کر کہ شکار آخری سانس لے رہا ہے' شیر نے مزید بولنا یا دھمکانا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا نہ ہو' اُس کی جان واقعی نکل جائے۔

''اُسے تو میں دیکھ لوں گا۔ عشق کا بھوت بی بی کے سر سے غائب نہ کیا تو۔۔'' شاہد کچھار سے باہر تو آ گیا لیکن اِس آخری للکار نے جیسے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آخری سانسوں میں بھی ہوش کے ناخن اُبھر آئے۔۔

''ہم دونوں بس۔۔ شادی کرنا چاہتے ہیں اور۔۔'' شیر کو حیرت ہوئی' ابھی سانس چل رہے ہیں۔

''کیا کہا' شادی۔' ہونہہ۔ میں تمہیں یا اُسے کسی قابل چھوڑوں گا تو یہ حرکت کرو گے نا۔'' شیر کا تو ایک تھپڑ ہی کافی ہوا کرتا ہے اور یہاں تو وہ اُسے بھنبھوڑے جا رہا تھا۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی' اُلجھنا بیکار ہے' بس سر جھکا کر سب کچھ سنتا رہا۔۔

کمرے سے پھر گھر سے پھر گلی سے باہر نکل کر اُسے جیسے دنیا کی ہر شے عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ ہر کسی سے ایک نہیں بیسیوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن جواب کون دیتا' کہاں سے آتا۔۔ کئی جانی پہچانی جگہوں پر گھومنے' ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ پارک میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ گو اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا لیکن یہی سوچے جا رہا تھا کہ شیر کا سامنا تو وہ کر آیا تھا' عارفہ کا سامنا کیوں کر کرے گا' اُس سے کہے گا تو کیا۔ اور اگر اُس نے یہی پوچھ لیا' کہہ ڈالا کہ وہ بار بار ملنے کا تقاضا' شادی پر اِصرار اُس کی طرف سے ہوتا رہا تھا تو وہ کیا جواب دے گا؟ شرمندگی اور خجالت تو اِس بات کی ہو رہی تھی کہ وہ عارفہ کا سامنا کر کے اُسے یہی کہے گا کہ اُن کا تعلق بھی' عارفہ کے بار بار خبردار کرنے کے باوجود ایک کتابی اور عامیانہ سا قصہ ہی بن گیا ہے۔

کئی دنوں تک خاموش اور غائب رہنے کے باوجود اُسے نجات' فرار کی ایک راہ یہ نظر آئی کہ وہ یہ شہر ہی چھوڑ دے۔۔ چلئے' اُس نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا لیکن اگر اس کا تعلق چھُپا نہیں رہ سکا تھا تو بھلا ٹھکانہ تلاش کرنا کون سا مشکل تھا۔ ایک شام اُسے فون آیا' رات کے دس بجے کی گاڑی سے عارفہ اُسے سے ملنے کے لئے آ رہی ہے لیکن اُس نے کس دلیری سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ صرف اسٹیشن پر ہی اُس سے ملاقات کرے گی اور دو گھنٹے بعد دوسری گاڑی سے واپس چلی جائے گی۔ دیر تک وہ طے ہی نہیں کر پایا کہ اسٹیشن پر جائے یا نہیں' جائے تو عارفہ سے ملے یا نہیں۔ نہیں جائے گا تو کیا ہوگا' کچھ بھی تو نہیں۔

اُس رات خدشہ تو یہی تھا کہ بادل خوب برسیں گے لیکن ایک بوند بھی نہیں گری۔ آثار تھے کہ سیلاب آئے گا اور سب کچھ بہا کر لے جائے گا' شیر رہے گا نہ شیر کی دھاڑ۔۔ لیکن مسافروں کے ہجوم کے باوجود کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ پلیٹ فارم کے بنچ پر اندھیرا اُترتے ہی جا کر بیٹھ گیا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے بار بار گاڑی کی آنے والی سمت کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا' وہ جواب کیا دے گا؟ کیا مرد کے لئے ہمیشہ ہی عورت کو دھوکا دینا اِتنا آسان رہا ہے کہ چاہا تو دو بول بول کر اپنا لیا' یا دو بول بول کر اُسے فارغ کر دیا یا پھر دو بولوں سے ہی اُس سے پیچھا چھڑا لیا؟ اُس کا خیال سوچیں شیر کی طرف پلٹ گئیں' شیر کا کام ہی شکار کرنا ہوتا ہے لیکن شکار کا بھی تو ایک فرض بنتا ہے' اپنے آپ کو شیر کا شکار ہونے سے بچائے' دو چار قلانچیں ہی بھرے' آنکھیں لال سُرخ کر کے سر گرائے اور سینگ سامنے کر دے لیکن وہ تو۔۔

شور سنائی دیا تو وہ اپنی سوچوں سے اُبھرا' گاڑی اُوپ لائن پر رُکنے ہی والی تھی۔ اُس کی نظریں تیسرے ڈبے کے دروازے پر جیسے جم گئیں' عارفہ نے ایک ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا اور دوسرے میں شاید کوئی کتاب تھی۔ جھکتے ہوئے وہ اُتری اور اُتر کر اُسی کی جانب ہو لی۔ شاہد اُسے دیکھ کر جانے کیوں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ عارفہ کی چال عجیب سی تھی' اُس میں شوق تھا' کچھ پا لینے کی خواہش لیکن ساتھ ہی جو کچھ پایا تھا' اُسے کھو دینے کا ڈر خوف' وہ ایک جگہ کھڑا اُسے اپنی طرف آتا ہوا دیکھتا رہا۔ حالانکہ پہلے تو وہی آگے بڑھتا' بلکہ یوں لپکتا جیسے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے گا۔

گاڑی کی منزل کوئی اور تھی' سرکتے ہوئے پلیٹ فارم سے نکل گئی تو اِکا دُکا مسافر جو گاڑی سے اُترے تھے وہ تو کب کے جا چکے تھے۔ اب پلیٹ فارم ازلی خاموشی اوڑھ چکا تھا۔ دونوں کو بنچ پر بیٹھے جانے کتنی دیر گزر گئی بلکہ یوں کہیئے' دونوں کو چُپ سا دھے ایک صدی بیت گئی۔ عارفہ پلیٹ فارم کے پختہ فرش پر سے جب کچھ بھی تلاش نہ کر پائی تو شاہد کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''کیسے ہو!'' شاہد نے گردن گھما کر اُس کے چہرے پر جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ چلو چُپ کا روزہ تو ٹوٹا۔

''میں۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم۔۔ تم کیسی ہو؟''

''تمہارا خط ملنے تک تو میں بھی ٹھیک ہی تھی لیکن۔۔'' شاہد نے محسوس کیا' وہ آگے بولنا بھی چاہے تو نہیں بول سکے گی' اُس کا گلا شدتِ جذبات سے رُندھ رہا تھا۔ اُس نے سوچا' بات کو طول دینے سے فائدہ' جو ہونا ہے' وہ تو ہو کر رہے گا' اِس لئے جو کہنا ہے' اُسے جلد کہہ دینا چاہئے۔ اتنی دیر خاموش بیٹھنے

اور عارفہ کے قرب نے شاہد کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔لیکن جب کچھ کہنے کے لئے اُس نے منہ کھولا تو حوصلہ زخمی غبارے میں بھری ہوا کی طرح غائب ہو گیا۔اُسے پھر سے اپنے آپ کو اپنے حواس کی گٹھڑی کو باندھنا پڑا۔

''دیکھو عارفہ' جو میں کہنے والا ہوں۔۔مجھے یقین ہے تم اُسے سمجھنے کی کوشش کرو گی۔ہم نے زندگی ایک ساتھ گُزارنے کا اِرادہ کیا تھا' اِرادہ ہی کیا وعدہ بھی کیا تھا' شاید دوسروں کی طرح قسمیں بھی کھائی تھیں لیکن اِس خواہش میں یہ بھول گئے کہ ہم اور ہماری زندگیوں کے ساتھ دوسرے لوگ بھی وابستہ ہیں۔ہماری اِس کوشش کی وجہ سے ممکن ہے' کسی کی دل شکنی ہو یا کوئی ناخوش ہو یا۔۔۔دیکھو نا۔۔یہ ٹھیک ہے کہ زندگی ہماری اپنی ہے لیکن دوسروں کو بھی تو ناخوش نہیں کیا جا سکتا۔۔'' عارفہ چُپ چاپ بیٹھی اُس کی بے ربط گفتگو سنتی رہی' یہی تو وہ سوچ رہی تھی کہ جست بھی شاہد نے لگائی تھی' وہی اُسے زندگی ایک ساتھ بِتانے کے خواب دکھا چکا تھا اور اب جب کہ وہ بھی اِس دلدل میں دھنس چکی ہے یوں کہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اپنے آپ کو بچا نہیں پا رہی تو وہ کیوں بھاگ جانے کی ٹھانے ہوئے ہے۔عارفہ نے منہ کھولا تو اُس کے لہجے میں بھرپور افسردگی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''میں کسی بات کی وضاحت کے لئے تو تمہارے پاس آئی نہیں ہوں۔میرا مقصد تو تم سے ملنا تھا' آخری بار ہی کیوں نہ ہو۔اور صرف یہ جاننے کے لئے کہ آخر ہم کیوں نہیں اِکٹھے یہ سفر طے کر سکتے؟'' ہر عورت کی طرح عارفہ کے پاس بھی سوالات کا ایک انبار تھا لیکن اُسے اپنے لب سیئے رکھنا تھا۔بات منہ سے نکل جائے تو اُس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' منہ کے اندر ہی رہے تو۔۔۔ذہنی بھی چاہئے۔۔اُن کے عقب میں نصب لیمپ کی بجھی بجھی روشنی اِتنی گواہی ضرور دے رہی تھی کہ بنچ پر ایک سے زائد مسافر بیٹھے ہیں۔وہ چُپ ہیں' حرکت بھی نہیں کر رہے' کسی اور دیکھ بھی نہیں رہے۔بس بیٹھے ہیں۔ایک مسافر کی سوچ تھوڑی ہی دیر میں پیش آنے والے حادثے کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی اور دوسرا سایہ سوچے جا رہا ہے' وہ بات جو بگولے کی طرح اُس کے ذہن میں چکر کاٹ رہی ہے' منہ سے نکل گئی تو دوسرا کیا سوچے گا' یہی کہ اُس نے بھی وہی کیا جو بیشتر کرتے ہیں پھر۔۔۔لیکن یہ بات اُسے کہنی پڑے گی۔۔

''جانتے ہو' تمہارے بابا نے اپنے کسی دوست سے ہمارے ملنے جلنے کے بارے میں ذکر کیا تھا اور۔۔اتفاق سے وہ صاحب میرے بابا کو بھی جانتے ہیں۔اُنہوں نے جب میرے بابا سے تذکرہ کیا تو اُنہیں بہت برا لگا' لیکن اُنہوں نے مجھ سے کچھ کہا نہیں' ہاں! گھر کے ماحول میں جیسے زہر گھُل گیا۔ہر کوئی دوسرے سے بیزار دکھائی دیتا ہے۔'' شاہد چُپ تھا' کہے تو کیا کہے۔عارفہ کا دل اور اپنا بھرم رکھنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

''چلو' ہم۔۔کیا ہم آئندہ دوستوں کی طرح بھی نہیں رہ سکتے؟'' عارفہ جانے کیوں تنکوں کا سہارا لے رہی تھی۔

''نہیں عارفہ' ایسا ممکن نہیں ہے۔لوگ ہماری دوستی کو کوئی اور ہی معنی دیں گے اور یہ مجھے منظور نہیں۔میں اگر یہ کہوں کہ آئندہ ہمیں کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے تو۔۔۔مجھے معاف کر دو گی نا۔۔؟'' عارفہ کے پاس اب بھی کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن۔۔۔اُسے واپس لے جانے والی گاڑی وارنر لائن پر آ کر رفتار کم کئے جا رہی تھی۔عارفہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے میرے سوال کا جواب اب تک نہیں ملا۔میں نے پوچھا تھا' آخر ہم کیوں نہیں۔۔۔''

''دیکھو عارفہ۔میرے بڑے یہ تعلق یہ رشتہ ماننے کو تیار نہیں۔اگر وہ نہیں مانتے تو۔۔ہمیں بھی اِصرار نہیں کرنا چاہئے۔ہم مانیں یا نہ مانیں' اُن کی ایک حیثیت' ایک مقام تو ہے۔ممکن ہے اُنہیں ناخوش کر کے ہم بھی خوش نہ رہ سکیں۔زندہ رہنے کو ہم زندہ تو رہ لیں گے لیکن۔۔زندگی وہی ہے جو دوسروں کے لئے ہو جو۔۔'' گاڑی نے روانگی کے لئے وِسل دی تو عارفہ نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا' کہا کچھ نہیں اور اپنے سامنے کھڑے ڈبے میں سوار ہو گئی۔اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔کیا دیکھنا اور کیا کہنا۔۔۔وہ دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑا دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہوتی گاڑی کو دیکھتا رہا۔تھوڑی ہی دیر پلیٹ فارم پر مردنی پھر لوٹ آئی تو آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔۔اُس نے عارفہ کا دل توڑا تو ہے' کیا وہ اُس کے بغیر خوش رہ سکے گا؟ اُسے یقین تھا' عارفہ گھر پہنچنے کا بھی اِنتظار نہیں کرے گی' راستے میں ہی آنسوؤں کا ایک سیلاب بہا دے گی' اپنے آپ کو جیسے سولی پر لٹکا محسوس کرتی رہے گی اور وہ یہاں چُپ چاپ کھیل کے ڈراپ سین کا انتظار کرتا رہے گا' پر۔۔۔۔۔

عارفہ کو اُس نے بلایا نہیں تھا' وہ تو خود ہی آئی تھی صرف یہ جاننے کے لئے کہ وہ اُس کا کیوں نہیں ہو سکتا یا یہ تعلق کیوں نہیں قائم رہ سکتا۔اُس نے وضاحت تو کر دی تھی' نہیں جانتا تھا' عارفہ پر کیا بیت گئی لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ اُس کے لئے جیسے ایک قیامت آ کر گُزر گئی تھی۔کام میں اُس کا جی نہیں لگتا تھا' دوستوں سے وہ ملتا نہیں تھا۔وہ اِس گتھی کو سلجھانے بیٹھتا تھا تو جیسے کسی بھنور کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔اُس نے عورت کے سبھی روپ' سبھی رشتے دیکھے تھے لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے' بہن' بیٹی سبھی اپنی اپنی جگہ اہم اور پوتر ہیں لیکن عورت تو کوئی اور ہی جنس ہوتی ہے کہ اُس کا سامنا جب پہلی بار ہوتا ہے تو وہ سوچوں' دل و دماغ بلکہ پورے وجود پر آکاش بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔یہی اُس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔بڑوں نے ضِد کر کے اپنی بات منوا تو لی تھی لیکن۔۔۔

دو کم ہمتے' کم حیثیت والے' کم ذرائع والے' بے بنیاد اور مفروضوں پر دشمن جب آپس میں لڑتے ہیں تو انجام ایک سا ہی ہوتا ہے۔نہ کسی کی ہار نہ کسی کی جیت۔دونو جوانوں' اُن میں سے ایک خاتون بھی ہو' کا باہمی تعلق ایک جنگ ہی تو ہوتا ہے جس میں مل گئے تو ہار جیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہی عزم لے کر تو وہ اِس سفر پر روانہ ہوئے تھے اور نہ ملے تو بھی تان وہیں پہ آ کر ٹوٹتی ہے۔دونوں اطراف کے بڑے بوڑھوں' بہن بھائیوں' جان پہچان والوں نے

اُنہیں حالات کا مقابلہ کرنے کے اہل بنانے کے لئے کون کون سے جتن نہیں کئے ہوں گے۔ کیسے کیسے وہ اُن کے خود ساختہ عذابوں کا حصہ نہیں بنے ہوں گے' یہ تو وہی جانتے تھے' لیکن دونوں طرف سوچ ایک ہی کارفرما تھی' اِنہیں شادی کے بندھن میں قبل اِس کے کہ کوئی رسہ تُڑانے کی سنجیدہ کوشش کرے جلد باندھ دینا چاہئے۔ عارفہ کے دل میں شاید دیر تک اُمید کی شمع روشن رہی۔۔ شاید' شاہد کو یہ خیال ستائے کہ اُس نے کیا کیا ہے اور وہ تلافی پر آمادہ ہو جائے' اُسے قائل نہیں کیا جاسکا البتہ شاہد کے خیر خواہوں نے قدم بڑھانے میں دیر نہیں کی۔

شاہد کو عارفہ کی یادیں' اُس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے' لکھے گئے خطوط وغیرہ ایک مدت تک ستاتے رہے' خیال تھا کہ بار بار اُسی طرف لوٹ جاتا تھا' کہیں اُس نے عارفہ کے ساتھ زیادتی تو نہیں کی' پھر یہ فکر دامن پکڑ لیتی' وہ کہیں اپنی بیوی کی حق تلفی تو نہیں کر رہا۔ وسوسے ہی تو تھے جو مدتوں اُسے ڈستے رہے ایک شام جب ایک دوست نے فون پر اُسے اِطلاع دی کہ اُس شام عارفہ اپنے دولہا کے ساتھ رُخصت ہو جائے گی تو اُسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ یہی محسوس کر رہا تھا جیسے قیامت ایک بار پھر آ کر گذر گئی ہے۔ جیسے اُس کے چاروں اور آگ ہے کہ بھڑک اُٹھی ہے اور اُس کے شعلے بلند سے بلند تر ہوئے جا رہے ہیں۔۔ عارفہ نے اتنی عقل مندی ضرور کی کہ جب وہ شاہد سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تو اُس نے جیسے اُس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ دونوں اطراف یہ شعلے جیسے دھیرے دھیرے کم ہونے لگے' آگ سرد ہونے لگی اور زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی لیکن یہ دیکھنے کی کسی نے بھی کوشش نہ کی کہ کتنی چنگاریاں راکھ کے نیچے دب گئی ہیں۔ ہاں! یاد تو کوئی نہیں چھین سکتا تھا اور وہی اب اُن کی میراث تھی۔

برسوں سے وہ صرف اِتنا ہی جانتے تھے کہ اپنے اپنے کھونٹے پر بندھے چکر کاٹ رہے ہیں۔ ایک مدت بعد شاہد کو ایک دوست نے بتایا تھا کہ عارفہ کا میاں ملک چھوڑ کر باہر کی دنیا میں گُم ہو گیا ہے۔ عارفہ اور اُس کے بچے بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ برسوں بعد اِس اِطلاع سے جانے کیوں شاہد کا دِل دھڑکا اور اِس زور سے دھڑکا کہ اُسے بیٹھ کر ایک نہیں کئی لمبے لمبے سانس لینے پڑے۔ جانے راکھ پر کس نے پھونکیں یوں ماریں کہ چنگاریاں دہک اُٹھیں۔ دل کے کسی کونے میں چھپی ایک آس تھی کہ ایک نہ ایک دن عارفہ سے ملاقات ہو ہی جائے گی' کہتے ہیں' پرانے تعلق اور پرانی شراب میں بلا کا مزہ اور نشہ ہوتا ہے' وہ بھی اِسی نشے کو چکھنے کی آس لگائے بیٹھا تھا لیکن اِس اِطلاع نے تو جیسے اُس کے جسم سے جان ہی نکال لی تھی۔ رات بستر پر دیر تک کروٹیں بدلتے ہوئے اُسے یہی سوال پریشان کرتا رہا' عارفہ کے بارے میں سوچ سوچ کر کہیں وہ کسی کے حقوق پر ڈاکہ تو نہیں ڈال رہا۔ وہ اب کسی اور کی امانت ہے تو۔۔ اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ سوچے اور صرف اُسی کے بارے میں سوچتا رہے؟ لیکن عارفہ کے بارے میں جاننے کا خیال جیسے سانسوں کی طرح ہمیشہ اُس کے ساتھ رہا۔

اُس اسٹور پر عارفہ کو اچانک اپنے سامنے پا کر شاہد کو حیرت تو ہوئی لیکن۔۔ وہ اُسے پُکارنے ہی لگا تھا لیکن پھر رُک گیا۔ باہر لاکھ تلاش کرنے کے باوجود وہ اُسے دِکھائی نہ دی تو وہ پریشان نہیں ہوا' آج نہیں تو کل وہ اُسے تلاش کر ہی لے گا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے جیسے کسی نے سرگوشی کی۔ ''کیوں' تم اُسے کیوں تلاش کرو گے؟ مل بھی گئی تو۔۔۔؟'' اُس نے گاڑی کے اندر سر گھُما کر اِدھر اُدھر دیکھ لیا' کہیں وہ اُس کی گاڑی میں تو نہیں آ چھپی پھر اپنی بے وقوفی پر وہ خود ہی ہنس دیا۔۔ جب سوچوں نے اُسے چاروں اور سے گھیر لیا تو اُس نے گاڑی سڑک سے تھوڑا ہٹ کر روک لی اور انجن بند کر کے اسٹیرنگ سے ہاتھ ہٹا کر سوچا۔۔ ''کون بتائے' وہ یہیں اُتھ آئی ہے یا۔'' اِس سے آگے سوچنے پر اُس کا دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر ایک پرانی یاد نے اُسے جھنجھوڑا اور وہ گھر کی طرف ہو لیا۔

اُسے یاد تھا' آخری بار وہ اسٹیشن پر اُسے غور سے دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ ایک تو اسٹیشن پر روشنی ہی بڑی مدھم تھی' دوسرے وہ جیسے اپنا آپ اُس سے چھُپانے کی کوشش کر رہی تھی' شاید ایک آدھ بار ہی سر اُٹھا کر اُس نے شاہد کی طرف دیکھا تھا اور بس۔۔ وہ چلی گئی تو شاہد کو اُس کا پرانا سراپا ہی یاد تھا اور اب جو وہ اچانک اُس کے سامنے آئی تو شاہد یہ دیکھ کر چونکا کہ ایک نہیں کئی تبدیلیوں نے اُس کے ڈھانچے ہی کو بدل دیا تھا' کئی برس جو بیت گئے تھے لیکن اُس کے بنیادی خدوخال وہی تھے۔ البتہ غیر ممالک میں قیام' بچوں کی آمد اور شادی شدہ اور فکروں سے آزاد زندگی نے اُس کے خدوخال کو زیادہ نکھار دیا تھا جب کہ شاہد کے چہرے پر وقت نے کہیں کہیں طبع آزمائی ضرور کی تھی۔

کھرنڈ زخم بھرنے کے بعد ہی اُترا کرتے ہیں اور اِس عمل میں عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے لیکن اگر کھرنڈ خود اُتار دیئے جائیں اور زخم بھریں نہ ہوں تو درد کے ساتھ ساتھ جلن بھی تنگ کرتی ہے' یہی اُس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ دفتر سے نکلتا تو گاڑی میں بغیر کسی مقصد کے دور دور کی خاک چھانتا رہتا۔ چھٹی کے دن کوشش کرتا' شہر کی سبھی سڑکیں چھان مارے لیکن یہ گھومنا اور تلاش کرنا تو جیسے سعی لا حاصل تھا کہ جب تک کوئی سر پیر کوئی اشارہ کوئی سراغ کچھ نہ ہو' کیسے اِتنے بڑے شہر میں کسی کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔۔ کبھی کبھی وہ اِس خلش اور تلاش سے تنگ آ کر جیسے پچھتانے لگتا' اُس نے کیوں اِس بھولی بسری داستان کو ایک بار پھر دہرانا شروع کر دیا ہے' لیکن پھر کہیں سے آواز آتی' بھلے آدمی! ایسی باتوں پر بس بھی کسے ہوتا ہے' تم لاکھ بھُلانا چاہو' بھُلا سکتے ہو؟

پھر وہی ہوا جو ایسے معاملات میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ وہ بھولا تو نہیں لیکن تلاش سے اُکتا کر جیسے اُس کی نگاہوں نے گھومنا' سامنے سے بھی آگے دیکھنا بند کر دیا۔ وہ تھوڑی بہت خریداری کے بعد اسٹور سے باہر نکلا تو اُسے پتہ چلا کہ باہر تو تیز بارش برس رہی ہے۔ وہ بھاگ کر بھی اپنی گاڑی تک جاتا ہے تو بھیگنے کے علاوہ یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں پھسل کے گھٹنا یا کہنی نہ تُڑوا بیٹھے۔ خیریت اِسی میں نظر آئی کہ بھاگ کر اسٹور کے بغل میں واقع ریستوراں میں پناہ لے لے۔ اندر

داخل ہوتے ہی میٹریس نے جیسے اُس کے پاؤں جکڑ لئے۔اُس کی چھٹی حس نے اُس کی رہنمائی کی تھی یا کوئی دوسری طاقت اُسے اِس طرف کھینچ لائی تھی' یہ فیصلہ ہو سکتا تھا نہ اُس کی گنجائش تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ سامنے دوسری رو کی آخری میز پر اُسے عارفہ بیٹھی دِکھائی دے گئی لیکن میز کے گرد کوئی بھی کُرسی خالی نہ تھی۔دو جوان لڑکیاں اور ایک لڑکا عارفہ کا ساتھ دے رہے تھے۔شاہد نے دو تین قدم اُٹھائے' پھر جھجک گیا' جانے اُس کے ساتھ کون ہیں؟ اُسے نزدیک ہی ایک میز خالی دکھائی دی تو اُس نے لپک کر نشست سنبھال لی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عارفہ کی میز سے نوجوانوں کا گروہ اُٹھا اور شاہد کی طرف توجہ دیئے بغیر باہر کی طرف ہولیا۔شاہد نے پلٹ کر اُنہیں جاتے ہوئے دیکھا' اور دیکھتا رہا یہ یقین کر لینے کے لئے کہ وہ باہر نکل گئے ہیں' پھر اُٹھتے ہوئے گھوما' لیکن۔۔عارفہ اِتنی دیر میں اُسی کی میز پر آ کر بیٹھ بھی چکی تھی۔وہ بیٹھا نہیں' کُرسی میں گِرا۔اُسے ایک بار پھر محسوس ہوا' اُس کا دل دھڑک کر حلق میں اٹک گیا ہے۔وہ اُسے نیچے اپنی کوٹھڑی میں دھکیلنا چاہتا ہے لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا۔کان ہی نہیں اُس کے گال بھی دہک اُٹھے۔۔اِس بار عارفہ نے پہل کی۔

''کیسے ہو شاہد؟ مجھے تو لگتا ہے' اِتنے برس گزر گئے' تم میں کوئی فرق نہیں آیا۔۔'' اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے' کیا کہے۔بیٹھے بیٹھے کئی لمحے گزر گئے اور گزرتے چلے گئے۔وہ الفاظ کے چناؤ میں ہی اُلجھتا رہا۔اِس کے باوجود اُسے لگا' عارفہ کے لہجے میں زیادہ اعتماد' زیادہ بھروسہ اور زیادہ اپنا پن ہے۔یہ وہ عارفہ نہیں جو کبھی اپنا سب کچھ لُٹا کر وہاں سے رُخصت ہوئی تھی۔عارفہ نے جیسے اُس کی مشکل پکڑ لی' ٹھہرے ٹھہرے بھرپور لہجے میں بولی۔

''مجھے پتہ ہے' جس دن سے تم نے مجھے اسٹور میں دیکھا ہے' تم میری تلاش میں سرگرداں ہو۔لیکن شاہد۔۔'' شاہد بول اُٹھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ۔۔تم کیسی ہو اور۔''

''میں ٹھیک ہوں۔۔مجھے کیا ہونا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ میں تمہیں اُسی دن سے تلاش کر رہا ہوں۔شاید کامیاب بھی ہو جاتا' اگر کوئی سِرا میرے ہاتھ آ جاتا۔لیکن۔۔'' عارفہ نے اُسے مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی۔

''ارے' تم تو وہی پرانے شاہد ہو۔نتائج پہلے سے طے کر لینے والا شاہد اور اپنے آپ پر بھی بھروسہ نہ کرنے والا شاہد۔اگر اپنے آپ میں جھانک کر دیکھتے تو میں تمہیں یہیں کہیں آس پاس دِکھائی دے جاتی۔''

''یہ بچیاں جو تمہارے پاس سے اُٹھ کر گئی ہیں' وہ۔۔''

''میری بچیاں اور میرا چھوٹا بیٹا۔۔سب سے بڑا بیٹا ابھی واپس نہیں آیا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی آئے گا یا ہو سکتا ہے اُسے وہیں کوئی پسند آ جائے تو۔۔ماں کے پاس آ کر کیا کرے گا وہ۔'' شاہد سوچ رہا تھا' کبھی اسٹیشن پر بیٹھے وہ گُنگ تھی اور آج وہ اُس کے سامنے بیٹھا گُنگ ہے۔کبھی وہ بولے جا رہا تھا' آج وہ بول رہی ہے۔

''تمہیں تو علم ہو گا' میں شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی۔شوہر کے پاس تعلیم تھی اور تجربہ بھی' ملازمت اعلیٰ ملی' مزاج کا بھی وہ بُرا نہیں تھا' بس اُسے شراکت پسند نہیں تھی۔آنے کو تین نہیں چار بچے بھی آ گئے لیکن۔۔اُس سے برداشت نہیں ہو سکا کہ اُس کے بچوں کی ماں پہلے کسی سے وابستہ رہی ہو۔۔طعنہ بازی وہ نہیں کرتا تھا لیکن اُس کی حرکات اور اِشارے پُغلی کھاتے تھے کہ اُسے کوئی بات اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔میں اکثر سوچتی ہوں' اُسے شادی سے پہلے اگر پتہ نہیں تھا تو میں نے تو اُس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا پھر۔۔وہ جان بوجھ کر کیوں اِس سانچے میں گُودا۔۔'' شاہد سُن رہا تھا' بس سُنے جا رہا تھا۔

''میں نے سوچا' میں ہی اُسے اِس عذاب سے نجات دلاؤں۔پتہ نہیں' میرا فیصلہ درست تھا یا نہیں لیکن مجھے اِطمینان یوں ہوا کہ جوں ہی میں نے ایک شام اُس سے یہ کہا کہ مجھے فارِغ کر دے تو اُس نے پلٹ کر ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں اِتنی بڑی بات کیسے اور کیوں کہہ رہی ہوں بلکہ اُس نے فوراً ہی ایسا رویہ اپنا لیا جیسے میرا مختصر جملہ اُسے نئی زندگی کی نوید دے رہا ہو۔مرد بھی عجیب جانور ہے' عورت سے بڑی سے بڑی قربانی کی توقع رکھتا ہے لیکن خود بیوی کا کسی دوسرے سے معمولی سا تعلق بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''بچوں سے پوچھ لو' وہ تمہارے ساتھ جانا چاہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔۔سو بچے میرے ساتھ آ تو گئے لیکن اُنہیں آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن کے والدین کے درمیان اصل جھگڑا کیا ہے۔۔'' پھر وہ رُکی' مُسکرائی اور بولی۔۔''میں نے اُنہیں بھیج دیا ہے' کہیں وہ اصل جھگڑے کو میرے اِتنا نزدیک نہ دیکھ لیں۔۔'' شاہد نے اِرد گرد دیکھا کہیں کوئی اُن کی باتیں تو نہیں سُن رہا۔

''تو وہ بھلا آدمی اب کہاں ہے؟'' عارفہ کے لہجے میں کتنا ٹھہراؤ تھا۔

''اُسے دیس دیس گھومنے کا چسکا تھا' ہو گا کہیں نہ کہیں۔''

''اُس نے تم سے پھر رابطہ نہیں کیا۔؟'' عارفہ نے پشت کُرسی سے ٹِکا لی۔

''نہیں۔کرتا بھی کیوں۔۔ہاں' بچوں سے وہ بات چیت کرتا رہتا ہے' اُن کی ضروریات پوری کرتا ہے اور بس۔۔تم سناؤ۔مجھے کسی نے بتایا تھا' تم مزے میں ہو۔۔'' شاہد کے لبوں پر مسکراہٹ یوں پھیلی جیسے دِل کا حال لبوں پر بکھیرنا ہی مقصود ہو۔

''میں۔۔میں۔۔میں بھی مزے میں ہوں۔تم تو جانتی ہو' میں نے تمہاری شادی سے پہلے' بہت پہلے شادی کر لی تھی۔پسند میری نہیں' میرے والدین کی تھی۔۔بچے البتہ میری پسند کے ہی ہیں۔لیکن عارفہ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے' میں تمہارے ساتھ انصاف کر سکا ہوں نہ اپنے بچوں کی ماں کے

ساتھ۔یہ بھی کیا زندگی ہے کہ میں لُٹاؤں تو سب کچھ بچوں پر اور ناچوں تو بیوی کے اِشاروں پر لیکن فرصت کے ایک آدھ لمحے میں بھی سوچوں تو کسی اور کے بارے میں۔۔'' عارفہ نے چُپ رہنا ہی بہتر جانا کہ وہ جو لفظ بھی کہے گی' وہ اُس کے جذبات کی عکاسی کرے گا۔۔

بیٹھے بیٹھے دیر ہوگئی۔دونوں محسوس کر رہے تھے' باتیں اوپری باتیں ہی ہو رہی ہیں' دِل کی اندر کی بات کوئی نہیں کر رہا۔عارفہ کا انداز بیحد محتاط تھا۔اُس نے ہی اِس خاموشی کو توڑا۔

''میں اب چلتی ہوں' بچے میرے لئے فکر مند ہو رہے ہوں گے۔'' وہ اُٹھنے لگی تو شاہد ہکلا اُٹھا۔

''عارفہ۔۔میں اِس بحث میں نہیں پڑتا' ہم ایک نہیں ہو سکے تو اِس میں قصور کس کا تھا لیکن میں اِتنا تقاضا تو کر ہی سکتا ہوں کہ ہم دوست تو ہمیشہ سے ہی تھے اگر آئندہ بھی ملتے رہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔'' شاہد کو یاد تھا' کبھی عارفہ نے دوستی کے تعلق کو قائم رکھنے کی التجا کی تھی جسے شاہد نے ٹھکرا دیا تھا' دلیل بھی دی تھی' جواز بھی پیش کیا تھا اور آج۔۔۔۔اتنی دیر سے وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے' پہلی بار عارفہ کے چہرے پر ایک نہیں کئی رنگ آئے اور وہ جلدی سے اُٹھتے ہوئے کُرسی پیچھے دھکیل کر سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں شاہد۔آج کے بعد یہ ممکن نہیں ہوگا۔۔''

''کیوں نہیں'' شاہد کے لہجے میں جیسے اِلتجا تھی۔۔''کیوں نہیں عارفہ۔آخر ہم کیوں نہیں مل سکتے' دوستوں کی طرح' صرف دوستوں کی طرح۔۔'' عارفہ نے ریستوراں کا بل ادا کیا' اپنا پرس اُٹھایا' شاہد کی طرف دیکھا' یوں جیسے وہ اُسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔پل بھر میں سوچا' کبھی اُس نے ایسے ہی تعلق کی بھیک مانگی تھی' جسے شاہد نے ٹھکرا دیا تھا اور آج وہ ویسی ہی بھیک مانگ رہا تھا لیکن وہ۔۔۔۔اور بولی۔

''شاہد۔کبھی میں اپنی زندگی تمہیں بھینٹ کرنے کو تیار تھی لیکن۔۔تم اِس بھینٹ کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے کہ۔۔۔تمہارے بڑے مجھے قبولنے کو تیار نہ تھے اور تم نے بھی تو بُزدِلی کا مظاہرہ کیا تھا۔۔آج۔۔۔تم خود سوچو' میرے بچے جب پوچھیں گے تو میں اُنہیں کیا جواب دوں گی کہ تم کون ہو اور ہمارا تعلق کیا ہے۔۔آج میں چاہنے کے باوجود قدم بڑھانے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہی۔تمہارا اپنا کہا ہوا تمہیں ضرور یاد ہوگا۔اپنے لئے تو سبھی جی لیتے ہیں لیکن۔۔۔دوسروں کے لئے بہت کم زندگی کرنے کی ہمت کر لیتے ہیں۔۔'' جاتے جاتے وہ رُکی اور پلٹ کر کہنے لگی۔

''اپنا خیال رکھنا۔۔'' شاہد وہیں کھڑا چُپ چاپ اُسے جاتا دیکھتا رہا' بس دیکھتا اور سوچتا رہ گیا۔زخم پر کھرنڈ آجائے تو ضروری نہیں' زخم بھر بھی رہا ہو' کبھی کبھی زخم بھرتا ہی نہیں اور زخم نہ بھرے تو کھرنڈ آتو جاتا ہے لیکن کچا ہی رہتا ہے' تھوڑی سی چوٹ پہنچے تو پھر سے رِسنے لگ جاتا ہے۔

○

''تماشائے اہلِ کرم''

مستقبل کے حوالے سے امریکہ اپنا جو منصوبہ روبہ عمل لانا چاہتا ہے اس کے تحت ایران کو ایک چھوٹی شیعہ ریاست اور عراق کو بڑی شیعہ ریاست میں تبدیل کرنا ہے۔عراق کو سعودی عرب کا تیل سے اُبلتا ہوا صوبہ الحصہ دینا اس منصوبے کا اہم حصہ ہے۔کوشش یہ ہے کہ بحرین کو بھی اس کا حصہ بنا دیا جائے۔ منصوبے کے تحت اس کے بدلے میں سعودی عرب کو قطر کی ریاست تحفے میں دے دی جائے۔ایران کو مزید سکوڑنے کے لیے سیستان اور پاکستان کے بلوچستان کو ملا کر ایک نیا ملک بلوچستان کے نام سے بنایا جائے۔ایران کو مزید ترگھٹانے کے لیے کُرد ریاست کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ پاکستان اور ایران امریکہ کے راستے میں مزاحم ہو رہے ہیں۔پاکستان اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہا ہے جبکہ ایران امریکہ کی مخالفت کر رہا ہے۔کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ امریکہ ایران کے سلسلے میں اپنی وہ سبکی نہیں بھولا ہے جو اس نے ستّر کے عشرے میں ایران کے ہاتھوں اٹھائی تھی۔یہ ایک خیال ہے، امریکہ کا اصل مقصد ایرانی تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنا اور بحر کیسپین کو زیرِ نگیں لانا ہے جس کے بعد سعودی عرب کا علاقہ تبوک امریکہ سے وفاداری کے صلے میں اُردن کو دینا اور شام و لبنان کا کچھ حصہ عراق کے حوالے کرنا ہے۔مستقبل کے حوالے سے امریکہ کے عزائم اور نئی سرحد بندی کا مقصود اوّل و آخر تیل کا حصول اور مسلمانوں کو زیرِ دام لانا ہے۔

کرنل رالف پیٹر کی معرکتہ الآراء کتاب

''خونی سرحدیں''

سے اہم اقتباس

○

مفلس کدے

محمد سعید شیخ
(لاہور)

''تم اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

عدنان نے شب خوابی کا لباس پہن کر، اس کے پہلو میں لیٹتے ہوئے کہا۔

آصفہ نے اس کے لہجے کی چبھن محسوس کر لی تھی جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ رات کے وقت بستر میں لیٹتے ہوئے وہ ہر اس بات سے پرہیز کرنے کی عادی تھی جس سے ان کے درمیان تلخی پیدا ہو۔

''چھوڑ دوں گی۔ بڑی جلدی چھوڑ دوں گی۔ عارضی سا ساتھ ہے خود ہی ٹوٹ جائے گا۔ میں تو بس اسے مرنے میں سہولت دینا چاہتی ہوں۔ درمیان میں نہیں چھوڑ سکتی۔ پھر میں ان سے پیشگی معاوضہ بھی تو وصول کر چکی ہوں۔ نرسنگ تو ویسے بھی میرا پروفیشن ہے۔''

وہ پشت کے بل سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور چھت سے اوپر کہیں تاروں بھرے آسمان کا تصور کر رہی تھی۔ کھلا نیلا آسمان اُسے بہت فیسی نیٹ کرتا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اپنے باپ کے ساتھ اسی آسمان کے نیچے لیٹ کر تارے گنا کرتی تھی۔ گنتے گنتے اس کے اعداد ختم ہو جاتے تھے ستارے شمار میں نہیں آتے تھے۔ اس کے ابّا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔ ''اب سو جاؤ، صبح سکول جانا ہے''۔ وہ بیٹی کے دونوں گال چوم کر اُسے خدا حافظ، شب بخیر کہتے تھے تو اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اور عدنان ابھی اس سے جذبات کا کھیل کھیلے گا اور جب اس کے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے تو دوسری طرف منہ پھیر کے بیڈ کے کنارے پر چلا جائے گا۔ ان دونوں کے درمیان صبح تک کے لیے عجیب سی دوری پیدا ہو جائے گی جو آصفہ کو بہت کھلتی تھی۔

''اس کی صحت تمہاری ذمہ داری تو نہیں۔''

عدنان کی سوئی اُسی خیال پر اٹکی ہوئی تھی۔ ''نہ جانے وہ کب تک زندہ رہے۔ تم کیا تب تک اس کے ساتھ بندھی رہو گی؟''

اس کے لیے عدنان کی اس لمبی بات کا جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

اس کا تھکا ہوا جسم سونے کی طرف مائل تھا اور وہ اپنی سوچ کو بھی ایگزرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو تخیل کا، خوابوں کا، رومانس کا وقت تھا۔ عدنان کی گفتگو بے موقع تھی۔

وہ تو منتظر تھی کہ عدنان اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرے اور اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کھینچ لے جو کہ اس کی عادت تھی اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لے۔ وہ اتنے قریب سے اس کا چہرہ واضح نہیں دیکھ پاتی تھی۔ اس کے خدوخال بگڑ جاتے تھے ایسا شاید شدتِ جذبات سے ہوتا ہو۔ وہ اپنے تصور سے بھی ڈر جاتی تھی جسے ایک چہرے میں کبھی کبھی کئی چہرے بنتے بگڑتے نظر آنے لگتے تھے۔ سونا اس کے لیے اتنا آسان نہیں رہ جاتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی جب وہ آ کر اس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ اس نے اسے جگانے کے لیے نجانے کونسی آواز نکالی تھی جب اسے لگا تھا کہ اس کے چہرے پر جھکا کوئی کتا بھونکا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''آپ نے تو مجھے بُری طرح ڈرا دیا تھا۔ میں نے سمجھا۔ میں نے سمجھا تھا۔۔۔''

''کیا سمجھا تھا؟'' عدنان نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''چلیں رہنے دیں'' اس نے بات ادھوری رہنے دی۔ کبھی کبھی ایسی بہت سی باتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ یہی بہتر ہوتا ہے وہ بھی کہہ دی جائیں تو فساد کا احتمال ہوتا ہے۔

ابھی عدنان کو اپنی بات کا جواب کا انتظار تھا۔

''ڈاکٹر مجھے بتا چکا ہے وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے؟ پھر میں اتنے دنوں سے زیادہ تو تنخواہ لے چکی ہوں۔ اور وہ پیسے بھی تمہارے اکاؤنٹ میں گئے ہیں''۔

''مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس کی کنیز بن جاؤ۔''

عدنان اس موضوع کو چھوڑ نہیں پا رہا تھا جو عظمیٰ کے لیے تکلیف کا باعث بنتا جا رہا تھا اس وجہ سے بھی کہ عدنان اُسے غلط سمجھ رہا تھا۔

''میں محض اس کی نرس ہوں۔''

''مجھے یہ سب پسند نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عدنان نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

عظمیٰ کو اپنا یہ بستر چبھنے لگا۔ یہ بستر ان کی شادی کی نشانی تھی اور جس پر وہ ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہوئے بغیر لیٹنا گناہ سمجھتے تھے۔ آج وہ اس گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے کفرانِ نعمت تھا۔ یہاں سے تو وہ باہمی ایثار اور محبت کا درس لیتے تھے اور یہیں سے اس کی برکتوں سے انہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ملے تھے۔ اور اب وہ ایک دوسرے سے دُور مخالف کناروں کے

قریب قریب لیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کی پشتوں کے درمیان ایک فاصلہ تھا، ایک خلا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پہ شک تھا کہ وہ دوسرے کو صحیح نہیں سمجھ رہا تھا۔

عدنان سمجھتا تھا کہ گھر کے ماحول، اور بالخصوص اپنے شوہر سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ اس کی بیوی کسی بھی دوسرے کام کو اس پر فوقیت نہ دے۔ اب وہ ایک غیر مرد کی دیکھ بھال کو خاوند کی خوشی پر مقدم سمجھ رہی تھی یہ نامناسب ہی نہیں غیر اخلاقی بھی تھا۔ ہسپتال میں نرسنگ اور بات ہے۔

عظمیٰ سوچ رہی تھی کہ نرسنگ اس کا پیشہ تھا جس سے اس کی وفاداری کسی طرح بھی اس کی گھر سے، گھر والوں کے فرض سے متصادم نہیں۔ اس عارضی ڈیوٹی سے پہلے آخر وہ ہسپتال میں بھی یہی کام کرتی تھی۔ اور اب وہ ایک خوش حال، صاف ستھرے ماحول میں ایک بوڑھے مریض کی دیکھ بھال پر مامور ہوگئی تھی۔ اس میں کوئی برائی نہیں تھی جس کے لیے وہ اتنا معاوضہ لے چکی تھی جتنا شاید وہ دو سال میں بھی اپنی ہسپتال کی ڈیوٹی سے جمع نہیں کر سکتی تھی۔

پھر ڈاکٹر نے اسے بتا دیا تھا وہ زیادہ دن نہیں جئے گا۔ ''بس تم اپنی توجہ اور دیکھ بھال سے اس کے یہ آخری دن گزارنے میں اسے کچھ آسودگی دے سکتی ہو۔ وہ رحم اور ہمدردی کا مستحق ہے۔ تم خود ہی جان لوگی۔''

اور چند ہی دنوں میں اُس نے جان لیا تھا کہ اتنا دولت مند ہونے کے باوجود اور شاید اسی باعث وہ بیمار ہی نہیں بے بس بھی تھا، تنہا بھی تھا۔ اور عظمیٰ نے یہ ڈیوٹی لینے سے پہلے عدنان کی رضامندی بھی حاصل کی تھی۔

''کوئی حرج نہیں اگر وہ تمہیں معقول معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔''

اس وقت اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنے خلوص سے اس فریضے کی ادائیگی میں لگ جائے گی۔ بظاہر اس میں اعتراض کی بات نہیں تھی مگر اُسے ڈر یہ تھا کہ عظمیٰ اُس بوڑھے کی ہمدردی میں کچھ جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو گنتی کے دنوں کا کام تھا وہ ہفتوں پر پھیل گیا تھا۔

عدنان کو چاہیے تھا کہ صبح تک رات کے تکدّر کو بھول جاتا۔ رات سارے دن کا میل دھو ڈالتی ہے مگر اس کا دل میلا ہی رہا۔ وہ صبح بھی گئی رات کا بوجھ اتار نہیں سکا تھا۔ نئی صبح، زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کی سہولت سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

وہ عظمیٰ کو ایک عام انسان، ایک آزاد فرد سے زیادہ اپنی بیوی، ایک طرح سے اپنی ملکیت جانتا تھا۔ وہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ بھلے ہی اس کے ساتھ رہتی ہے اس کے دو بچوں کی ماں بن چکی ہے وہ اس کے بہت سے جسمانی رازوں سے واقف ہے مگر وہ ایک آزاد ذہن کی مالک ہے اس کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر انسان کی ہوتی ہیں اور وہ ساری وہ نہیں ہے جو وہ نظر آتی ہے۔

یہ اس کی پریشانی کی وجہ بھی بن رہی تھی۔

بچے سکول جا چکے تھے اور وہ دونوں ناشتہ کر رہے تھے جب عدنان نے اس کی حرکات و سکنات کو ذرا غور سے دیکھا۔ وہ کچھ جلدی میں تھی اور اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ جلدی چائے کا کپ پیے اور اپنے دفتر کی راہ لے۔

''تم نے تسلی سے ناشتہ نہیں کیا۔ باقی ناشتہ کیا اپنے مریض کے ساتھ کرو گی؟'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''تم ہنس کر یہ بات کہتے تو میں سمجھتی تم مذاق کر رہے ہو۔ مگر نہیں۔ تم شاید طنز کر رہے ہو۔'' عدنان خاموش رہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔''

وہ دونوں تقریباً ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

عدنان اس وقت بس پر اپنے دفتر جاتا تھا جب کہ عظمیٰ کو شاہ جی کی گاڑی لینے آتی تھی۔

جب عدنان سڑک کے کنارے بس پر سوار ہو رہا تھا، عظمیٰ کالی ٹیوٹا کرولا میں بیٹھ رہی تھی اور اس کا باوردی ڈرائیور گاڑی کا دروازہ پکڑے کھڑا تھا۔ عدنان معمولی سیکشن آفیسر تھا۔ دونوں کے سٹائل میں بظاہر کتنا فرق دکھائی دیتا تھا مگر وہ سوچنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا کہ یہ محض ظاہری فرق ہے سرسری اور عارضی۔

دونوں اپنے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے جا رہے تھے علیحدہ علیحدہ سواری پر جن کی حیثیت ان کا شخصیات کا جز نہیں تھا۔ پھر بھی عدنان دفتر میں جلا بھنا پہنچا تھا اور اس نے سارا غصہ اپنے سامنے رکھی فائلوں پر اُتارنا تھا۔ اُسے کسی فائل سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ منفی نوٹ لکھنے میں بہت ماہر تھا یہ جانے بغیر کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور مشکل کام تھا کہ وہ عظمیٰ کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا، اس کے کردار کو اس کے ماضی کی روشنی میں سوچتا، تب اگر اُسے کوئی خدشہ لاحق ہوتا تو اس کے تدارک کے لیے فکر مند ہوتا۔ وہ بھی ایک عام مرد کی طرح عمل کر رہا تھا، سوچ رہا تھا اور عظمیٰ کو اس کے طرزِ عمل پر افسوس محسوس ہوتا تھا اور ایک حد تک اُسے اپنی تحقیر کا بھی احساس ہوتا تھا۔

شاہ جی ایک مریض نہیں ہے۔ وہ ساری توجہ اور ایثار جو عظمیٰ ہسپتال میں کئی اور مریضوں کے لیے وقف کرتی تھی، اب شاہ جی کے لئے مختص ہو چکی تھی۔ کیسے کیسے انسان تھے اور کیسی کیسی بیماریاں لے کر آتے تھے عظمیٰ حیران ہوا کرتی تھی۔

جتنی ہمدردی سے وہ مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھی وہ شاید کسی بہت گہرے خلوص کے رہینِ منت تھا اور مریضوں کی جب تکلیف کم ہوتی تھی وہ صحت یاب ہو کر گھروں کو لوٹتے تھے تو وہ ڈاکٹروں سے زیادہ عظمیٰ کے احسان مند ہوتے تھے اُسے دعائیں دیتے اُن کے منہ سُوکتے تھے۔

عظمیٰ کو بہت راحت ملتی تھی، بہت طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ کام محض ایک عام ملازمت نہیں تھی اور وہ اسے دل و جان سے پسند کرتی تھی۔

شاید اسی لئے عدنان کے اعتراض پر وہ کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوئی تھی شاہ جی کے متعلق ڈاکٹر شاہد نے اسے بتایا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک جینے والا نہیں۔ دبے دبے لفظوں میں اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ مریض سے خوش نہیں تھا اور اس میں زندہ رہنے کی خواہش مر چکی تھی۔

اور عظمیٰ یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیوں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اس نے دیکھا تھا بُری سے بُری بیماری میں مبتلا مریض میں زندہ رہنے کی حرص موجود رہتی تھی۔ زندگی بُرے سے بُرے حالات میں بھی موت سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ تو پھر شاہ جی کیوں زندہ رہنا نہیں چاہتے۔

وہ مہینہ ڈیڑھ سے شاہ جی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وقت پر دوائی دینا، ان کی جسمانی صفائی کا خیال رکھنا، ان کے لیے پرہیزی خوراک تیار کروانا اور پھر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرنا، یہ سارے فرائض اس کے ذمہ تھے۔

عدنان اُسے ایک سے زائد مرتبہ کہہ چکا تھا۔

''کوشش کرو کہ جلدی سے جلدی اس کام سے فارغ ہو جاؤ۔''

اس مشورے میں ایک طرح کا حکم بھی چھپا ہوا تھا جو ہر مرد اپنی بیوی کو دینا ضروری سمجھتا ہے شاید یہ سمجھ کر اُسے دنیا کی زیادہ سمجھ ہے۔ عظمیٰ نے اسی وجہ سے اُسے بتانا ضروری خیال کیا۔

''یہ کوئی دفتری کام تھوڑا ہی ہے۔ ایک انسان کی زندگی کا معاملہ ہے''۔ عدنان کو عظمیٰ یہ جواب اچھا نہیں لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ دفتری کام کا اشاہ تو اس کے سرکاری امور اور اس سے متعلق اس کے طرزِ عمل کا تھا اس سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ عظمیٰ کی نگاہ میں اپنے کام کے مقابلے میں اس کے سرکاری کام کی کیا وقعت تھی۔

پھر بھی وہ عظمیٰ سے اس موضوع پر جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ جو پیشگی معاوضہ عظمیٰ کو ملا تھا، اس میں سے کچھ رقم وہ اپنی ذات پر بھی خرچ کر چکا تھا۔

مگر اس نے اس بارے میں یہ ضرور سوچنا شروع کر دیا تھا کہ عظمیٰ لاکھ اس کی بیوی سہی، بھلے ہی وہ اس کے بستر کی شریک تھی مگر شاید اس کی سب سے بڑی ترجیح اس کا اپنا پیشہ تھا۔ وہ اپنا کام پسند کرتی تھی اسی لئے وہ زیادہ خوش مزاج بھی تھی۔ عدنان کو اپنا کام پسند نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایک کلرک کی حیثیت سے جینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ لعنت بھیجتا تھا اپنے کام پر جب کہ عظمیٰ اپنا کام عبادت سمجھ کر کرتی تھی اور جب اس کا کوئی مریض صحت یاب ہوتا تھا، موت کے کنارے سے واپس آتا تھا تو اُسے اتنی خوشی ہوتی کہ کسی شب زندہ دار کو ساری رات کی عبادت سے کیا ہوتی ہوگی۔

اور اس روز بھی وہ عدنان کو اس کے دفتر روانہ کر کے فٹافٹ اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ راستے میں ایک جگہ ٹھہر کے اس نے روزانہ کی طرح تازہ پھول خریدے تھے اور جب وہ پھول خرید کر گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو بہت سے لوگ اُسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں رشک کا جذبہ تھا جس پر عظمیٰ کی نظر نہیں ٹھہری تھی۔

شاہ جی کا خانساماں دو تین مرتبہ انہیں ناشتہ کے لئے پوچھ چکا تھا۔ مگر شاہ جی عظمیٰ کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا ناشتہ لینا چاہتے تھے۔ اور عظمیٰ جب ان کے کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی تو تازہ پھولوں کی خوشبو شاہ جی تک اس کی آمد کا پیغام لا رہی تھی۔

شاہ جی کے بیڈ کے سرہانے گلدان سے اس نے باسی پھول نکالے اور اُن کی جگہ تازہ پھول لگا دیئے۔ ان دنوں گلاب اپنی بہار پر تھے اور اپنی خوشبو سے وہ چھلک رہے تھے۔ شاہ جی کے وجود تک ان پھولوں کی خوشبو کے ساتھ عظمیٰ کے جسم کی مہک بھی اڑ رہی تھی۔ اور پھر وہ دیکھتے دیکھتے اپنے بازوؤں کا سہارا لے کر انہوں نے اپنے اوپری دھڑ کو اوپر کیا اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا

''اب میں ناشتہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

عظمیٰ کو ان کی حالت دیکھ کر مسرت کا احساس ہوا تو وہ کہہ اٹھی۔

''آج تو طبیعت بہت اچھی لگ رہی ہے۔'' اور شاہ جی نے ایک ایسے مریض کے ہلکے شوخ لہجے میں کہا جسے زندگی نے جینے کا ہلکا سا چھلکورا دیا ہو۔

ان کے آجانے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

''واہ۔ شاہ جی۔ آپ نے شاعری بھی شروع کر دی۔ اور پیشتر اس کے شاہ جی کوئی اور بات کرتے وہ ناشتہ تیار کرنے کچن میں چلی گئی۔

شاہ جی کو جس طرح کے پرہیزی کھانے کی ضرورت تھی وہ کسی خانساماں کے بس کی بات نہیں تھی اسی لئے کچھ دنوں سے اس نے شاہ جی کے لئے خود ہی کھانا پکانا شروع کر دیا۔ ناشتے میں اب وہ شاہ جی کو پانی میں فرائی کیا ہوا بغیر زردی کا انڈا تھوڑا سا دلیہ اور ایک پتلا سلائیس دیتی تھی۔

شروع شروع میں تو شاہ جی کوئی بھی چیز خوشی سے نہیں کھا سکتے تھے جیسے ان کے معدے کو کسی خوراک کی اشتہاء ہی نہ ہو۔

پھر ایک روز عظمیٰ نے انہیں سمجھایا تھا۔ ''شاہ جی۔ انسان دو چیزوں کا مرکب ہے ایک روح۔ جو انسان کا جوہر ہے اور اس کا شرف بھی، اور دوسرا انسان کا جسم یہ اس روح کا مسکن ہے۔ اگر آپ بہت نیک اور پاکیزہ روح کے مالک ہوں تو بھی آپ کو اس کے مکان کی صفائی دھلائی، دیکھ بھال کا خیال ضرور رکھنا ہوگا۔ اس لئے اپنے اس جسم کو سنبھالئے۔ اور اس کے لئے اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ دوائیوں کا اثر بھی تبھی ہوگا''۔

یہ بات اس طرح سے شاہ جی کو پہلے کسی نے نہیں بتائی تھی۔

اس دن سے شاہ جی نے اپنی جسمانی حالت پر غور کرنا شروع کیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا ان کا جسم۔ ان کی روح کا مسکن تو بس کاڑ کباڑ سے اٹا پڑا تھا اب ان کا جی چاہتا تھا کوئی اس مکان کو صاف کر دے۔ اسے ان کے روح کے

قیام کے قابل بنادے۔اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے کھانا پینا شروع کر دیا۔

ناشتے کے بعد عظمیٰ انہیں وہیل چیئر پر بیٹھا کر گھر کے برآمدے میں لے آئی جہاں سامنے پودے، پھول درخت رنگوں سے لدے کھڑے تھے۔

جب شاہ جی اپنی وہیل چیئر کے پہیوں پر ہاتھ رکھے اپنے سامنے ان درختوں اور پودوں کو دیکھ رہے تھے تو ان کا سبز رنگ ان کی آنکھوں میں چھلک آیا تھا۔عظمیٰ ان کی پشت پر کھڑی تھی جس کے ملبوس کی مخصوص مہک شاہ جی کی مرجھائی زندگی میں تازہ ہوا کے جھونکوں کی مانند اڑ رہی تھی شاہ جی اُٹھ کر برآمدے کے ماربل کے فرش پر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنی ٹانگیں برآمدے سے نیچے اترتی سیڑھی پر پھیلا دی تھیں۔عظمیٰ ان کے دائیں جانب بیٹھ گئی۔

''تمہارا بہت شکریہ۔تم نے مجھے مُردوں اور مریضوں میں سے اٹھا کر زندوں میں شامل کر دیا ہے۔اب شاید میں کچھ دن اور جی لوں''۔

''آپ کے ڈاکٹر بہت اچھے ہیں۔میں تو ان کی ہدایت پر عمل کر رہی ہوں''۔عظمیٰ نے بہت سوچ کر یہ بات کی تھی۔شاہ جی نے آج جو شعر اسے دیکھ کر پڑھا تھا اس میں کسی مریض عاشق کے جذبات کا عکس موجود تھا جو وہ اپنے محبوب کے لئے محسوس کر رہا تھا جب وہ رسماً اس کی تیمارداری کے لیے آیا تھا۔

عظمیٰ ڈر گئی تھی۔وہ نرس کا کردار ہی ادا کرنا چاہتی تھی، کسی شاعر کے خیالی محبوب کا تصور بھی نہیں بننا چاہتی تھی۔اگرچہ وہ اس خیال سے خوش تھی کہ شاہ جی کی یہ حرکت ان میں زندگی کے جاگنے کا ثبوت تھی۔

''ٹھیک ہے۔علاج اچھا ہے مگر میری اصل مسیحا تو تم ہو، تمہارے ہاتھوں کے لمس سے تو میں جی اٹھا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے شاہ جی نے اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا جو ان کے قریب ہی فرش کو چھو رہا تھا۔عظمیٰ مزاحمت نہ کر سکی۔وہ شاہ جی کو خوش دیکھنا چاہتی تھی یہ خوشی ان کی صحت کی ضامن تھی اور یہ صحت ہی عظمیٰ کی منزل مقصود تھی۔دل میں وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اللہ کرے ڈاکٹر جلدی آ جائے۔آج اسی وقت اس کی وزٹ ڈیو تھی۔

اور شاہ جی کہنے لگے۔''عظمیٰ میری زندگی میں سوائے محبت کے کسی شے کی کمی نہیں رہی۔میں بینک میں بہت بڑا افسر تھا۔میں اپنے سے جو چاہے حاصل کر سکتا تھا، سوائے۔محبت کے''

اور یہ کہتے ہوئے ان کے گلے میں درد کی گانٹھ بن گئی۔دو چار لمحوں کے بعد جیسے وہ اپنے درد کو نگل کر کہنے لگے۔جسمانی بیماری تو مجھے اب جا کے لگی ہے جب میں پینسٹھ سال کا ہو رہا ہوں، دولت کی بیماری تو مجھے بہت پہلے لگ گئی تھی۔میں نے ایک مدت پہلے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا جو کوئی بھی میرے نزدیک آتا ہے میری دولت کے لئے آتا ہے۔شاید اسی لئے میں اپنوں سے بھی دور بھاگتا رہا۔یہاں تک کہ میری بیوی بھی مجھے چھوڑ کر امریکہ چلی گئی۔اپنے دو بیٹوں کے پاس جن کا روشن مستقبل بنانے کے لیے میں نے انہیں امریکہ بھیجا تھا اور وہ وہیں جا کر بیٹھ گئے۔اور مجھے چھوڑ دیا یہاں تن تنہا کیونکہ میں اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ انہیں منتقل کر چکا ہوں۔یہ دنیا ایسی دنیا ہو جائے گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔

''نہیں شاہ جی۔دنیا اتنی بھی بری نہیں ہے۔بس اب ذرا تندرست ہو جائیں، پھر دیکھئے زندگی آپ کو کتنی اچھی لگتی ہے۔''

شاہ جی اب بھی اس کے ہاتھ کو سہلا رہے تھے جسے عظمیٰ نے ایک آدھ مرتبہ واپس کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

اور شاہ جی سوچ رہے تھے یہ عورت جس کا ہاتھ میں نے تھام رکھا ہے اور جس کا لمس مجھے جینے کی امنگ دیتا ہے میری زندگی کو کیسے بدل سکتی تھی اگر یہ میری زندگی میں ہوتی۔

مگر وہ یہ نہیں بھول پا رہے تھے کہ وہ ستر سال کی عمر کو لگتے بوڑھے شخص، بیمار شخص کے درجے کو آ پہنچے تھے اور عظمیٰ ایک مکمل، صحت مند، خوبصورت عورت جس کے لیے زندگی ابھی کتنی امنگیں، کتنی امیدیں لئے ہوئے منتظر تھی اس کا ان سے کیا تعلق، کیا رشتہ بن سکتا تھا۔

''میں اس زیادہ اس سے کیا چاہ سکتا تھا۔'' مگر پچھلے ڈیڑھ ایک مہینے سے وہ اس کے وجود کے سحر میں گرفتار تھے۔یہ ایک طرح سے نشے کی حالت تھی جسے طول دینے کی بچگانہ خواہش ان کے دل میں ایک طرح کی ترنگ بیدار کرتی تھی۔

''میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں؟'' انہوں نے سوچا اور پھر یوں بولے جیسے کوئی نیند میں بولتا ہو۔اور بولنے کے ساتھ ہی اس نے عظمیٰ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں جانتا ہوں عظمیٰ۔زندگی اب میرا کوئی دعویٰ قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے پتا ہے میرے اعضاء بھی ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے کوئی دن جاتا ہے کہ میں تھکن سے بے حال ہو جاؤں گا اور پھر کوئی بھی میری مدد کو نہیں آئے گا۔'' وہ سانس لینے کو رُکے اور پھر اداس لہجے میں بولے۔میں یہ سمجھتا رہا کہ میں اپنی مرضی کی زندگی، اپنی منشا کی دنیا پیدا کر سکتا ہوں مگر میں نہ دنیا کو بدل سکا نہ خود کو۔اور اب۔۔۔وہ سوچنے کو رُکے۔۔۔اب تم نے۔۔۔بہت ہے۔۔۔ جو بھی کیا ہے بہت ہے۔تمہاری توجہ سے مجھے آخری دنوں میں جو آسودگی مل گئی ہے وہ بھی بہت ہے۔مرتے شخص کے لئے کوئی اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔یہ نہ کہہ سکے کہ یہ بھی کیا کم ہے کہ تم نے اپنا ہاتھ کچھ دیر کے لیے میرے ہاتھ میں دے دیا کہ میں اس لمس سے اپنے لئے زندگی کشید کروں۔ دونوں نے ایک طرح سے اپنے اپنے ضبط سے کام لیا تھا اور حد بندی پار نہیں کی تھی۔شاہ جی نے یہ ہاتھ محبت سے عقیدت سے آنکھوں کو نہیں لگایا تھا، یہ ہاتھ چوما نہیں تھا اور عظمیٰ نے یہ ہاتھ اپنے جسم کا ایک حصہ ان کے پاس رہنے دیا تھا، اسے جلدی واپس نہیں لیا تھا۔یہ انسانی ہمدردی، انسانی تعلق کی ایسی سطح تھی جس

تک پہنچ کر انسانی ذہن دھندلانے لگتا ہے۔ ہزار رنگ ہیں انسانی جذبات کے۔ کسی کو بھی کسی خانے میں بند رکھنا، مقید کرنا ممکن نہیں رہتا۔

عظمیٰ کی سب سے بڑی ترجیح یہ تھی کہ اس کی کسی بات سے، اس کی کسی حرکت سے شاہ جی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ جس مریض کو بھی وہ اٹنڈ کرتی تھی اس سے وہ خاص اُنس محسوس کرنے لگتی تھی اور اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مریض کی جسمانی اور ذہنی آسودگی کے لئے وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے۔

وہ مریض اور ان کی تیمار دار وہیں بیٹھے ہوئے تھے ماربل کے ٹھنڈے فرش پر جو دو سیڑھیاں اُتر کر گھاس کے میدان میں اُترتا تھا جب شاہ جی کا ڈرائیور ڈاکٹر شاہد کو لے کر آ گیا جو شاہ جی کا معالج تھا اور جس نے عظمیٰ کی خدمات شاہ جی کے لئے ہائر کی تھیں وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اور پھر شاہ جی کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے مسکرایا۔۔۔ معنی خیز طریقے سے اور بولا ''آج شاہ جی کی حالت بہت اچھی ہے۔ ویسے میرا علاج تو جو ہے جو سو ہے، اصل مسیحائی تو عظمیٰ جی کی ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے کی شوخی سے وہ شرما گئی حالانکہ اس کے لئے یہ تحسین کوئی نئی بات نہیں تھی ''نہیں میرا تو کوئی کمال نہیں۔ میں تو آپ کی ہدایات کے مطابق شاہ جی کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ شاہ جی بہتر ہو رہے ہیں۔ یہ اچھے ہو جائیں تو میری ڈیوٹی ختم ہو۔''

''اتنا اچھا تو میں نہیں ہونے والا'' شاہ جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

شاہ جی کی بات سن کر ڈاکٹر شاہد بھی مُسکرایا اور اپنی ڈائری میں کچھ لکھتے ہوئے عظمیٰ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔

''شاہ جی تو چاہتے ہیں کہ تم ان کی خدمت گار بنی رہو۔''

عظمیٰ جانتی تھی مگر اُسے عدنان کی فکر تھی۔ وہ عظمیٰ کی اس ڈیوٹی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں عظمیٰ کا تعلق اپنے اس امیر بوڑھے مریض سے اتنا گہرا نہ بن جائے کہ وہ اس سے دُور ہو جائے۔ اس نے غور نہیں کیا تھا۔ یہ محض سرسری سا تعلق تھا، عارضی اور ناپائیدار سا، ایسا تعلق جو کتنا بھی گہرا ہو جائے دونوں کی زندگی کو کوئی نیا رُخ نہیں دے سکتا۔

عظمیٰ میں زندگی کی سمت کی تبدیلی کی کوئی آرزو نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی انسانی افادیت کا اظہار پسند کرتی تھی اور شاہ جی۔۔۔ وہ تو زندگی گزار چکے تھے۔ ایسی منزل پر تھے کہ لاکھ کوشش کے باوجود اسے از سرِ نو شروع نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی عدنان عظمیٰ کے جذبۂ خدمت اور تیمارداری سے خوف کھاتا تھا۔

وہ سوچتا تھا۔ عظمیٰ آخر ایک انسان ہی تو ہے۔ اور وہ بھی عورت جو کمزور ہوتی ہے اور بطور انسان جاہل تھی، کبھی کبھی اپنے اچھے بُرے سے بے خبر ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے محدود تجربے سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ انسان کے اعمال اور اس کی نیت کے متعلق پیش گوئی کرنا از حد دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ اور پھر جو معاوضہ عظمیٰ کو اپنی ان خدمات کے عوض ملا تھا جن کی مدت کا کوئی تعین نہیں ہو پایا تھا وہ بظاہر اُسے بہت زیادہ لگتا تھا۔ بھلے ہی شاہ جی بہت امیر ہوں، پھر بھی وہ ایک مرد تھے، بوڑھے اور مریض ہونے کے باوجود اور پھر یہ خدمات انہیں ہسپتال میں رہ کر تقریباً فری ہی مل سکتی تھیں۔

شاہ جی کے دل کا حال تو اچھی طرح عظمیٰ بھی نہیں جان سکتی تھی۔ اتنا اسے اندازہ تھا کہ شاہ جی اس کی اتنی ہمدردانہ دیکھ بھال سے بہت خوش تھے۔ صبح ۹ بجے سے شام ۵ بجے تک۔ رات کو ٹیلی فون پر ان کی طبیعت پوچھ لیتی تھی۔

اب جب شاہ جی کی طبیعت سنبھل گئی تھی تو وہ دوپہر کو شاہ جی کے بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں آرام کر لیتی تھی۔ شاہ جی نے یہ کمرہ خاص اس کے لئے تیار کروا دیا تھا اور جب شام کو وہ چلی جاتی تھی تو اکثر شاہ جی آہستہ آہستہ چلتے اس کمرے میں جاتے تھے اور کچھ دیر اس بستر پر لیٹ کر اس کمرے میں لمبے لمبے سانس لیتے تھے جس کی فضا میں عظمیٰ کی موجودگی کی مہک ٹھہری ہوتی تھی۔ یہ شاہ جی کے لئے ایک طرح کا ٹانک تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا ان کی صحت کی بحالی میں اس کا کتنا ہاتھ تھا۔ وہ اس کمرے سے نکلتے تھے تو بہت تازہ دم ہو جاتے تھے۔

ٹورنٹو میں شاہ جی کے بیٹوں کو اور ان کی ماں کو جب یہ خبر ملی کہ محض ایک نرس کی ذاتی توجہ سے شاہ جی صحت یاب ہو رہے تھے تو وہ خوش ہونے کی بجائے پریشان ہو گئے۔ شاہ جی کی بیگم کی اپنی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ خود عارضۂ قلب میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹر نے اسے سفر کی اجازت نہیں دی۔

''تم جاؤ قمر۔ جاؤ جا کے اپنے باپ کا چارج لو۔ کہیں وہ نرس ہمدردی کے پردے میں شاہ جی پر قبضہ نہ کر لے۔ کہیں ان کی جائیداد نہ ہتھیا لے''

اور قمر نے ویک اینڈ پر ٹکٹ کٹایا اور پاکستان پہنچ گئے۔ سارے حالات کا جائزہ لیا اور بغیر اپنے والد سے بات کئے اس نے اگلی صبح عظمیٰ کی ڈیوٹی کے وقت اُسے ٹیلی فون کیا۔

''میں جی بہار شاہ کا بیٹا قمر بول رہا ہوں۔ رات کو یہاں پہنچا تھا۔ میرے ہوتے ہوئے انہیں کسی دوسرے کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب اس ڈیوٹی پر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں ڈاکٹر شاہد سے بھی بات کر لوں گا۔ اگر تنخواہ وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہو تو ضرور مجھ سے بات کر لیجیے گا۔''

عظمیٰ کو لگا کسی نے اس کے انسانی جذبے کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا ہو۔ اُس تحقیر کے احساس سے وہ یوں کُرسی پر ڈھے گئی جیسے کسی نے اس کے سر کسی الزام کا بھاری بوجھ ڈال دیا ہو۔ جیسے کسی کو دھتکار دیا گیا ہو۔

ویسے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ سوچ کر خوش ہوتی کہ اس کی یہ خاص اور ایک حد تک خطرناک ڈیوٹی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ شاید اُسے یہ انجام اچھا نہیں لگا تھا۔

اور بہار شاہ سے اس کے اپنے بیٹے نے ان کے آخری دنوں کی وہ آسودگی بھی چھین لی جو انہیں جینے پر مائل رکھتی تھی۔

☆

امنی

یٰسین احمد

(حیدرآباد،دکن)

ان دنوں امنی میرے گھر میں مقیم تھیں۔

وہ ایک ہفتہ قبل ہمارے گھر آئی تھیں اور مزید کتنے دنوں تک ہمارے گھر میں اُن کا قیام رہے گا؟ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس معاملہ میں امنی اپنی مرضی کی مالک و مختار تھیں۔اپنی مرضی سے آتیں، جب تک دل چاہا رہتیں اور پھر کسی سہانی صبح کو بتادیتیں کہ وہ جارہی ہیں۔ وہ عموماً صبح کی اولین ساعتوں میں نقل مقام کرتیں کیونکہ دھوپ تیز ہوجائے تو اختلاج قلب شروع ہونے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔اس لئے نیند سے بیدار ہوتے ہی اپنا سامان باندھتیں۔ان کا سامان تھا ہی کیا؟ ایک سوٹ کیس، جو مسلسل گردش میں رہنے کی وجہ سے اپنی اصلی ہیئت گنوا بیٹھا تھا۔روزمرہ استعمال کرنے کے کچھ پوشاک ایک شال' ایک توال' ٹوتھ پیسٹ برش اور دوائیں.... جاتے وقت کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو روک سکے۔اگر کوئی روک لیتا بھی تو وہ ہرگز نہ رُکتیں۔بس ایک ہی جملہ کہتیں ''میں پھر آوں گی۔''

ہوتا بھی یہ تھا کہ جس گھر سے وہ اپنا پڑاؤ اٹھاتیں وہاں دوبارہ ان کا آنا یقینی تھا۔کیونکہ امنی کی کائنات بہت محدود اور چھوٹی تھی۔لیکن وہ کب آئیں گی اس کا تعین نہیں تھا۔ان کا اپنا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ان کا آشیانہ تو بہت پہلے ہواؤں نے پھونک دیا تھا۔جس دن ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا' تب ہی سے متواتر وہ دربدر بھٹک رہی تھیں۔سبحان صاحب کا انتقال پندرہ سال پہلے ہوا تھا۔۱۴'۱۵ سال کا طویل عرصہ انہوں نے مختلف رشتے داروں کے گھروں میں گذار دیا تھا۔حتیٰ کہ اپنے اکلوتے بیٹے رزاق کے ساتھ وہ بہت کم رہیں۔اس کی کیا وجہ تھی؟ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ کبھی امنی نے بتایا تھا۔

امنی کا خاندان شہر کے مختلف محلوں میں پھیلا ہوا تھا۔جن کے پتے اور فون نمبر امنی کو ازبر تھے۔

محلّہ جہاں آراء باغ	یہاں امنی کی نواسی اور داماد کا گھر تھا۔
محلّہ چھاؤنی ناد علی بیگ	یہاں اکلوتے بیٹے رزاق کا گھر تھا۔
محلّہ فلک نما	یہاں اُن کی بڑی بہن رہتی تھی۔
محلّہ قلعہ کولکنڈہ	یہاں اُن کی بڑی بیٹی رہتی تھی۔
محلے ملے پلی	یہاں اُن کی چھوٹی بیٹی رہتی تھی۔
محلّہ مغل پورہ	یہاں اُن کا چھوٹا بھائی رہتا تھا۔

یہ محلے حیدرآباد کا پرانا شہر کہلاتے ہیں۔اصولاً پرانا وہ ہوتا ہے جس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔لیکن ہماری سرکار اور میڈیا کی نظر میں پرانا شہر وہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے۔جہاں غربت اور پسماندگی ہوتی ہے' جہاں رہنمائے قوم صرف الیکشن کے دنوں میں قدم رنجہ فرماتے ہیں۔امنی کے بیشتر رشتے دار انہیں محلوں میں رہتے تھے۔غربت اور افلاس کے دلدل میں پھنسے ہوئے۔لیکن جب امنی ان کے گھروں میں مہمان رہتیں تو کسی کو گراں نہیں گزرتا تھا۔

اس کے علاوہ امّنی میرے اور نعیم سیٹھ کے گھر میں کبھی کبھار اپنا پڑاؤ ڈال دیتی تھیں۔اُن کی مجھ سے بیوی کی طرف سے رشتے داری تھی مگر نعیم سیٹھ سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی اُن کی بیوی امنی کی ہم محلّہ تھیں اور برسوں سے دوستی تھی۔نعیم سیٹھ میرے پڑوسی تھے اور سونے چاندی کا کاروبار کرتے تھے۔ان کی بیوی غریبوں کی ہمدرد تھی لیکن مزاج میں خودنمائی زیادہ تھی۔اگر کسی کی مدد میں دس روپئے خرچ کرتی تو سو روپے اس کی تشہیر میں لگادیتی۔وہ وقتاً فوقتاً امنی کی مدد کیا کرتی تھی لیکن اس انداز میں کہ خاندان میں سب کو خبر ہوجائے۔یہ بات مجھ کو اچھی لگتی تھی اور نہ میری بیوی کو۔ہم لوگوں نے ان کو وہاں جانے سے منع بھی کیا تھا لیکن امنی کب کسی کی بات سنتی تھیں۔

امنی کی عمر پچاس سے تجاوز کرچکی تھی۔ذیابطیس کی مریض تھیں۔اختلاجِ قلب کی بھی شکایت تھی۔تاہم کام سے جی نہ چراتیں' جس گھر میں مہمان رہتیں وہاں کے لوگوں کے چھوٹے بڑے گھریلو کاموں میں مدد کردیتی تھیں۔سلوائی میں ماہر تھیں۔تکیوں کے غلاف' کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے انتہائی مہارت اور نت نئے وضع میں سیتیں۔اس لئے جن گھروں میں اہم تقاریب مستقبل قریب میں ہونے والی ہوتیں وہ امنی کے منتظر رہتے کہ امنی آئیں اور اس قسم کے کام ان کے تفویض کردیں۔ان کے آتے ہی سینے پُرونے کے چھوٹے موٹے کاموں کا ڈھیر اُن کے سامنے لگادیا جاتا جیسے بٹن ٹانکنا، ہنگ کپڑوں کو ڈھیلا کرنا، زیپ کا لگانا وغیرہ۔

وہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول ہوجاتیں۔حالانکہ سوئی دھاگے کی آنکھ مچولی میں آنکھوں میں پانی آنے لگتا تھا لیکن ماتھے پر ایک شکن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔یہ سب کچھ کرنے کے بدلے میں امنی کو کیا ملتا؟ دو وقت کا کھانا اور چائے۔گھر کے گوشے میں تھوڑی سی جگہ... جہاں وہ اپنے ہونٹ بند اور آنکھیں کھلی رکھ کر کاروبارِ دُنیا دیکھتی رہتیں۔جتنے دن اُس گھر میں قیام رہتا اسی حالت میں رہتیں۔شاید اس بے لوث جفاکشی کا نتیجہ تھا کہ اُن کی مہمان نوازی گراں نہیں گذرتی تھی۔کیونکہ اب مہمان نوازی کی روایت باقی نہیں رہی ہے۔لوگ یہ بات بھول چکے ہیں کہ مہمان کی شکل میں فرشتے آتے ہیں اور اپنا

رزق ساتھ لاتے ہیں۔یوں بھی آج کل مہمان آتے ہی کہاں ہیں؟ جب سے انسان آگے پیچھے، دائیں بائیں کے بجائے 'اوپر' اٹھنا شروع کیا ہے کشادہ مکانوں کے بجائے تنگ فلیٹ آگئے ہیں۔ان تنگ فلیٹوں نے ذہنوں کو بھی تنگ کردیا ہے۔اب کوئی مہمان آتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ وہ کب جائے اور ہم اپنا پیر پسار یں۔

میں نے امنی کے اچھے دن دیکھے تھے۔جب سبحان صاحب زندہ تھے امنی نے بڑی ٹھاٹ کی زندگی گذاری تھی۔سبحان صاحب کا کپڑے کا کاروبار تھا جو خوب چلتا تھا۔گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔نوکر چاکر تھے۔شاہانہ کروفر تھا۔امنی کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو کالج میں تعلیم حاصل کررہا تھا۔گردش تو یہیں سے شروع ہوئی۔سبحان صاحب اچانک چل بسے۔چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہوگیا۔امنی نے اونے پونے دُکان فروخت کردی اور جو پیسہ ہاتھ لگا اُس سے دونوں لڑکیوں کی شادی کردی۔

رزاق نے اپنی تعلم مکمل کی۔ملازمت مل گئی تو امنی نے اس کی بھی شادی کردی لیکن یہاں پہنچتے پہنچتے تک وہ بے گھر ہوگئیں۔وہ مکان بھی بک گیا جو اب تک اِن کے سر چھپانے کے کام آیا تھا۔ جہاں ان کی ازدواجی زندگی کی یادیں وابستہ تھیں۔سسرال والوں نے رزاق کو ایک مکان دیا تھا' وہ اس میں منتقل ہوگیا۔امنی کے لئے اس نے ایک کمرہ بھی مختص کردیا تھا۔مگر امنی بیٹے کے ساتھ بہت کم رہیں۔حالانکہ ان کا بہت سا سامان کمرے میں رکھا ہوا تھا جس پر ان کی پچھلی زندگی کی خوش گوار یادیں رقم تھیں ۔بیٹے نے بھی کبھی ماں کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔دو ماہ یا تین ماہ میں وہ امنی کا میڈیکل چیک اپ کراتا اور دوائیں دلا دیتا تو سمجھ لیتا کہ اس نے دودھ کی قیمت ادا کردی ہے۔

ہمارے خاندان کے بیشتر بزرگ اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔امنی واحد بزرگ تھیں اس لئے وہ ہمارے لے قابل احترام تھیں۔خاندان بھر میں وہ امنی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔چھوٹا بڑا ہر کوئی ان کو امنی کہا کرتا تھا۔میں جس گھرانے میں پیدا ہوا' پلا بڑھا وہاں بزرگوں کی بڑی اہمیت تھی۔گھر میں بزرگوں کی موجودگی کو باعثِ رحمت اور باعث برکت سمجھا جاتا تھا مگر اب ہمارے گھروں میں بزرگ نظر نہیں آتے۔پتہ نہیں وہ بزرگ کہاں چلے گئے جو ماضی کی' اسلاف کی پُر جلال کہانیاں سنا سنا کر نونہالوں میں جینا کا حوصلہ پیدا کرتے تھے۔اب گھروں کے دالان ٹی وی لانج میں تبدیل ہوگئے ہیں۔بزرگ کے بجائے وہاں ٹی وی نظر آتے ہیں اور بچے ان ٹی وی پر چولی کے پیچھے کیا ہے؟ شیلا کی جوانی یا پھر منی بدنام ہوئی دیکھ دیکھ کر تھرکتے ہیں اور دن بہ دن پیلے پڑتے جارہے ہیں۔اس لئے جب بھی امنی ہمارے گھر آتیں میں اور میری بیوی ان کو مجبور کرتے تھے کہ مستقل طور پر ہمارے پاس قیام کریں۔یہ دربدر بھٹکنا چھوڑ دیں لیکن وہ راضی نہ ہوتیں۔

امنی کو ہمارے گھر آئے ہوئے بارہ دن ہوگئے تھے۔

اب وہ ہمارے پاس سے جانے کے لئے چین نظر آرہی تھیں کہ ایک رات رزاق ہمارا گھر آگیا۔وہ امنی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔مستقبل طور پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔پہلے مجھ کو حیرت ہوئی کہ رزاق کو اچانک اپنی ماں کو ساتھ رکھنے کا خیال کیسے آگیا۔پھر میں خوش ہوا کہ چلو دیر سے ہی سہی اپنے ماں کو ساتھ رکھنے کا خیال آتو گیا۔آخر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔

امنی بہت دیر تک خاموش رہیں۔سوچتی رہیں' ہم لوگوں نے بھی ان کو سمجھایا کہ اس عمر میں گھر گھر بھٹکنا اچھا نہیں ہوتا۔وہ رزاق کے ساتھ رہا کرے۔چنانچہ وہ مستقل طور پر بیٹے کے ساتھ رہنے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔

اسی رات کو رزاق اپنی ماں کو لے کر چلا گیا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔

ایک دن میں اپنے آفس میں اپنے کام میں مشغول تھا۔اتنے میں وہاں رزاق آگیا۔وہ اپنے ساتھ کچھ کاغذات لایا تھا۔جن پر گزیٹیڈ عہدیدار کے دستخط کی ضرورت تھی۔میں نے ان کاغذات کو پڑھا۔وہ کاغذات امنی کی عمر اور رہائش کے بارے میں تیار کئے گئے تھے۔امنی کا مستقل پتہ رزاق کے گھر کا بتایا گیا تھا۔میں نے دستخط کردیئے اور پوچھا۔''اب عمر اور رہائش کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

رزاق میرا سوال سن کر مسکرایا اور بولا۔''آپ نہیں جانتے سرکار نے ایک اچھی اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت ہر غریب اور بے سہارا فرد کو ماہانہ پانچ سو روپے کا وظیفہ ملا کرے گا۔''

میں نے ہونقوں کی طرح اُس کی صورت تکتا رہا وہ خوش ہوکر بولا۔''امنی بھی اس وظیفہ کی مستحق ہیں۔''

اُس وقت جب رزاق امنی کو اپنے ساتھ ہمارے گھر سے لے جارہا تھا میں بالکل خالی الذہن تھا لیکن اب...پچھلے کئی سالوں سے دربدر بھٹکتی ہوئی ماں کے تئیں ایک بیٹے کے دل میں اچانک محبت کیسے اُمنڈ آئی تھی؟ اس کی وجہ اب میری سمجھ میں آرہی تھی۔

میں اکثر اُس شخص کے بارے سوچتا ہوں جس نے خدا معلوم کس جذبے یا احساس کے تحت اپنے والدین کو قتل کر دیا اور اپنے خلاف فیصلے کے بعد رحم کی اپیل میں اپنے یتیم ہونے کا جواز پیش کیا۔

(ابراہیم لنکن)

''برق رفتار زمانہ''

انور سدید

(لاہور)

پہلے اس زلف میں سمٹ کر دیکھ
بعد میں زندگی سے کٹ کر دیکھ

کس قدر ہے خنک فضا اس کی
اپنے جامے میں تو سمٹ کر دیکھ

رہ گیا ہے جو پشت کے پیچھے
اس منظر کو پھر پلٹ کر دیکھ

کیا ہے پرکیف بانٹنے کا عمل
اپنے بچوں میں آپ بٹ کر دیکھ

اس کے پیچھے بھی ایک سورج ہے
لیکن بادل کی مثل پھٹ کر دیکھ

عشق کرنا بہت ہے مشکل کام
اور اس کام سے نمٹ کر دیکھ

کیا ہے خوشبو، وطن کی مٹی میں
سر پہ ڈال اور اس میں اٹ کر دیکھ

دیکھنا ہے اگر جہاں تو نے
اپنی آنکھوں سے خود لپٹ کر دیکھ

برق رفتار یہ زمانہ ہے
اس کو انور سدید ہٹ کر دیکھ

○

مشکور حسین یاد

(لاہور)

تصورِ وصال سے پسینے چھوٹنے لگے
جبینِ خوش جمال سے پسینے چھوٹنے لگے

یہ آپ غُصّے میں ہیں یا بہت زیادہ خوف میں
کہ حرفِ اشتعال سے پسینے چھوٹنے لگے

گذشتہ کل کہ آنے والے کل کی بات چھوڑ یے
یہاں تو عرضِ حال سے پسینے چھوٹنے لگے

فضول سے جو خواب ہم نے دیکھنے کئے شروع
تو خواب کے خیال سے پسینے چھوٹنے لگے

یہ کیسے اولے زور کے پڑے ہیں سر مُنڈاتے ہی
فضائے بال بال سے پسینے چھوٹنے لگے

شعورِ شرق و غرب سے کنارا ہم نے کیا کیا
جنوب سے شمال سے پسینے چھوٹنے لگے

جواب اُس کا ہم جو دیتے بھی تو یادؔ کس طرح
ہمارے تو سوال سے پسینے چھوٹنے لگے

○

کرشن کمار طور

(دھرم شالہ، بھارت)

جو نہیں ہے اسی منظر میں بہت ہوتا ہے
یہ سنا ہے تو مرے گھر میں بہت ہوتا ہے

ہارنا میرا مقدر ہے یہ سب جانتے ہیں
شور پھر کیوں مرے لشکر میں بہت ہوتا ہے

ایسے ہی آتی نہیں عشق میں سجدہ صنعتی
خون کا زور قلندر میں بہت ہوتا ہے

وقت کے دہر کی ہر چیز پہ ہوتا ہے اثر
کم جو دکھتا ہے مقدر میں بہت ہوتا ہے

پیاس بجھتی ہے کہاں تشنہ لبوں کی اس سے
پانی کہنے کو سمندر میں بہت ہوتا ہے

کچھ کرشمہ بھی دکھاتی ہے لہو کی خوشبو
کچھ مزا بھی ہوس زر میں بہت ہوتا ہے

طورؔ وہ چاہے تو سرسبز مجھے بھی کردے
معجزہ دست ہنرور میں بہت ہوتا ہے

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

صدائے خلق پہ وہ گوش وا نہیں کرتا
پھر اُس پہ زعم ہے کوئی خطا نہیں کرتا

لگا لیا ہے ہر اِک غم نے ہم کو سینے سے
بس ایک وہ ہے جو آغوش وا نہیں کرتا

کھُلے گا ایک نہ اک دن کوئی تو دروازہ
اداشناس گدا ہے، صدا نہیں کرتا

اسے تو سایۂ ابر کرم ہی کافی ہے
یہ رندِ بادہ ہے، کوئی ریا نہیں کرتا

وہ جس کی آنکھ میں نم ہو نہ دل میں سوز و گداز
اُسے وہ درد کی دولت عطا نہیں کرتا

ہو جس کے دل میں لگن کوچۂ ملامت کی
وہ پندِ شیخِ مکرّم سنا نہیں کرتا

وہ جس کے سر میں ہو سودائے بادیہ راحتؔ
وہ سنگ و خشت کے گھر میں رہا نہیں کرتا

○

خالد حمید شیدؔا
(یو۔ایس۔اے)

اک یارِ بے وفا جو میری نظر میں ہے
اُس جیسی دلربا نہ کوئی اس شہر میں ہے

کرتا ہوں بات اُسکے لبوں کی اگر کبھی
آتا ہے ذائقہ جو نہ شیر وشکر میں ہے

قدرت ملی ہے اُسکی جو چشمِ غزال کو
ایسی نہ پیل میں ہے نہ شیرِ ببر میں ہے

یوں تو مٹک کے چلتے ہیں معشوق ہر جگہ
لیکن لچک کہاں وہ جو تیری کمر میں ہے

جس ناز سے کرے ہے وہ اپنی کلاہ کج
وہ شان و کروفر نہ کسی تاجور میں ہے

کیسے کہوں میں اُس سے کہ جلوہ دکھا مجھے
جب تاب اِسکی دل میں نہ میرے جگر میں ہے

تابش مگر ہے شیدؔا جو الفت میں اک مری
شعلے میں ہے نہ کوئی، نہ کوئی شرر میں ہے

○

سُرور انبالوی
(راولپنڈی)

لہُو سے ہم نے جلایا دیا وفاؤں کا
بپھر کے تُند بگولا اُٹھا ہواؤں کا

سرِ نیاز وہیں خم ہوا ہے سجدے میں
نظر جہاں بھی پڑا نقش تیرے پاؤں کا

بُجھے چراغ جل اُٹھتے ہیں تیری یادوں کے
کسی سے نام جو سنتے ہیں تیرے گاؤں کا

کِسی کے لب پہ بھی حرفِ دُعا نہیں اب تو
پڑا ہے کال کچھ ایسا جہاں میں ماؤں کا

شبِ فراق تصّور ہے تیری زلفوں کا
نہ پوچھ سامنا مجھ کو ہے کِن بلاؤں کا

یہ کِس مقام پہ انسان خود کو لے آیا
گزر گیا ہے وہ لمحہ بھی اب دعاؤں کا

نُمودِ صبح سے تبسّم ترا ہویدا ہے
جواب ہو نہیں سکتا تری اداؤں کا

نہ جانے کونسے آسیب کا یہ سایہ ہے
گمان شہروں پہ ہونے لگا خلاؤں کا

سُرور بڑھ کے پذیرائی اب صبا کی کرو
جواب لائی ہے شاید مری وفاؤں کا

غالب عرفان
(کراچی)

کوئی مجھ سے کچھ دور سفر میں رہتا ہے
اِک شاعر کا شعور سفر میں رہتا ہے

آنکھوں میں سچائی کے منظر لے کر
تازہ دم منصور سفر میں رہتا ہے

زندہ آج کلیم نہیں کوئی ورنہ
روشن جلوۂ طور سفر میں رہتا ہے

تہذیبیں، تاریخ جہاں چاہیں موڑیں
ازل کا اِک دستور سفر میں رہتا ہے

اپنی مٹی کو سونا کرنے کے لیے
محنت کش مزدور سفر میں رہتا ہے

عہد بہ عہد حقوق بدل جاتے ہیں مگر
فرض کا اِک منشور سفر میں رہتا ہے

فکر و نظر کی منزل کچھ ہو لیکن دل
جذبوں سے معمور سفر میں رہتا ہے

خود پر اوڑھ کے ہر موسم کی تبدیلی
ایک ہجومِ طیورؔ سفر میں رہتا ہے

تنہائی کی راہ میں شہرِ عرفاںؔ تک
شعر کا لطف و سرور سفر میں رہتا ہے

غلام مرتضیٰ راہیؔ
(فتح پور، بھارت)

ذرا تیز کوئی سواری ہوئی
کہ پُوشاک پر گرد طاری ہوئی

اثر اور ہی اس کی پرسش میں تھا
لگا واقعی غم گساری ہوئی

وہی تم سے کاٹے نہیں کٹ رہیں
جو راتیں ہیں میری گزاری ہوئی

جھکانا بہت میں نے چاہا اُسے
جو گردن ہے میری اتاری ہوئی

ندی، جھیل، جھرنے ٹھٹھرنے لگے
جو اس دفعہ کم برف باری ہوئی

پلٹنے لگی دھار تلوار کی
یہاں تک مری ضرب کاری ہوئی

○

شاہین
(کینیڈا)

ایک ذرہ کہ بے حوالہ ہے
وہ بھی اپنی جگہ ہمالہ ہے

آگ کے گرد بیٹھ کر سرِ شام
درد کو ماجرے میں ڈھالا ہے

رنگ بھی اک اشاریہ تھا مگر
اب تو خوشبو مرا حوالہ ہے

بوجھ ہمسائے کی نظر کا تھا
برف نے عیب ڈھانپ ڈالا ہے

اک اُچٹتی نظر کی مستی نے
دل کی دیوار کو سنبھالا ہے

زندگی نے بڑی نوازش کی
ہنس کے دکھ درد جھیل ڈالا ہے

رُت گذر ہی گئی زمستاں کی
اب تو صورت پذیر لالہ ہے

روشنی ہے تمام اندر کی
ہاتھ میں گرچہ اک شمالہ ہے

نسلِ نو کا غرور ہے اُس میں
وہ جو اَبلا سی ایک بالا ہے

بات شاہین کیوں نہ راس آتی
خامشی کو بہت کھنگالا ہے

○

انوار فیروز
(راولپنڈی)

کوئی سازش پسِ دیوار نہیں کر سکتا
میں ہوں ہشیار کوئی وار نہیں کر سکتا

میرے کردار کا جوہر ہے نمایاں سب پر
اپنے دشمن سے کبھی پیار نہیں کر سکتا

کج کلاہوں کے سروں کو تو جھکا سکتا ہوں
پر میں سجدہ سرِ دربار نہیں کر سکتا

پھیلتا رہتا ہوں دنیا میں اجالا بن کر
کوئی کرنوں کو گرفتار نہیں کر سکتا

اک ذرا صبر کہ الفاظ گواہی دے لیں
اپنی مرضی سے میں اظہار نہیں کر سکتا

جو بھی محسوس کروں زہر کی صورت پی لوں
چُپ رہوں کوئی بھی گفتار نہیں کر سکتا

اتنی قدرت ہے کسی پتھر کو بھی گویائی دوں
لیکن انوار میں پندار نہیں کر سکتا

○

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

(جناب کرشن پرویز سے معذرت کے ساتھ)

سچ تو یہ ہے تری انا کو مری وفا سے پیار نہیں ہے
لیکن تیری فرشتہ سیرت سے مجھکو انکار نہیں ہے

تن تنہا رہتا ہوں، خلوت کدے میں، آٹھوں پہر
ہست و بود کی اِس بستی میں میرا کوئی غم خوار نہیں ہے

خود کو پابند کر لیا ہے، لمحۂ موجود میں
کسی کی آمد یا رخصت سے اب کوئی سروکار نہیں ہے

''چپ'' رہنا بہتر ہے یارو، اپنے تم سکھ درد سے لپٹو
کوئی جب بکواس کو تیری، سننے کو تیار نہیں ہے۔

گردشِ وقت کا وہ مارا، بھول سے مے خانے آ نکلا
مے کی اُسکو طلب نہیں ہے تشنہ ہے، مے خوار نہیں ہے

قسمیں، وعدے، عشق و محبت، دل کے بہلاوے ہیں یارو
اپنی اپنی طلب کے بندے، یاں کوئی دلدار نہیں ہے

تم ہی واحد نہیں ہو تشنہ، عشق میں کوئی پار ہے اُترا؟
عشق کی نیّا کا رب راکھا، یاں کوئی پتوار نہیں ہے۔

○

ضیاء شبنمی
(ملتان)

صبا کے ہاتھ پر تحریر کر دے
تو رازِ گل کی یوں تشہیر کر دے

تمناؤں کا گھر تعمیر کر دے
کوئی تو وصل کی تدبیر کر دے

مجھے اے آخرِ شب کے مسافر
وصالِ ماہ کی تقدیر کر دے

بچھڑ کر شہرِ دل میں اے مرے دل
تُو مجھ کو اور بھی دلگیر کر دے

گلابوں کی مہک جن کے سخن ہیں
اُنہیں تو اب مری تقدیر کر دے

کتابِ عصر میں لکھا گیا ہوں
مجھے پڑھ لے، میری تفسیر کر دے

کسی کی ناتمام انگڑائیوں کو
مصوّر ہے تو پھر تصویر کر دے

ضیاؔ تقدیر بن جائے وہ میری
مرے خوابوں کی یوں تعبیر کر دے

○

رب نواز مائل
(کوئٹہ)

ذرا جو دِل کے بھی احساں اٹھائیں
تو گھر اُلفت کے ہم بھی کچھ بنائیں

مگر ٹُوٹیں تو کیوں ٹُوٹیں دُکھوں سے
کہ جب شکتی سدا اُن سے بھی پائیں

طلب آوارۂ کُو جتنی بھی ہو
نگینہ ہے وہی سب اُس سے پائیں

فقط میں ہی یہاں وہ خواب بیں ہوں
جسے خواب ہی، تو جُوں سب کچھ دِلائیں

خدایا کیا ہوا عالم کو اپنے
جو اس کو تنگ تر اب کتنا پائیں

نظارہ حسن کا ایسے تو کیوں ہو؟
نہ جب تک خود کو اس قابل بنائیں

○

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

وقارِ کارِ ہنر ہم نے یوں بجا رکھا
سلگتے حرف میں اک شعلۂ نوا رکھا

ہمارا جرم کہ سچ بات ہی کہی منہ پر
وہ ایک ہم کہ ہر اک شخص کو خفا رکھا

غریبِ شہر کو عبرت نشاں بنا بیٹھے
امیرِ شہر کو سر پر مگر بٹھا رکھا

ہوا وہ دشمنِ جان بے سبب مگر ہم نے
تمام عمر اسے شاملِ دعا رکھا

غلط نہیں کہ دل وجاں سے اس کو چاہا ہے
بھلا کیا کہ بُرا خود کو بھی بھُلا رکھا

ہم اور کوئی اثاثہ بچا کے کیا رکھتے
یہ دل کسی کی امانت ہے جو بچا رکھا

تراش لائے ہیں کچھ لوگ آفتاب نئے
چراغِ غیرتِ انساں مگر بجھا رکھا

ہمیں خبر ہے کہ ظالم بھی ہے وہی جس نے
دیارِ جبر میں ہر ظلم کو روا رکھا

شبِ سیاہ میں کچھ اور تو کیا نہ مگر
لہو جلا کے حسن طاق پر دیا رکھا

○

تنہائی کا سفر

ڈاکٹر سید سعید نقوی
(نیویارک)

آخر کار طلاق ہو ہی گئی۔

جس نے سنا افسوس کیا، ابھی تین ہی سال پہلے کس دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ سمیرا والدین کی اکلوتی بیٹی تھی، فقط چھ برس کی تھی کہ والدین امریکہ چلے آئے۔ یہ خاندان پردیس تو چلا آیا لیکن پاکستان سے ناطہ نہ توڑ سکا۔ ہر سال پلٹ کے جاتے رہے۔ کبھی کسی عزیز سے ملنے کے بہانے، کبھی خریداری کے شوق میں اور جس سال کوئی وجہ نہ بن سکی اس سال بس یہ کہ 'بھئی بہت دن ہو گئے پاکستان کا چکر لگائے'۔ یوں سمیرا پلی بڑھی تو امریکہ میں لیکن پاکستانی روایت، ثقافت اور معاشرت سے اس کا قریبی تعلق رہا۔ امریکہ میں بھی ان کے سب ہی دوست پاکستانی تھے، یا کچھ ہندوستانی مسلمان خاندانوں سے میل ملاپ تھا۔ سمیرا ایک قدرتی استانی تھی۔ اکثر اوقات فطری رجحان اور طبیعت کا میلان نوعمری میں ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی میلانِ طبیعت کے مطابق شعبہ اپنا لے تو بہت آگے نکل جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بچوں کو پڑھانے کا سمیرا کو ہمیشہ سے شوق تھا۔ شاید اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے، اپنے بچپن کا اکیلا پن وہ دوسرے بچوں سے گھل مل کر پورا کرتی تھی۔

ابھی گریجویشن مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ والدین کو اس کی شادی کا خلجان ہونے لگا۔ ایسے میں جب اس کے والد کے دوست نے لاہور سے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا تو معاملات خود بخود بنتے چلے گئے۔ سمیرا لڑکے سے پاکستان میں کئی دفعہ مل چکی تھی۔ کنگ ایڈورڈ کالج میں میڈیکل کا سال، آخر کا طالبِ علم۔ تیسری دنیا کے اکثر نوجوانوں کی طرح مغرب سے زیادہ مغرب زدہ۔ وہ مغربی موسیقی جو سمیرا نے بھی نہ سنی ہو وہ اس کی زبان پر رہتی۔ امریکی فلمیں، لباس، فیشن، سیاست کون سی چیز تھی جو اخبار، ٹی وی اور میگزین کے ذریعے اطہر تک نہ پہنچی ہو۔ سمیرا کے یہ اندیشے کہ مشرق کی یہ بیل مغربی مٹی میں کیسے پنپ سکے گی، اطہر سے مل کر اور باتیں کر کے ختم ہو گئے۔ امریکہ میں پلی بڑھی یہ 'دیسی' نسل ABCD یعنی American Born Confused Desi کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ انتقاماً یہ نوجوان نسل تازہ واردان کو FOB یا Fresh Off Boat کے نام سے چھیڑتے ہیں۔ ABCD اور FOB کا ملاپ عموماً ٹریجک ہوتا ہے، لیکن کامیاب وارداتیں بھی ایسی کچھ کم نہیں ہیں۔ حروف کے اختلاط میں زیادہ شرح ناکامیاب جملوں اور نامقبول اصطلاحوں کی ہے۔

اطہر اور سمیرا کی عمروں میں صرف دو سال کی چھٹائی بڑائی تھی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ لگتا تھا قدرت سہولتیں پیدا کرنے پر کمربستہ ہے اور یہ جوڑی بنانے پر تلی ہے۔ پھر رخنہ کیا پڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ سہولتیں اکثر اس لئے دی جاتی ہیں اسٹیج سیٹ ہو جائے تو پردہ اٹھے۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ رخصتی کی تقریب لاہور میں۔ امریکی ڈالر جب روپئے کی قوتِ خرید میں بدلے تو آرائش و جمال سستی ہو جاتی ہے۔ رنگ و خوشبو کے دہانے کھل گئے۔ کھانے پر اتنے لوازمات کہ بایزید کا دسترخوان شرما جائے۔ مقابلہ بازی کی اس فضا میں اس شان و شوکت اور دکھاوے سے ان بچوں کے والدین مشکل میں پڑ جاتے ہیں جن کی ابھی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔

نکاح اور رخصتی کے بعد سمیرا کے والدین واپس ہیوسٹن آ گئے۔ جب کہ سمیرا تقریباً چھ ماہ مزید پاکستان میں رکی۔ ان چھ ماہ میں اس نے بہت سے دوست بنا لئے۔ لاہور میں اس کے ہم عمر اس کی صاف گوئی، سادہ دلی اور خوش دلی سے بہت متاثر تھے۔ سمیرا نے امریکی معاشرے کے اچھے موتی چن لئے تھے، جبکہ گندگی سے اپنا دامن بچائے رکھا تھا۔ چھ ماہ بعد اطہر اور سمیرا ہیوسٹن آئے تو یہاں بھی ایک شاندار تقریب میں اطہر کو ہیوسٹن کی پاکستانی کمیونٹی سے متعارف کرایا گیا۔

'ہیلو تابندہ کیا کر رہی ہو'۔

'سمیرا، فرصت مل گئی تمہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے، لانڈری کر کے کپڑے تہہ کر رہی ہوں'۔

'میں سوچ رہی ہوں تمہاری طرف چکر لگا لوں'

'ارے واقعی، سچ، فوراً آ جاؤ۔ یہاں صابری نہاری کی نئی دکان کھلی ہے تمہیں اس کی نہاری کھلاؤں گی'۔

تابندہ کو میری کمزوری کا پتہ تھا، اس نے بالکل صحیح بٹن دبایا۔

'آ تو جاؤں لیکن تم اپنے اس 'doggy' کو فوراً باندھ لو پہلے۔ آپ سے کیا چھپانا، کتوں سے میری جان جاتی ہے۔

'Doggy تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے doggy نہ ہو کوئی کتا ہو'؟

'کتا ہی تو ہے کمبخت، کتا، کتا، کتا'

'تم میری feelings بہت Hurt کر رہی ہو' تابندہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔

'واقعی لاڈ تو تم اس کے ایسے اٹھاتی ہو کہ کیا میں اطہر کے اٹھا سکتی ہوں'

'تم فوراً آؤ۔ کتے کو کر دیا میں نے بند۔ مجھے سب سننا ہے شادی شدہ زندگی کے بارے میں' اطہر کو ریزیڈنسی نیویارک میں ملی تو وہ دونوں نیویارک

کے علاقے بروکلین میں منتقل ہو گئے۔ سمیرا کو بھی یہاں ایک مقامی اسکول میں آرام سے نوکری مل گئی۔ نوجوان جوڑا اپنی مصروف زندگیوں کے درمیان ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شادی بھی تو ایک سائنس ہے۔ جس میں تاریخ، جغرافیہ معاشرتی علوم، کیمسٹری سب کے پرچے ہوتے ہیں۔ کسی پرچے میں ایک ساتھی فیل ہوتا ہے تو کسی اور پرچے میں دوسرا۔ اس طرح ایک دوسرے کی کمی بیشیوں کا حساب کر کے ایک توازن قائم ہو جاتا ہے۔ پہلے چھ ماہ اسی کرید اور دریافت میں گذر گئے۔ سمیرا اور اطہر کے یہاں بھی بہت سے ہم عمر دوست بن گئے۔ دونوں ہی اس شہر میں اجنبی تھے۔ کچھ دوست اطہر کے حوالے سے بنے اور کچھ سمیرا کے تعلق سے جڑے۔ شومئی قسمت تابندہ بھی شادی ہو کر نیویارک آ گئی تو زندگی اور رواں ہو گئی۔

ایک سال تک تو موسمِ بہار رہا پھر آہستہ آہستہ پُروائی چلنے لگی۔ پہلے جھگڑے چھوٹی موٹی باتوں پر ہوتے تھے۔ اطہر گھر آیا ہے تو کھانا تیار کیوں نہیں۔ اگر سمیرا ابھی نوکری سے آئی ہے تو اسے صبح کھانا پکا کر جانا چاہیئے تھا۔ پاکستان میں بھی لڑکیاں نوکری کرتی ہیں، لیکن ایسا تو نہیں ہوتا کہ ہانڈیاں اوندھی دھری ہوں۔ سمیرا سب کی موجودگی میں اگر اطہر سے گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے کو کہتی تو یہ بات بھی وجہ نزاع بنتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی چپقلشیں آہستہ آہستہ پھیل کر جنگوں میں بدل گئیں۔ دونو جوان روحیں جواب تک آزاد تھیں وہ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کے حساب، معمولات اور طریقِ زندگی میں مقید ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ اگر شروع میں بزرگوں کا سایہ سر پر ہوتا ہے تو اکثر مروت اور محبت سے یہ گاڑی دھکم پیل سے چل پڑتی ہے، جہاں رکی والدین کے دباؤ اور مشورہ کے دھکے سے دوبارہ اسٹارٹ۔ مگر یہاں تو دو انا پسند ذاتیں اپنے اپنے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔ جس طرح جوڑے اپنی ذات کی نوکیں اور خار قربت کی خراد پر چڑھا کر انکا زہر نکال لیتے ہیں، وہ نوکیں نہ جھڑ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی سال جوتوں میں دال بٹنے لگی۔

گو بات ابھی تک والدین سے پوشیدہ تھی مگر جیسے جیسے کشیدگی بڑھی یہ ناگذیر تھا کہ یہ اُبال بھاپ بن کر ریاکاری کے ڈھکنے کو اڑا دیگا۔ اور یہ کشمکش اہل کر دونوں خاندانوں کو آبلہ پا کر دے گی۔ ہوا بھی یہی۔ دونوں کے والدین کی بھرپور کوشش کے باوجود بات نہ پنپ سکی۔ مہینہ دو مہینہ کے لئے معاملات سنور بھی جاتے تو کسی بہت چھوٹی سی بات کی وجہ سے واپس اسی ڈگر پر آ جاتے۔ خانگی جھگڑوں میں جب فریقین ایک دوسرے کی نظر میں عزت کھو دیں تو واپسی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دن جب یہ جھگڑا ہاتھا پائی میں بدل گیا تو یہ تابوت میں آخری کیل تھی۔ اب تک یہ بات سب دوستوں کو معلوم ہو چکی تھی۔ کچھ دوستوں نے درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے۔ جس روز طلاق کا فیصلہ ہوا ہے وہ دن سمیرا کو اچھی طرح یاد تھا:

'میرے والدین شام میں آ رہے ہیں' میں نے صبح ناشتے کی میز پر اطہر کو اطلاع دی۔

'ابھی پچھلے ماہ تو ہو کر گئے ہیں'

'تو کیا اب اپنی بیٹی کے گھر آنے کے لئے مناسب وقفہ دے کر آئیں' میں اپنے لہجے میں طنز نہ چھپا سکی۔

'ہاں اگر یہ دورے جلدی جلدی ہونے لگیں تو۔ ایک تو ہمارے وسائل پر بوجھ پڑتا ہے مہمانداری کا، دوسرے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں مصنوعی مسکراہٹ لئے ان کے سامنے بیٹھا رہوں'

'وہ تم سے ملنے تو نہیں آ رہے' میں غلط فقرہ کہہ بیٹھی۔

'چلو اچھا کیا تم نے یہ واضح کر دیا۔ پھر میں آج رات وہیں ابراہیم کے پاس ٹھہر جاؤں گا'

'تم بالکل ابراہیم کے پاس نہیں سو گے۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے' میں نے التجا کی۔

'مجھے ان کی آمد و رفت پر کنٹرول نہیں اپنی حرکت و سکونت کا تو اختیار ہے'۔

'پلیز ہمارے گھر کوئی بات درست کیوں نہیں ہوتی' اب میں آنسو نہ روک سکی'۔

'یہ مگرمچھ کے آنسو مت بہاؤ۔ میں نے کہہ دیا میں رات نہیں آوں گا'

'بھاڑ میں جاؤ مجھے بھی غصہ آ گیا'۔

'بکواس کی ضرورت نہیں ہے اپنی زبان پر قابو رکھو ورنہ۔۔'

'ورنہ کیا؟' میں نے اطہر کو گویا چیلنج کیا۔

اطہر نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔

گھر میں تناؤ کی وہ فضا قائم تھی کہ اتنی معمولی معمولی بات بھی نوکِ خار بن جاتی تھی۔ ہم دونوں بیوقوفوں کی طرح اس الجھے دامن کو سلجھانے کے بجائے جھٹکا دے کر نکالنا چاہتے تھے۔

'ورنہ کیا، بول کیوں نہیں رہے، یہ پاکستان نہیں ہے' میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں اکثر شوہر بیویوں پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

'ورنہ یہ کہ ایک تھپڑ لگا تو تمھاری زبان تمیز کے دائرے میں پہنچ جائے گی'۔

'تھپڑ مارو گے، تھپڑ مارو گے'، میں نے اس کا گریبان کھینچا۔

'میرے تو ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں ناں'

اطہر نے مجھے دھکا دیا تو میں کرسی سے جا ٹکرائی۔ اب مجھ پر تقریباً ہسٹیریا کا دورہ پڑ چکا تھا۔ میں نے اپنی آواز سنی 'مار دو مجھے، جان سے مار دو، یہی کسر رہ گئی ہے'۔

'میں کیوں مار دوں، خود کیوں نہیں مر جاتیں۔ بہت سی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں، زہر کھا لیتی ہیں، کلائیاں کاٹ لیتی ہیں، مرنے کا شوق ہے تو

وہ راستہ اختیار کروٗ یہ میرا شوہر بول رہا تھا۔
'میں حرام موت گلے لگالوں، مرجاؤں گی لیکن خود کشی کبھی نہ کروں گی۔خود کشی نہ صرف حرام ہے بلکہ میرے نزدیک بزدلی کی سب سے نچلی منزل ہے، اور میں بزدل نہیں ہوں' میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی لیکن اطہر باہر جاچکا تھا۔
اس دن شام میں حمیرا کے والدین ہیوسٹن سے نیویارک پہنچے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا، لیکن اب مرض لاعلاج پایا۔تمام حالات کی تفصیل جان کرانہوں نے سمیرا کو طلاق کی اجازت دے دی۔
آج طلاق کو تین دن ہو چکے تھے۔
ان تین دنوں میں پچھلے تین سال کئی بار سمیرا کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔اپنے رویے اور ذمہ داریوں کا محاسبہ۔شاید یوں ہوتا تو یوں رہتا۔ میں یہ کرتی تو وہ یہ کرتا وغیرہ۔لیکن پچھلے تین سال خاص کر پچھلا ایک سال ایک ایسا جہنم تھا کہ سمیرا کے ذہن میں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔اس سے پہلے کہ رستہ زخم ناسور بن کر پورے بدن میں زہر پھیلا دے، بہتر ہے کہ عملِ جراحی سے عضو ہی کاٹ دیا جائے۔نیویارک اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔والدین کے اصرار کے باوجود وہ ہیوسٹن واپس جانے کو تیار نہ تھی، جہاں اس کے بچپن کے سارے دوست اسے نیویارک رخصت کر چکے تھے۔ہیوسٹن واپسی گویا ناکامی کا اعتراف ہوتی۔وہ سرِ عام اپنے جاننے والوں کے درمیان اعترافِ ناکامی کا حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔
سمیرا نے اسکول سے چھ ماہ کی رخصت لی اور پاکستان جا کر پڑھانے کی ٹھانی۔منظر میں تبدیلی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ والدین کے سمجھانے کے باوجود وہ کراچی چلی آئی۔کراچی اس کے لئے اجنبی نہیں تھا، والدین یہیں سے امریکہ گئے تھے، اور سمیرا تقریباً ہر سال یہاں آتی رہتی تھی۔ سمیرا نے کراچی میں کئی جگہ پڑھانے کے لئے درخواست ڈالی تو بہت اچھا اور حوصلہ افزا جواب ملا۔کئی جگہ انٹرویو میں شریک ہوئی۔
'یہ بتایئے نیویارک چھوڑ کر آپ یہاں کیوں پڑھانا چاہتی ہیں'
'بس منظر کی تبدیلی کی خواہش یہاں کھینچ لائی۔پھر یہ کہ جو کچھ وہاں سیکھا ہے وہ یہاں اپنے لوگوں کو لوٹا سکوں تو کتنا اچھا ہے'۔
'آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں'
'جی میں اکیلی ہوں۔دراصل میری شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے' ہر انٹرویو میں یہ سوال جواب ضرور ہوتا۔اسے اچانک امریکہ یاد آتا کہ جہاں انٹرویو میں یہ سوال غیر قانونی ہوتا۔
'اوہ!'
'کیوں کوئی مسئلہ ہے کیا' پہلے انٹرویو میں اس اوہ سے وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔
'نہیں یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔میرا مطلب ہے آپ کو کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں، بندھن نہیں ہیں تو آپ دل لگا کر کام کر سکتی ہیں'۔
نہ جانے کیوں سمیرا کو فوراً نوکری مل جاتی۔لیکن پاکستان میں تین ماہ قیام میں اس نے چار نوکریاں بدلیں۔
'سمیرا بیٹا کیسا چل رہا ہے تمھارا کام' ایک دن امی فون پر پوچھ بیٹھیں۔
'امی کام تو ٹھیک ہے لیکن میرے خیال میں یہ تجربہ ناکام رہے گا۔ اور مجھے واپس نیویارک جانا پڑے گا' میں امی سے ہمیشہ بہت قریب رہی تھی۔
'کیوں بیٹی کیا پیسے کم ہیں، میں تمھارے ابو سے کہوں بھیج دیں؟'
'امی پیسوں کی بات نہیں، اب مجھے طلاق شدہ اور اکیلا سمجھ کر سب کے رویئے بدل جاتے ہیں'۔میں امی سے تفصیل بیان نہ کر سکی، لیکن مجھے یقین تھا وہ سمجھ جائیں گی۔
'کیا مطلب سمیرا' پھر بھی انہوں نے سوال کر ہی ڈالا۔بعض جملے سن کر اور اہم ہو جاتے ہیں۔
'ارے امی چند ہی دنوں میں میرے ساتھی مرد اساتذہ، اکاؤنٹنٹ سب ہی لگتا ہے میرے لباس کے پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔لگتا ہے یہاں کوئی اپنی بیوی سے خوش نہیں۔دوسری نہیں تو تیسری ملاقات میں ضرور اپنی ناکام ازدواجی زندگی کا قصہ لے بیٹھتے ہیں۔
'سمیرا یہ تو بہت کوفت کی بات ہے'۔
'ہاں امی کوفت تو ہے۔پھر یہ کہ جس کا بڑھتا ہاتھ جھٹک دو وہ اسے توہین گردانتا ہے اور اوچھی حرکتوں پر اتر آتا ہے'۔شکر ہے امی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔
'بیٹی تم اسکول بدل کر دیکھو'
'امی میں تین اسکول بدل چکی ہوں۔اس معاشرے میں مطلقہ کے لئے اکیلے رہنا ممکن نہیں۔آزادیٔ نسواں ابھی یہاں کی ڈکشن میں نہیں آئی، امی گذارا ہونا مشکل ہے'۔میرے لہجے کی مایوسی امی سے نہ چھپ سکی۔' اور امی ساتھی اساتذہ ہی کیا، کچھ بچوں کے تو باپ بھی اکثر چلے آرہے ہوتے ہیں۔سب کا خیال ہے امریکہ پلٹ مطلقہ ہے۔ایک زمیندار صاحب جن کا بچہ میری کلاس میں ہے وہ مجھے ڈیفنس میں ایک اپارٹمنٹ میں سیٹ کرانے کی پیشکش بھی کر چکے ہیں' اب میں باقاعدہ رو پڑی۔
'رو نہیں بیٹا، واپس آجاؤ، یہاں ہم سب ہیں'۔امی کی آواز بھی گلوگیر ہوگئی۔
'امی ان لوگوں نے مجھے اپنی نظر میں گرا دیا ہے، کیا میں اتنی آسان، اتنی مہیا، اتنی frustrated لگتی ہوں؟'
سمیرا نے کوشش کی کہ کسی طرح جم سکے، لیکن جب ہر جگہ ایک ہی

سا ماحول دیکھا تو امریکہ واپسی کی ٹھان لی۔ ہیوسٹن جانے کے لئے اب بھی تیار نہ تھی۔ ان تین سالوں میں اطہر کی ریزیڈنسی ختم ہو چکی تھی اور وہ شکاگو جا کر بس گیا تھا۔ سمیرا کے نیویارک میں بہت دوست تھے۔ اسے نیویارک ہر حال میں ایک اچھا انتخاب لگا۔ اپنے پرانے اسکول فون کیا تو انہوں نے اب تک اس کی جگہ کوئی دوسری استانی نہیں رکھی تھی، یوں سمیرا واپس کراچی سے نیویارک آ گئی۔ یہاں تابندہ کے علاوہ سمیرا کی بہترین دوستیں حنا اور دیبا سب ہی تو تھے۔

ایک ہی دن آرام کے بعد سمیرا واپس اسکول گئی تو لگا جیسے اپنے گھر آ گئی۔ ساتھی اساتذہ نے کھل کر اس کا استقبال کیا۔

میں نے سب سے پہلے تابندہ کو فون کیا۔ تابندہ اور اس کے شوہر، زین، دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور شام مجھے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میری شرط وہی تھی کہ اپنے کتے کو باندھ کے رکھنا۔

'ارے پاگل، کتے سے اچھا ساتھی کوئی نہیں، چاہے زین سے پوچھ لو' تابندہ شوخی سے بولی۔

'ہاں بھئی مجھ سے زیادہ تو یہ doggy اس سے قریب ہے' زین بھی ہنس دیا۔ 'اچھا ہوا تم آ گئیں، میں نے پہلے ہی کہا تھا پاکستان مت جاؤ' تابندہ مجھ پر برس پڑی۔

'چلو بھئی صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا' زین نے بیچ بچاؤ کرایا۔

'ہاں بھئی ایک اور ڈراؤنہ خواب ختم ہوا۔ فی الحال تو میں اسکول ہی میں مہمان اساتذہ کے کمرہ میں رہ رہی ہوں، لیکن اپارٹمنٹ ڈھونڈنا ہے'۔

'ارے تو جب تک یہاں چلی آؤ' زین نے خلوص سے کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کا جملہ ختم ہوتا، تابندہ نے درمیان میں اچک لیا۔

'ہاں سمیرا ضرور، لیکن اصل میں امی آ رہی ہیں، تمھی کو تکلیف ہو گی'۔

'ارے نہیں بھئی میرا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ تم لوگوں کو تکلیف دوں۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔ 'بس زین بھائی مدد کر دو اپارٹمنٹ دیکھنے میں'

'ہاں. ہاں یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے، میں ضرور تمھاری مدد کر دوں گا' سمیرا کو لگا تابندہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

دوسرے دن زین اسے کچھ اپارٹمنٹ دکھانے لے گیا۔ بلکہ اس کام کے لئے زین کو دو تین بار سمیرا کو لے کر جانا پڑا۔ سمیرا نے ابھی تک کار نہیں خریدی تھی۔ بس اور ٹیکسی سے کام چل رہا تھا۔

دیبا کو معلوم ہوا کہ سمیرا آ گئی ہے تو اس نے بھی سمیرا کو فون کیا۔ خوب گلے شکوے ہوئے۔ دیبا شام کو ملنے آنے کے لئے تیار تھی۔ سمیرا نے اسے بتایا کی وہ ابھی اسکول کے ہی ایک کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ دیبا کے شوہر سے ملے بھی بہت دن ہو گے تھے۔ لہذا میں آ جاتی ہوں تمھارے گھر، اپنے شوہر سے کہو مجھے اسکول سے لے لیں، ابھی تک میرے پاس کار بھی نہیں'۔

'مسعود تو آج کل بہت دیر سے آ رہے ہیں سمیرا۔ چلو تم آ تو گئی ہو، کسی دن ملاقات بھی ہو جائے گی'۔ دیبا نے یہ کہہ کر اتنی جلدی فون بند کیا کہ میرے انٹینا ملے جلے پیغامات دینے لگے۔

پھر اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ سمیرا کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ اس کی دوستوں کے شوہر تو اس کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں، لیکن اس کی دوست اسے گھر بلانے سے خائف ہیں۔ حالانکہ کسی دوست کے شوہر نے کبھی کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ لیکن اسکی دوستوں کے فون آنا تقریباً بند ہو گئے چہ جائیکہ یہ پوچھنا کہ کوئی ضرورت یا کام تو نہیں۔

سمیرا کی دوست حنا بھی سمیرا کی کشتی میں ہی سوار تھی۔ اس کے شوہر کا بہت نوجوانی ہی میں ایک ٹریفک کے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ حنا ایک کامیٹکس کمپنی میں ملازم تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد ابھی تک دور دور کسی دوسرے مرد کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ سمیرا کچھ دن کے لئے، حنا کے ساتھ ہی اس کے اپارٹمنٹ میں رہنے لگی۔

'مجھے لگتا ہے میں نے اپنی سہیلیوں کو بہت استعمال کیا ہے' میں نے پاؤں صوفے پر سمیٹتے ہوئے وہ موضوع چھیڑا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا۔

'کیوں بھئی، ایسا کیا کام لے لیا تم نے ان سے' حنا ٹی وی کے ریموٹ سے چینل بدل رہی تھی۔ شام کا وقت تھا، ہم دونوں چائے کے ساتھ ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔

'پتہ نہیں، انہوں نے مجھے اپنی انجمن سے بالکل کاٹ دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے بعض تو میری اپنے گھر آمد و رفت پسند نہیں کرتیں' میں اصل موضوع پر آ گئی۔

'ہوں' حنا کا ہنکارہ معنی خیز تھا۔

'ہوں کیا، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم میں نے کیا کیا ہے' میں نے اس سے مشورہ مانگا۔

'تم نے یہ کیا ہے کہ تم مطلقہ ہو گئی ہو'۔

'مطلقہ ہو گئی ہوں تو کیا۔ میں نے کسی سے مالی مدد نہیں مانگی۔ پھر سب دوستوں کو پتہ ہے میں نے کتنی کوشش کی تھی اپنی شادی بچانے کی لیکن تعلقات ایسے نہیں رہے تھے کہ شادی بچ سکتی'۔ میں نے اپنا دفاع کیا۔

'بات بار بار بننے کی نہیں ہے، تمھیں ابھی طلاق کو ایک سال سے بھی کم ہوا ہے، اور وہ بھی پہلے چار چھ ماہ تم نے پاکستان میں جھک ماری۔ میں چار سال پہلے بیوہ ہونے کے بعد اس عذاب سے گذر چکی ہوں۔ ہماری طرف کی سب خواتین ہم سے خوف زدہ رہتی ہیں کہ کہیں ہم ان کے شوہر پر ڈورے نہ ڈال دیں۔ اس لئے وہ اپنے گھر میں ہمارا داخلہ پسند نہیں کرتیں'۔

'واقعی؟ یہ میری قریبی سہیلیاں جو میری بہنوں کی طرح ہیں، سمجھتی ہیں کہ میں ان کا شوہر چھین لوں گی' میرے لہجے میں دکھ، کرب، شکست اور

بقیہ: اِسکی سالگرہ

زمانے بھر کی حیرت تھی۔

'مطلقہ یا بیوہ عورت کا عذاب اب مغرب و مشرق دونوں میں ایک جیسا ہے۔ وہاں یہ کہ ہر آدمی ترنوالہ سمجھتا ہے یہاں یہ کہ ان کی بیویاں ڈکیت سمجھتی ہیں'۔

' ایسا کیسے ہوسکتا ہے حنا، تمھیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی، تو ہم کہاں جائیں'

' کہیں نہیں، بہت پھونک پھونک کر، بہت احتیاط سے اسی معاشرے میں اپنی جنگ جیتیں۔ ہر قدم، ہر جملے، ہر سانس سے پہلے یہ شعوری جانچ کریں کہ اس کا کوئی غلط مطلب تو نہیں نکل سکتا' حنا بھی اداس ہوگئی۔

'میں نہیں مان سکتی، تابندہ میری بچپن کی دوست ہے؟'

دوسرے دن میں نے سوچا تابندہ سے براہ راست بات کروں۔ آخر پچھلے اٹھائیس سال سے دانت کاٹنے کی دوستی ہے۔ تابندہ کیسے اس پر شبہ کر سکتی ہے۔ بغیر بتائے میں تابندہ کے گھر جا پہنچی۔ جوش اور جذبے میں کتے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ملا۔ میں اندر داخل ہوئی تو تابندہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

' دیبا ذرا احتیاط سے۔ میں نے تو سمیرا کو بالکل کاٹ دیا ہے۔ تم بھی زیادہ اسے گھر میں نہ گھساؤ'

'ہاں یہ صحیح ہے' دوسری طرف سے غالباً یہی کہا گیا ہوگا جبھی تو تابندہ بولی:

'زیادہ تر اس کے اپارٹمنٹ جا کر مل لیا کرو۔ دیبا دیکھو اگر مزاج اچھا ہوتا تو طلاق کیوں ہوتی۔ ہمیں تو وہی پتہ ہے ناں جو سمیرا نے بتایا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ مجھے تو اطہر بھائی اچھے خاصے معقول آدمی لگتے تھے۔ نہیں بھئی میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ بچپن کی دوستی اپنی جگہ، خطرے سے دور رہو اور اس کا سد باب کرو۔ بلی سے کہوں دودھ کی رکھوالی کرے' تابندہ نے ہنس کر فون پر کہا۔

میں اس سے زیادہ نہ سن سکی۔ الٹے پاؤں واپس باہر نکل آئی۔

جب اطہر نے طلاق دی تھی تو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اجنبی تھا، معاملہ نہ نبھ سکا۔ مگر آج بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ آج جب اپنوں نے طلاق دی تو اپنی ذات بہت برہنہ، تنہا اور چھوٹی لگی۔

اس ٹوٹے دل کے ساتھ میں ٹیکسی کرنا بھی بھول گئی اور پیدل ہی گھر کی جانب گھسٹتی رہی۔ راستے میں ایک جانوروں کا شیلٹر نظر آیا تو قدم خود بخود اس کی جانب چل پڑے۔

'سنیں میں کوئی کتا پالنا چاہتی ہوں' مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگی۔

☆

گرین کارڈ نہیں ہے، البتہ سوشل سیکیورٹی نمبر ضرور ہے، اور، آپ کو یاد ہوگا، جب آپ دوسرے پاکستانی دوستوں کی انکم ٹیکس کی سالانہ سٹیٹمنٹ بھرنے میں ان کی مدد کرتے تھے، تو میری سٹیٹمنٹ بھی تو بھرتے تھے۔''

''کیا فرق پڑتا ہے...'' میں نے کہا۔ ''اسکی بیٹے کی اپنی مرضی ہو گی، وہ کس کے ساتھ رہے...لیکن ڈیبی اب کس کے ساتھ رہنے کو چلی گئی ہے؟ کون ہے وہ اس کا بوائے فرینڈ؟''

وہ گم صم کھڑا رہا، پھر بولا۔ ''کہتی تھی، والٹر سے اسے پیار ہے، لیکن والٹر سیکس کر سکتا ہے، بچہ پیدا نہیں کر سکتا۔'' پھر ایک لحظہ رک کر وہ ٹھیٹھ پنجابی میں بولا، ''مرد تاں ضرور اے، پر فیر وی کُھسرے دا کُھسرا ای اے۔''

''تو....؟'' میں نے نشتر کو پھوڑے میں پوری طرح اتار دیا۔

''ڈیبی کہتی تھی اسے بچہ ضرور چاہیے تھا۔ اب بچے کے لیے سڑک پر آنے جانے والے کسی مرد سے بھیک تو نہیں مانگی جا سکتی۔ اسے بچے کے باپ سے پیار ہونا چاہیے۔ کہتی تھی، بچہ ایسا ہو جو دو پیار کرنے والوں کی اولاد ہو، جیسے میری اور ڈیبی کی اولاد!''

اتنا کہتے ہی وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ پھر اس کی سسکیاں بند ہو گئیں اور وہ چپ چاپ کھڑا رونے لگا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اس کے شیو سے بڑھے ہوئے گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے اسے رونے دیا کیوں کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ روح کی اس آگ کا علاج لہو کے آنسوؤں کی برسات سے بھی ممکن نہیں، لیکن کچھ دیر کے لیے ٹھنڈک تو پڑ سکتی ہے۔

آس پاس کے لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے تو میں نے کہا، ''ڈیبی کو اس کا بیٹا مل گیا، لیکن وہ یہ بیٹا اکیلی تو نہیں پیدا کر سکتی تھی! وہ تمہارا بھی بیٹا ہے۔ والٹر کے گھر میں پلے گا تو اس کی پرورش پرداخت بہتر ہوگی۔ اور پھر ڈیبی چال چلن کی بری نہیں تھی، یہ تو تم بھی جانتے ہو۔ تمہارے اس کی کا بھلے چنگے گھر میں، اچھے ماحول میں، بچپن گذرے گا۔ وہ اچھے اسکولوں میں جائے گا...اور بڑا ہوتے ہی شاید تمہارے پاس آجائے!''

یکا یک اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خود قطار سے باہر ہو گیا۔ ''یہ باتیں تو، پروفیسر صاحب جی، مجھے پتہ ہی نہیں تھیں۔ ان پڑھ ہوں نا! چوتھی جماعت تک اردو پڑھا ہوں...سوچ ہی نہیں سکتا تھا...اگر آج آپ نہ ملتے اور شام تک ڈیبی اسکی بیٹے کو لے کر یہاں نہ آتی تو شاید میں...شاید میں...پوٹامک دریا میں کود جاتا.....آیئے، پیراغیب چلتے ہیں، گلیب روڈ پر انڈیا کباب ہاؤس میں۔ میں جب وہاں باورچی تھا تو سارے دوست گلیب روڈ کے اس علاقے کو پیراغیب محلّہ کہتے تھے۔ چلیئے، جا کر بیٹھیں گے۔ کباب کھائیں گے۔ بیئر پئیں گے، اور اس طرح اسکی بیٹے کی سالگرہ منائیں گے۔''

جب ہم انڈر گراؤنڈ میٹرو ریل کے 'لا فاں' اسٹیشن سے گلیب روڈ کے لیے گاڑی میں بیٹھے تو وہ بے حد خوش تھا!

گل بہشت

نقشبند قمر نقوی بھوپالی

(ٹلسا' امریکہ)

سلطان علاؤ الدین خلجی کا لشکر جرار ''جالور'' کی طرف گامزن تھا۔

''جالور'' کا راجہ کنر دیو ویسے تو ایک بار دہلی حاضر ہو کر سلطان کو اپنی وفاداری اور تابعداری کا یقین دلا چکا تھا، خراج بھی دیا تھا اور ہر سال نذرانہ ارسال کرنے کا عہد بھی کیا تھا، لیکن جالور واپس پہنچ کر اس نے علاؤ الدین کے بارے میں خرافات بکنا شروع کر دیا' اس کا خیال تھا سلطان کی طاقت اتنی نہیں جس کا شہرہ کر دیا گیا ہے، وہ کہتا:

''اگر سلطان نے جالور کا رخ کیا تو اس کے دانت کھٹے کر دوں گا..... میرے سامنے اس کی فوجی اہلیت بے حقیت ہے''

وہ کہتا.....

''راجے اس سے بے سبب خائف ہو گئے ہیں''

سلطان کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کنر دیو کو ایک تادیبی خط لکھا' اور ہوش میں رہنے کا مشورہ دیا۔ کنر دیو نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی یہ خاموشی یقیناً مخالفت کی عکاسی کرتی تھی' چنانچہ سلطان نے اس کی گوش مالی کے لیے ایک لشکر جالور روانہ کیا۔

اس لشکر میں سلطان کے متعدد جنگ آزما' تجربہ کار اور آزمودہ جنرل بھی شامل تھے۔

اور.....اس لشکر کی قیادت.....سلطان کی ایک کنیز.....گل بہشت .....کر رہی تھی۔ وہ جنگ کا لباس' زرّہ بکتر اور جوشن پہن کر ہاتھی پر سوار ہوتی' اور لشکر کی قیادت کرتی تھی' وہ ایک ماہر شمشیر زن' اعلیٰ نشانے کی تیر انداز اور بہت جری سالار لشکر تھی۔ جنگ کے دوران وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتی اور لشکر کی رہنمائی کرتی تھی۔

اس سے پہلے بھی ''گل بہشت'' کئی چھوٹی مہمات کی قیادت کر چکی تھی' اور اس کی جنگی لیاقت کے سبھی معترف ہو چکے تھے دو مہمات میں علاؤ الدین کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر اپنی صلاحیت' اصابت رائے اور میدان جنگ میں جرأت کے مظاہرے کر چکی تھی اور اس کی قابلیت کے سبھی قائل تھے، اس میں ایسی خوبیاں تھیں جو عموماً مرد قائدین میں بھی کم ہوتی ہیں۔

سلطان علاؤ الدین خلجی' ہندوستان کے سارے شمالی علاقے کا بادشاہ تھا۔

اس نے مالوہ اور چتوڑ بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے تھے۔ درہ خیبر سے لکھنوتی تک اس کی عظمت و شان کا مدح خواں تھا' اس کی عسکری طاقت کا برصغیر میں کوئی مقابل نہیں رہا تھا۔

اس کی دولت بے انتہا تھی' جو اس نے کئی مہمات میں کامیابی کے بعد حاصل کی تھی خصوصاً اس کی وہ ڈرامائی مہم جس میں اس نے صرف پانچ ہزار سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل فوج ساتھ لیکر وسط ہند کے ناقابل گذار جنگلوں' پہاڑوں' دریاؤں اور دشواریوں کو پامال کر کے دیوگڈھی پر حملہ اور اس کو فتح کر لیا۔

دیوگڈھی سے اس کو اشرفیوں کا اتنا ذخیرہ اور اس کثرت سے مالِ غنیمت دستیاب ہوا کہ وہ سارا پچاس ہاتھیوں اور گیارہ سو گھوڑوں پر بار کر کے اس کے صدر مقام کڑے میں لایا گیا۔

اسی کے طفیل وہ عوام کے دل جیتنے میں کامیاب ہوا تھا۔

جب وہ پہلی بار کڑے سے دہلی کی لئے روانہ ہوا تو اس کے جلوس میں ایک ہاتھی پر ایک منجنیق بار کی گئی ساتھ کئی بڑے تھیلوں میں خالص سونے کی اشرفیاں بھر کر رکھی گئیں۔ سلطان دن کے وقت جدھر سے گذرتا اطراف کے عوام اس کو دیکھنے کے لیے راستوں کے گرد جمع ہوتے اور اس کے جاہ و حشم سے مرعوب ہوتے' علاؤ الدین کے حکم سے منجنیق میں اشرفیاں بھر کر لوگوں پر پھینکی جاتیں' لوگ ان کو لوٹ لیتے اور مالا مال ہو جاتے۔

اس کی اس فیاضی کی جیسے جیسے خبر پھیلتی' لوگ جوق در جوق اس کے راستے پر جمع ہوتے اور اشرفیاں لوٹتے اور اس کی فیاضی کی تعریف کرتے۔ اس نے سارے سفر کے دوران اسی طرح اشرفیاں لٹائیں۔

دہلی پہونچنے تک وہ سارے ہندوستان میں فیاض اور مہربان مشہور ہو چکا تھا۔ اور وہ مخالفین دہلی اس کا آنا گوارا نہیں کرتے تھے' اس کی معترف اور طرفدار ہو گئے۔

جس زمانے میں علاؤ الدین کڑے کا حاکم تھا' ایک روز اس کے سامنے ایرانی اور افغانی غلام اور کنیزیں پیش کی گئیں جنہیں ایک افغانی تاجر فروخت کرنے لایا تھا۔ علاؤ الدین نے ان میں کئی غلام اور کنیزیں خریدیں' انہیں میں اس کو ایک غیر معمولی طور پر حسین دوشیزہ نظر آئی' علاؤ الدین اس کے حسن کے سحر سے ایسا مسحور ہوا کہ اس کو اپنی خاص خدمت پر مامور کر لیا۔

گل بہشت' بلند قامت' سفید رنگ' نہایت ملیح' سیاہ زلفوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والی ایک ایسی دلکش شخصیت کی لڑکی تھی جس کو دیکھتے ہی آدمی مرعوب ہو جاتا' اس کے انداز میں ایک خاص تحکم' ایک رعب داب اور متانت تھی

جو کسی کو اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی' سلطان کے درباری گل بہشت سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے' اس کا احترام کرتے تھے اور اس کی شرافت اور متانت کے معترف تھے۔

علاؤ الدین نے گل بہشت کی قابلیت اور امور اداری کی اہلیت دیکھتے ہوئے اسے قصر سلطانی کے سارے خدام کا سربراہ مقرر کر دیا' اور جب وہ اس کام میں غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دے کر کامیاب ہو چکی تو سلطان نے اسکی شمشیر زنی اور تیر اندازی کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک فوجی دستے کی قیادت سپرد کی۔

اس فوجی دستے نے پنجاب کے ایک قلعے پر حملہ کیا جہاں کا حاکم بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا' گل بہشت نے اس مہم میں ایسی غیر معمولی شجاعت اور قیادت کا مظاہرہ کیا کہ قلعہ فتح کرنے اور باغی سردار کو گرفتار کرنے کے بعد فوج واپس دہلی آئی تو سارے افسران فوج گل بہشت کے کارناموں کے گیت گا رہے تھے' علاؤ الدین اس سے بہت خوش ہوا اور گل بہشت کو دس ہزار فوج کا سالار مقرر کیا اور اس کے عہدے میں خصوصی ترقی اور انعامات سے نوازا۔

چتوڑ پر حملے کے دوران گل بہشت علاؤ الدین کے لشکر کی میسرہ کی قائد تھی۔ اس کی سربراہی میں میسرہ نے ہی چتوڑ کی فصیل پر چڑھ کر حملہ کیا' گل بہشت بھی ان کے ساتھ دیوار پر چڑھ کر قلعے میں اتری اور ایک نہایت خوں ریز جنگ کے بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا اور علاؤ الدین کا لشکر یلغار کرتا ہوا داخل قلعہ ہو گیا۔

اس مہم میں بھی کامیابی کا سہرا گل بہشت کے سر رہا۔

گل بہشت' ہندوستان کے سلاطین کے دور میں پہلی وہ عظیم خاتون تھی جس کو لشکروں کی سربراہی اور سالاری کا اعزاز نصیب ہوا۔ وہ جس مہم میں حصہ لیتی وہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچتی۔ اور ہر مہم میں اس کی ذاتی شرکت کا بڑا حصہ ہوتا۔ جس موقعے پر وہ دیکھتی دشمن کا ہجوم زیادہ ہے وہاں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھس پڑتی اور دشمن کو مار بھگاتی۔ اس کی تیغ زنی کے سامنے اچھے اچھے سورما پسپا ہو جاتے اس کے کارنامے اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ وہ جدھر رخ کرتی ادھر سے فوجی ایسے ہٹ جاتے جیسے پانی پر کائی پھٹتی ہے۔

وہ سارے لشکر کے ساتھ ہوتی' اس کے فوجی محسوس کرتے جیسے وہ ہر جگہ ان کے ہمراہ لڑ رہی ہے' اس کی جرأت اور تیغ زنی کی ایسی شہرت تھی کہ اس کے فوجی اس کو مشورہ دیتے کہ وہ خود اس بے جگری کے ساتھ دشمن کی صفوں میں نہ گھسے' لیکن وہ ان سے کہتی:

''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم لوگ اپنا خون پسینہ ایک کرو اور میں ہاتھی پر بیٹھ کر تماشا دیکھوں میں تمہارے ساتھ ہوں' جہاں تمہارا خون گرے گا' اس میں میرے خون کے قطرے بھی شامل ہوں گے.....''

فوجی اس کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اس کو مخاطب کرتے وقت تعظیماً خم ہوتے اور اس کو ''خاتون سالار'' کے لقب سے مخاطب کرتے۔ اس کے ساتھ افسران فوج' اس سے جنگی امور کے بارے میں مشورہ کرتے اور ہر موقعے پر اس کے فیصلے اور رائے سے متفق ہوتے۔ اس کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی تھی۔

جنگ کے دوران وہ گھوڑے پر سوار ہوتی، ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال کی جگہ ایک چھوٹا نیزہ ہوتا وہ اپنی طرف آنے والے تیر اس نیزے سے کاٹ دیتی تھی یا ان کو توڑ دیتی تھی۔ لڑائی میں اس کے ساتھ سر بازوں کا ایک چھوٹا دستہ ہوتا جہاں اسے نظر آتا کہ دشمن نے اس کے فوجیوں کو گھیر لیا ہے وہاں وہ قیامت بن کر گرتی اور ایسا سخت حملہ کرتی کہ دشمن کو فرار کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا۔

علاؤ الدین کو اس پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اس نے گل بہشت کو امیر الامرا کا خطاب دیا اور اپنے مشاوروں میں شامل کر لیا۔

جالور کی مہم کی سپہ سالار گل بہشت تھی۔

اس کے ماتحت تیس ہزار جنگجو تھے' جن میں متعدد امیر' کئی معروف جنرل اور متعدد تجربہ کار افسران فوج شامل تھے۔ وہ سارے ہی گل بہشت کے کارنامے دیکھ یا سن چکے تھے' دہلی سے جالور تک کے سفر کے دوران وہ تقریباً روزانہ اپنے سارے عمائدین کو جمع کر کے ان سے گفتگو کرتی اور جنگ کے بارے میں ضروری ہدایات دیتی رہتی تھی۔

گل بہشت اس قدر بارعب اور متین شخصیت کی مالک تھی کہ بڑے سے بڑا امیر بھی اس سے گستاخانہ بات کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ جب وہ ہدایات دیتی تو سب اس کی بات توجہ سے سنتے اور حیران ہو جاتے اس لئے کہ وہ حالات اور مقامات کا ایسے عجیب اور ماہرانہ انداز سے تجزیہ کرتی کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے۔

اس نے جالور پہنچنے سے پہلے ہی سارے لشکر کو ایسی خوبی کے ساتھ منظم کر دیا کہ پوری فوج ایک سیسہ پلائی دیوار جیسی ہو گئی اور قلعہ پر حملے کا ایسا نقشہ مرتب کیا جس کا پہلے کسی نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔

گل بہشت ایک فطری فوجی قائد تھی۔ جس کی جنگی صلاحتیں بہت غیر معمولی تھیں۔

اس نے اپنے افسروں کی حملے کے دوران جگہیں بھی مقرر کر دیں اور ان کو حسب ضرورت پسپا ہونے یا پیش قدمی کرنے کے قرینے' وقت اور ضروریات سے بھی مطلع کر دیا' ان سب افسروں اور امرا نے بعد میں علاؤ الدین کو بتایا کہ گل بہشت نے جنگ کی ایک جدید ترین ترتیب اور حملے کا طریقہ ایجاد کر کے انھیں حیرت زدہ کر دیا۔

وہ ہندوستان کی پہلی فوجی جنرل خاتون تھی!

لشکر سے سلطان کا رابطہ مسلسل تھا روانہ منزل بہ منزل اور مرحلہ بہ مرحلہ خبریں سلطان کو بھیجی جاتیں اور اگر جواب کی ضرورت ہوتی تو سلطان فوری

جواب دیتا۔ روزانہ دو تین قاصد اِدھر سے اُدھر آتے جاتے تھے۔

جالور کا قلعہ بہت مضبوط اور سامان رسد سے بھرا ہوا تھا۔

کنر دیو نے جب دہلی کی فوج کے بارے خبر سنی تو وہ چونکا ضرور لیکن جب اس کو بتایا گیا فوج کی قیادت ایک جوان لڑکی کر رہی ہے تو وہ ہنسا.....

''میرے مقابلے کے لئے سلطان نے ایک جوان لڑکی کو سالار بنا کر بھیجا ہے..... یہ میری توہین ہے''

''راجہ حضور..... وہ بہت تجربہ کار اور مشہور فوجی سردار ہے.....'' افسران نے کہا

''میں اس کو چیونٹی کی طرح مسل دوں گا..... تم لوگ تیاری کرو..... میں اس لشکر کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا.....''

وہ محض شیخی خورہ تھا!

''دھیر کو حاضر کرو.....'' اس نے حکم دیا

دھیر اس کا ایک بہتر معتبر اور معروف تیرانداز تھا۔ وہ اڑتی چڑیا کو تیر سے مار لیتا تھا۔ اس کو راجہ نے حکم دیا کہ جنگ کی حالت میں وہ تاک میں رہے جب بھی اس کو موقع ملے وہ گل بہشت کو تیر کا نشانہ بنا دے۔ اس کام کے لیے راجہ نے اس کو ایک گاؤں انعام میں دینے کا وعدہ کیا۔

جنگ کا آغاز ہوا۔ گل بہشت نے اپنی فوج کو جس طرح منظم کیا تھا اس کے پیش نظر راجہ کا لشکر ذرا دیر میں ہی روبہ فرار ہو گیا۔ بھاگنے والوں میں سب سے آگے خود راجہ تھا۔ اس نے قلعے میں گھس کر دروازے بند کر لئے' اس کے فوجی باہر رہ گئے تھے اس نے ان کا ذکر بھی نہیں کیا' انہیں گل بہشت کی فوج نے تہہ تیغ کیا۔

قلعے پر حملہ ہوا' فصیلیں ٹوٹنے لگیں اور گل بہشت کے فوجی اندر داخل ہونے لگے۔ راجہ کے فوجی بھاگنے کا راستہ ہی ڈھونڈتے رہ گئے اور گل بہشت قلعے میں گھس کر راجہ کے محل تک پہنچ گئی۔

دھیر..... شروع جنگ سے ہی گل بہشت کی تاک میں تھا وہ ایک ستون کی آڑ سے گل بہشت کو دیکھ رہا تھا۔ محل کے بڑے پھاٹک کے پاس گل بہشت گھوڑے سے اتری اور تلوار و نیزہ ہاتھوں میں سنبھالے اندر جانے کے لیے بڑھی' اسی وقت دھیر نے تاک کر تیر چلایا جو سیدھا گل بہشت کے سینے پر لگا' فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے تیر سینے کے پار ہو گیا۔

لیکن اس نے گرنے سے پہلے بڑھ کر دھیر پر وار کیا اور اس کی گردن اڑا دی دوسرے لمحے وہ خود بھی تیورا کر گری اس کے امرا و افسر دوڑ پڑے' اس کو اٹھا کر ایک مناسب جگہ لٹایا' اور اس کا طبیب حاضر ہو کر تدبیر کرنے کی فکر میں تھا کہ گل بہشت نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ہندوستان کی پہلی تیغ زن سپہ سالار خاتون کی زندگی اتنی ہی تھی۔

''باہر چلئے''

گھر میں بیٹھوں تو ہوا کہتی ہے باہر چلئے
کچھ زیادہ نہیں دس بیس قدم بھر چلئے!

کتنے ہی کرب میں لیٹے ہیں گھروں میں انساں
آ کہ ان درد رسیدوں کے بہم گھر چلئے!

روح پر زخم نہ لگ جائیں فراموشی کے
شب گزیدوں پہ مروّت کی نظر کر چلئے!

رُخ سوئے شہرِ تمنا ہے، مگر سوچتے ہیں
کم ہی جب اتنے مراسم ہیں تو کیوں کر چلئے!

اور کچھ بس میں نہیں قبر میں سونے والے
یہی سوچا کہ کوئی پھول یہاں دھر چلئے!

جان پیاری ہی سہی، اس کی حفاظت لازم
اس کو منظور یہی ہے تو چلو مر چلئے!

ہم کلامی کے روادار نہیں ہم راہی،
اس پہ تاکید ہے شاہدؔ کہ برابر چلئے!

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

ہڑتال

ڈاکٹر احسان احمد شیخ

(اسلام آباد)

''کہاں مرگئی تھی؟'' ابھی راجی کا ایک پیر کٹیا کے اندر تھا اور ایک باہر کہ رمجو غصے سے دھاڑا۔

''تجھے پتہ نہیں میرے گھر آنے کا ٹیم کیا ہے؟''

''اوہو۔ آہستہ بول۔ کیا ہوگیا ہے تجھے''

راجی نے جھک کر ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اندر آتے ہوئے کہا۔ سرکنڈوں اور ٹاٹ کی دیواروں کا پردہ بھی کیا ہوتا ہے سانس بھی لو تو آواز پڑوس میں جاتی ہے۔

''منّے کا جی اچھا نہیں۔ حمیدہ کے گئی تھی''

''کیا ہوا منّے کو؟''

منّے کی بیماری کی خبر سن کر رمجو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے بیڑی کا جلتا سرا ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان دبا کر بجھا دیا اور بقیہ بیڑی دائیں کان میں اُڑس لی۔

''لا دے اسے مجھے''

رمجو نے زمین سے اٹھتے ہوئے موٹے ہاتھ پھیلا دیئے۔

''ٹٹیاں پھر لگ گئی ہیں سویرے سے بخار بھی ہے''

رمجو نے بے چین ہو کر منّے کو بازوؤں میں لے لیا۔ منہ پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ منّے کی آنکھیں بند تھیں۔ جسم گرم تھا اور ناک کے نتھنے سانس کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ راجی سے شادی ہوئے آٹھ سال ہوئے تو منّت مرادوں کا مارا منّا پیدا ہوا تھا اور جب رمجو خوش خوش خیراتی ہسپتال کے زنانہ وارڈ سے منّے کو بازوؤں میں لئے نکل رہا تھا تو ڈاکٹرنی نے اُسے بتایا تھا کہ جو آپریشن راجی کا ہوا تھا اس کے بعد اب وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس وقت تو رمجو کو منّے کی خوشی اتنی تھی کہ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر منّا جب بھی بیمار ہوتا تھا خواہ اسے معمولی زکام ہی کیوں نہ ہو، رمجو کے کان میں ڈاکٹرنی کے الفاظ گونجنے لگتے تھے اور وہ سہم سا جاتا تھا۔

رمجو کو بچوں سے جنون کی حد تک پیار تھا اس وقت سے جب وہ خود بھی بچہ تھا اور گاؤں کے ہر گھر کے بچے کو اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ وہ جب بھی کھلیتا کھیلتا کسی گھر کے سامنے سے گزرتا اندر سے آواز پڑتی۔

''رمجو۔ بیٹا ذرا تھوڑی دیر اسے سنبھال لے میری ہنڈیا جل رہی ہے''

اور رمجو خوشی خوشی اپنا کھیل تماشا بھول کر بچے کو گود لے لیتا۔ اسی کھیل کود میں بچے سے جوان ہوگیا اور ماں باپ کے مرنے کے بعد شہر آ گیا جہاں سبزی منڈی میں مزدوری شروع کر دی۔ کچی بستی میں کٹیا ڈال لی اور یہیں راجی سے دو بول پڑھے گئے۔ شادی ہوتے ہی رمجو کو بچے کی کُھر دلگ گئی مگر بچہ نہ اب ہوتا تھا نہ جب دائیوں کو دکھایا۔ ڈاکٹرنی کے پاس لے گیا۔ سب یہی کہتے تھے سب کچھ ٹھیک ہے بچہ ہو جائے گا۔ دن گزرتے رہے۔ رمجو کٹیا سے نکلتا تو جو بچہ نظر آتا اسے اٹھا کر کاندھوں پر چڑھا لیتا۔ شام کام پر سے آتے ہوئے کوئی نہ کوئی بچہ اپنی کٹیا میں لے آتا۔ اس بات پر کتنی ہی بار پڑوسیوں سے جھگڑا ہوا۔ پھر تو جیسے سب بستی والوں کو پتہ ہی چل گیا کہ جو بچہ کہیں اور نہ ملے وہ رمجو کی کٹیا میں ہوگا۔ راجی یہ سب دیکھ دیکھ کر اندر سے سہمی رہتی۔ اُسے رمجو کا بچوں سے عشق دیکھ کر اپنے آپ سے وحشت ہوتی۔ شادی کو آٹھواں سال لگا تو اُسے شک سا ہوا پھر جب دائی نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو خوشی سے دیوانی ہوگئی یہ سرکنڈوں بانس اور ٹاٹ سے بنی کٹیا اُسے محل سے زیادہ خوبصورت لگنے لگی۔ خدا خدا کر کے منّا آیا تو بالکل پرستان کا شہزادہ لگتا تھا۔

''حمیدہ کے پاس کیا لینے گئی تھی؟''

رمجو کی فکرمندی آواز نے راجی کو چونکا دیا۔

''وہ حمیدہ کی بچی کو جب ٹٹیاں لگی تھیں تو وہ ڈاکٹر سے دوائی لائی تھی اس کا پتہ کرنے گئی تھی''۔

''کیا کہا اس نے؟''

''یہ ایک پڑیا اس کے پاس رہ گئی تھی۔ کہتی ہے چار گلاس پانی میں ملا کر تھوڑا تھوڑا پلائیں''

''تُو لے کر بیٹھ اسے میں بناتا ہوں''

رمجو نے منّے کو راجی کو پکڑایا۔ اور بالٹی سے اندازے سے چار گلاس کے برابر پانی نکال کر چھوٹی ہنڈیا میں ڈال کر چمچے سے دوائی خوب ہلائی اور مٹی کے پیالے میں ڈال کر لے آیا۔ چمچے سے منّے کے منہ میں ڈالنے لگا تو وہ جاگ پڑا اور رونے لگا۔

''تو بتّی بال لے۔ میں پلاتی ہوں''

راجی نے کہا اور رمجو اٹھ کر لالٹین جلانے لگا۔ لالٹین سے پیلی پیلی روشنی نکل کر کٹیا میں پھیلے اندھیرے سے دو دو ہاتھ کرنے لگی۔ مگر رمجو کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ جب بھی منّا بیمار ہوتا تھا اس کا یہی حال ہوتا تھا۔

''کب سے ٹٹیاں کر رہا ہے''

اس نے بجھی بجھی آواز میں پوچھا۔

''سویرے سے ہی''

رمجو سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے تہبند کی گرہ کھول کر نوٹ گنے حالانکہ اسے پتہ تھا پیسے کتنے ہیں۔ کون سا لمبا چوڑا حساب تھا۔ آج دن بھر کی مزدوری کوئی ڈیڑھ سو روپے ہوئی تھی۔ رستے میں گھر کے لیے دال، سبزی، مرچ مصالحہ لیتا آیا تھا۔ باقی نو روپے بچے۔ کل دودھ والے کا حساب کر کے دس روپے بچ گئے تھے۔ اُنیس روپے تھے اس کے پاس۔ بدبو کا بھبکا سا آیا تو رمجو نے پلٹ کر

دیکھا۔ بالکل پانی جیسی ٹٹی کر رہا تھا منّا۔

وہ ساری رات رمجو اور راجی نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ پل بھر بھی نہ سو سکے۔ رات کی سیاہی آہستہ آہستہ دور ہونے لگی تو رمجو نے غور سے دیکھا۔ منّے کی آنکھیں لگتا تھا اندر کو دھنس گئی ہیں۔ ناک کے نتھنے اب زیادہ تیزی سے پھُول رہے تھے۔ راجی نے اس کی قمیض اٹھا کر ٹٹی صاف کی تو رمجو کی نظر منّے کے سینے پر پڑی۔ اُس کی پسلیاں ہر سانس کے ساتھ اندر باہر جا رہی تھیں۔

''تُو نے آج کام پر نہیں جانا؟''

راجی نے تھکی تھکی سی آواز میں پوچھا۔ اُسے فکر تھی آج مزدوری نہیں آئی تو کام کیسے چلے گا۔ حمیدہ کی دی ہوئی پڑیا کب تک چلے گی۔

''آج ہڑتال ہے''

رمجو نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا۔ راجی نے کچھ کہنے کو منہ کھولا پر خاموش ہوگئی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی رمجو کے پاس کتنے پیسے ہیں مگر روز کا حساب اسے خود ہی پتہ تھا۔ منّے کے دودھ اور گھر کی دال سبزی اور روٹی کے علاوہ صرف رمجو کی بیڑی کا ہی تو خرچہ تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ بیس پچیس روپے ہوں گے رمجو کے پاس۔

''کتنے پیسے ہیں تیرے پاس؟''

آخر راجی سے نہ رہا گیا۔

''ایک کم بیس''

منّا کسمسایا تو رمجو دوڑ کر اس کے پاس آیا۔ منّے نے رونے کیلئے منہ کھولا مگر اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی کمزور اور کانپتی ہوئی۔ جیسے وہ یہاں کٹیا میں نہیں، بہت دور پڑا رو رہا ہے۔

''تھوڑا دودھ پلا کر دیکھو''

رمجو نے تھوک سے اپنا خشک ہوتا ہوا گلا تر کیا۔ اس نے ٹاٹ کے پردے سے چھنتی ہوئی دھوپ سے اندازہ لگایا۔ صبح کے چھ بجے ہوں گے۔ یہاں سے خیراتی ہسپتال کا راستہ پیدل چلنے پر کوئی دو گھنٹے کا ہوگا۔ راجی ساتھ چلے تو آدھ گھنٹہ اور لگ جائے گا۔ ساڑھے آٹھ نو بجے تک پہنچیں گے وہ تب تو ڈاکٹرنی صاب آ چکی ہوگی۔

رمجو۔ منّے کو ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا''

رمجو کو لگا راجی نے اس کے دل کی بات سن لی ہے۔ جب سے راجی ماں بنی تھی اُسے منّے سے متعلق ہر بات کا ان کہے بن سنے پتہ لگ جاتا تھا۔ منّے کو کب دودھ پینا ہے، کب نہانا ہے، کب کٹیا سے باہر کھلی ہوا میں جانا ہے۔ اُسے نہ منّا بتا سکتا تھا نہ رمجو کو کہنے کی نوبت آتی تھی۔ اور تو اور رمجو جو کچھ منّے کے بارے میں سوچتا تھا وہ بھی راجی کو پتہ لگ جاتا تھا۔ ایک دن رمجو منّے کو گود میں لئے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ منّا بڑا ہو جائے گا تو اسکول میں داخل کرائے گا کہ اچانک راجی بول پڑی ''میں منّے کو مجوری نہیں کرنے دوں گی۔ بابو بناؤں گی اسے'' اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

''کیا سوچ رہا ہے تُو'' منّے کو ہسپتال لے جانا ہے''

رمجو اپنی سوچوں سے الٹے پاؤں مڑ آیا۔ اور دونوں منّے کو لے کر باہر نکلے۔ رمجو نے زمین پر بیٹھ کر ٹاٹ کے پردے کے دونوں نچلے کونے بانسوں کے ساتھ باندھ دیئے اور راجی کے آگے آگے چل پڑا۔

پکی سڑک پر آتے ہی رمجو کو جھٹکا سا لگا۔ سڑک پر بس، ٹرک، رکشا، ٹیکسی کی سواری کا نام ونشان نہیں تھا۔ پیدل چلنے والے بھی اکّا دکّا ہی تھے۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے رمجو بے حال ہوگیا۔ سارے دن کی مزدوری کے بعد رات ایک پل بھی نہیں سویا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا راجی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ دو پل سانس لینے کے لیے اس نے ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔

''اسپتال کا در وجا تو بند ہے''

راجی نے فکر مند سا ہو کر پوچھا۔

رمجو نے پھرتی سے اٹھ کر کھڑکی کے گیٹ کو ہاتھ مارا تو وہ کھل گیا۔ اندر گئے تو صرف زنانہ وارڈ سے کسی عورت کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا دس بستروں کا زچہ بچہ ہسپتال تھا جہاں کچی آبادی کی عورتیں بچہ پیدا کرنے اور حمل گروانے آتی تھیں۔ بچے تو مفامفت پیدا ہو جاتے تھے مگر حمل گروانے کے لیے دایہ اور ڈاکٹرنی کو بڑے پیسے دینے ہوتے تھے۔ ڈاکٹرنی بچے بھی پیدا کراتی تھی اور ان کا علاج بھی کر دیتی تھی۔ رمجو نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی کوئی بندہ پرندہ نظر نہ آتا تھا۔ وہ گھبرا کر زنانہ وارڈ کی طرف لپکا جہاں سے کسی کے کھانسنے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔

''اے ہے کدھر گھسا آ رہا ہے۔ نظر نہیں آتا تجھے زنانہ وارڈ ہے''

موٹی سی بوڑھی آیا نے اسے دروازے پر ہی دھر لیا۔

''میرا بچہ بڑا بیمار ہے۔ ڈاکٹرنی صاحب نہیں آئیں''

''ڈاکٹرنی کہاں سے آئے گی۔ ہڑتال ہے آج''

''ڈاکٹرنی بھی ہڑتال کرتی ہے؟''

رمجو کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ارے بابا۔ ڈاکٹرنی تو ہڑتال نہیں کرتی مگر یہ جو ہڑتال والے ہیں نا یہ بڑا ٹنگ کرتے ہیں۔ پچھلی بار ڈاکٹرنی آ گئی تھی تو ہڑتال والوں نے بڑی بدتمیزی کی تھی اس کے ساتھ۔ جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ اسی لئے نہیں آئی ہوگی۔ میں تو خود رات کی ڈیوٹی ختم کر کے بیٹھی ہوں۔ واپس گھر کیسے جاؤں۔ خصم اور بچے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔

بوڑھی آیا نے اپنی کتھا کہانی شروع کر دی۔

''مگر۔۔۔ مگر میں کیا کروں؟ میرا منّا تو بہت بیمار ہے''

''ارے بھیا تو میں کیا کروں۔ ایسا کر دوپہر تک انتظار کر لے۔ شاید شام سے پہلے کچھ گاڑیاں چل پڑیں تو ڈاکٹرنی چکّر مارنے آ جائے'' رمجو پلٹا تو اس کی کہنی راجی کے منہ سے جا ٹکرائی جو اس کے پیچھے پھٹی پھٹی آنکھیں لئے

''چہارسُو''

جانے کب آن کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس کی نظر منّے پر پڑی تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ منّے کی آنکھوں کے ساتھ اس کے گنجے سر کی سوکھی کھال بھی اندر کو دھنس گئی تھی اور وہ اپنے ہی جسم سے نکلی گندگی میں لتھڑا ہوا تھا۔

''اسے صاف تو کر لے''

رمجو نے مری ہوئی آواز میں کہا اور آہستہ آہستہ چل کر برآمدے کے آخری حصے میں جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ راجی بھی ساتھ ہی آن لگی اور اپنی اوڑھنی پھاڑ کر منّے کو صاف کرنے لگی۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ تھکے ہارے نیند کے مارے رمجو کو شاید نیند آ گئی اسے اپنے چہرے پر گرمی سی محسوس ہوئی تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سورج ہسپتال کے ایک طرف سے سفر کرتا چھت پھلانگ کر دوسری طرف آ گیا تھا اور جہاں پہلے سایہ تھا اب وہاں سخت دھوپ تھی۔ رمجو کا بدن پسینے پسینے تھا۔ راجی نے سورج کی طرف پیٹھ کر کے منّے کو دھوپ سے بچا کر گود میں لٹایا ہوا تھا جہاں وہ بے سُدھ پڑا تھا۔ راجی کے مٹّی کے اٹے گالوں پر آنکھوں سے نکلی لکیروں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ رمجو نے گھبرا کر منّے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا تو اُس کے منہ سے بہت کمزور سی آواز نکلی جیسے سسکی لے رہا ہو۔ رمجو اٹھ کر پھر زنانہ وارڈ کی طرف بھاگا اور بغیر سوچے سمجھے اندر گھس گیا جہاں کرسی پر بوڑھی آیا بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

''اماں۔ میرے منّے کو تو ہی دیکھ لے۔ کوئی دوائی دے دے اسے۔ بڑا بیمار ہے''

رمجو کی آواز سن کر آیا ہڑ بڑا کر اٹھی ساتھ ہی دو مریض عورتیں بھی جاگ پڑیں۔

''بابا۔ میں کون سی ڈاکٹرنی ہوں''

آیا کچھ گھبرائی۔

''اماں۔ میں سارے دن سڑک کی طرف دیکھتا رہا ہوں۔ صبح سے ایک گاڑی بھی نہیں گزری اب تو شام ہونے لگی ہے۔ تو ہی رحم کر''

''اچھا۔ چل۔ دیکھتی ہوں''

آیا اٹھ کر برآمدے میں آئی جہاں راجی اسی طرح سر جھاڑ منہ پھاڑ منّے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔

''اس کی حالت تو اچھی نہیں''

آیا نے منّا اٹھا کر پکی سی آواز میں کہا۔

رمجو کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''کچھ پیسے ہیں تیرے پاس؟''

''ہاں۔ ہاں۔ یہ۔۔۔ یہ ایک کم بیس روپے ہیں''

رمجو نے فوراً تہہ بند کی گرہ سے پیسے نکال لئے۔

''اتنے پیسوں میں تو دوائی نہیں آئے گی بابا۔ ڈاکٹری دوائی ہے کوئی حکیم کی دوائی تو نہیں''

آیا کی آواز اور لہجہ دونوں ہی بدل گئے۔

''اماں۔ میرے بچے کی قسم۔ نہیں اتنے ہی پیسے ہیں میرے پاس''

رمجو آنکھوں میں آنسو لئے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھا۔ لاؤ۔ دو''

آیا نے روکھا سا منہ بنا کر پیسے چھینے اور الٹے پاؤں وارڈ میں چلی گئی۔

''یہ لو۔ ایک چمچہ ہلا کر تین تین گھنٹے بعد پلاؤ''

رمجو نے کچھ کھوئے کھوئے سے بوتل پکڑی۔

''اچھا۔ چمچہ نہیں ہوگا تمہارے پاس۔ چلو بوتل کے ڈھکنے سے پلا دو۔ ڈھکنا ایک چمچ کے برابر ہوتا ہے''

رمجو بوتل لے کر بڑھا تو سڑک پر ایک رکشا اور اس کے پیچھے ایک ٹیکسی گزری۔ سامنے سورج دن بھر کی تھکن سے پیلا پڑا ہوا اپنا منہ چھپا رہا تھا۔ رمجو کو کچھ ڈھارس بندھی شاید اب ڈاکٹرنی آ جائے۔ وہ راجی کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ بوتل زور زور سے ہلا کر اس نے ڈھکنا کھولا اور دوائی ڈھکنے میں ڈال کر دوسرے ہاتھ سے منّے کو منہ کھولنے لگا تو لگا جیسے منّے نے زور سے دانت بھینچ لئے ہوں۔ اس نے ڈھکنا ٹیڑھا کر کے دوائی منہ میں ڈالی تو آدھی اندر گئی اور آدھی منہ کے دونوں طرف سے بہہ نکلی۔ اس نے ایک بار پھر ڈھکنا بھرا اور دوائی منّے کے منہ میں ڈالی۔ منّے نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر ایک زوردار جھٹکا لیا اور بڑی سی الٹی کر دی جس سے رمجو کے دونوں ہاتھ۔ دوائی کی بوتل سب کچھ لتھڑ گیا۔ راجی کے منہ سے ایک بے ہنگم چیخ نکلی تو آیا دوڑ کر وارڈ سے نکل آئی اور منّے پر جھک گئی۔

''آئے ہائے۔ اللہ رحم کرے۔ یہ تو مر گیا''

آیا نے سر اٹھا کر رمجو کو دیکھا۔ ہاتھ سے منّے کی پھٹی ہوئی آنکھیں بند کیں دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور وارڈ میں چلی گئی۔ راجی نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو اور ناک سے پانی بہہ بہہ کر منہ اور گردن تک بہنے لگے مگر رمجو کو ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اُس نے آہستہ سے اپنی پگڑی اتاری اور منّے کے مردہ جسم کو جو ابھی تک گرم تھا اُس میں لپیٹ لیا اور اٹھ کر ہسپتال کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ راجی اس کے پیچھے روتی بین کرتی چل پڑی۔ رمجو منّے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اس طرح چل رہا تھا جیسے خواب میں قدم بڑھا رہا ہو۔ اب سڑک پر اکّا دکّا ٹریفک شام کے دھندلکے میں چل پڑا تھا جب بڑی سڑک پار کرنے کے لیے رمجو نے قدم بڑھائے تو راجی نے گھبرا کر اس کے بانہہ پکڑ لی اُسے لگا کہ رمجو کو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے نہ وہ کچھ سن رہا ہے۔ اس کے کانوں میں نہ تو قریب رکتی ہوئی کار کے بریکوں اور زور سے بجتے ہوئی ہارن کی آواز آئی اور نہ شاید شام کا اخبار بیچتے ہوئے لڑکے کی زوردار ہانک۔

''شہر کی تاریخ میں سب سے بڑی ہڑتال!''

''کامیاب ترین ہڑتال!''

اسے کیا کہیں گے

نثار احمد صدیقی
(گیا، بہار)

''کوئی شخص میرا مطلب ہے کوئی شریف آدمی کسی لڑکی کو خبیث کیسے کہہ سکتا ہے۔'' چھوٹے قد کے آدمی نے سب کو چیلنج کیا اور اطمینان سے لیمونیڈ پینے لگا۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ وہ لوگ اس قسم کے چیلنج کے عادی ہوتے جارہے تھے۔

''میں پھر کہتا ہوں میرے سامنے اس نے لڑکی کو خبیث کہا، بدتمیز یا بے رحم کہتا تو کوئی بات نہ تھی، مگر اس نے خبیث کہا۔ میں کہتا ہوں یہ بات مردانگی سے بعید ہے کہ کسی لڑکی کو خبیث کہا جائے۔''

ڈاکٹر ڈاسن پائپ کا کش کھینچنے لگا۔ میتھوز اپنے دونوں گھٹنے ہاتھوں کے حلقے میں لئے بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سوئٹ اپنے اسکاچ کا گلاس ختم کر چکا تھا۔

''مسٹر ٹروکر! میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی لڑکی کو خبیث کہنا جائز ہے؟''

ٹروکر اس کے برابر بیٹھا تھا وہ اس سوال سے ہڑبڑا کر بولا۔ ''یہ بات تو لڑکی پر منحصر ہے'' چھوٹے قد والا آدمی حیران ہو کر بولا۔ ''آپ کا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے کہ میں نے ایسی لڑکیاں وعورتیں دیکھیں ہیں جو کسی خبیث سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔'' اس جواب سے سناٹا چھا گیا۔

چھوٹے قد والا اس جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر کرب نمایاں تھا۔

''تمہیں کسی شخص کا، کسی لڑکی کو خبیث کہنا اتنا برا لگ رہا ہے۔'' ٹروکر سرد لہجے میں بولا ''مین تم کو ایک خاتون میرا مطلب ہے ایک لڑکی کے بارے میں بتاتا ہوں۔ فرض کرلیں اس کا نام مس کروتھر تھا۔ جب میں قصہ ختم کر لوں تو تم سے پوچھوں گا کہ وہ خبیث سے بدتر تھی یا نہیں؟ یہ بہت دنوں کی بات ہے جب ایچ۔ اینڈ۔ اولائن کے جہاز چلتے تھے۔ ہم اور وہ ایک ہی جہاز پر لندن سے مشرق بعید کے لئے سفر کررہے تھے۔'' اس نے رُک کر گلا صاف کیا اور بات جاری رکھی۔

''مس کروتھر ایک حسین ونازک سی جوان لڑکی تھی۔ اس کا باپ مشرق بعید میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا اصلی نام اگر لوں تو تم سب فوراً پہچان جاؤ گے۔ وہ لڑکی اپنی ماں اور خادموں کے ساتھ اپنے باپ کے پاس جارہی تھی۔ اس نے دوسرے مسافروں کو حیران کر رکھا تھا۔ وہ تقریباً سارے کھیل اچھی طرح کھیل سکتی تھی۔ اچھا خاصا گانا بھی گالیتی تھی۔ جہاز کی ساری دوسری خواتین اچھا رقص کرتی تھی۔ تیرنے میں تو اس نے لڑکیاں تو لڑکیاں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اسے کپڑے پہننے کا ڈھنگ آتا تھا۔ معمولی لباس میں بھی وہ دلکش نظر آتی تھی۔ گاتی یا رقص کرتی تو ماہر آرٹسٹ لگتی تھی۔ جب وہ کوئی اچھا لباس پہنتی تو ماڈل لگتی تھی''۔

سب لوگ بڑی توجہ سے ٹروکر کی بات سن رہے تھے۔ جو کہہ رہا تھا ''وہ جسمانی طور پر ایک تندرست لڑکی تھی۔ مگر جس چیز نے سب کو حیران کر رکھا تھا وہ اس کا تیرنا تھا کہ اس کے تیرنے میں ایک نفاست ایک نزاکت تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تیرتی تھی۔ ایسا لگتا اسے کوئی محنت نہیں کرنی پڑ رہی ہے۔ جیسے وہ پانی کا ایک حصہ ہو جیسے وہ پانی میں پیدا ہوئی ہو، جب وہ غوطہ لگاتی تو پانی کے اندر دو منٹ تک رہ سکتی تھی۔ میں نے باقاعدہ گھڑی سے وقت نوٹ کیا تھا۔ جہاز کے عرشے پر ایک بڑا تیرنے کا تالاب تھا۔ اس میں لوگ سکّے پھینکتے اور وہ غوطہ لگا کر سکّے تالاب کے پیندے سے اٹھالاتی پانی کم از کم دس فٹ گہرا ہوگا۔ وہ ایک غوطہ میں چالیس چالیس سکے پانی کے اندر سے اُٹھالاتی تھی۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ دوسرے لوگ بھی شرط لگا لگا کر غوطہ لگاتے مگر اس سے زیادہ سکّے نہیں اُٹھا پاتے۔ اس کا اسکور ہمیشہ سب سے زیادہ رہتا۔''

ہال میں سناٹا ہو گیا تھا صرف ٹروکر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''وہ پانی کی مخلوق تھی، ساتھ ہی وہ زمین کی بھی مخلوق تھی۔ اپنے پُرکشش جسم دلکش مسکراہٹ اور عمدہ لباس میں ہر وقت لوگوں کو گھیری رہتی نوجوان اس کے چاروں طرف منڈلاتے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اور تو اور جہاز کا کپتان ہیلی اس کے پیچھے پیچھے اس طرح پھرتا جیسے اس کا زرخرید غلام ہو، نوجوانوں کے علاوہ شادی شدہ حضرات اپنی اپنی بیویوں سے نظر بچا کر اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے۔ سخت سے سخت طبیعت مرد بھی اس کے سامنے موم ہو جاتے وہ ان سے جو چاہتی کرواسکتی تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی تھی۔ وہ شعلہ تھی شعلہ۔ وہ بجلی کے شرارہ تھی۔ ساتھ ہی وہ نہایت مغرور بھی تھی۔ اسے اپنے عورت پن کا غرور تھا۔ مردوں کو اپنے کپڑے سے بھی حقیر سمجھتی تھی''۔ ٹروکر دم لینے کے لئے رکا اور پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہر چیز اس کے قبضہ میں تھی پورا جہاز اس کے قبضہ میں تھا۔ جہاز کا ہر مسافر اس کی پرستش کرتا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

یہاں تک کہ ہم کولمبو پہنچ گئے۔کولمبو میں ایک بھیانک واقعہ ہوا۔

کولمبو میں چھوٹے چھوٹے لڑکے جہاز کے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔لوگ سکّے پھینکتے وہ غوطہ لگا کر اُٹھالاتے، پانی میں ہر وقت شارک کا ڈر تھا۔ جب لڑکے محسوس کر لیتے کہ آس پاس کہیں شارک ہے تو وہ فوراً نکل بھاگتے۔ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد مس کروتھر اپنا دربار سجائے بیٹھی تھی۔ اس نے جہاز کے کپتان ہیٹلی کو سیٹی بجا کر بلایا۔ جہاز کے عرشے پر ان لڑکوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔مگر مس کروتھر کے سامنے کپتان موم ہو گیا اور اس نے لڑکوں کو عرشہ پر آنے دیا۔

مس کروتھر ایک تیراک تھی اور اسے ان لڑکوں سے دلچسپی تھی۔اس نے بہت سے سکّے جمع کئے وقفے وقفے سے انہیں اچھالتی وہ لڑکے عرشہ پر سے سیدھے پانی میں غوطہ لگاتے اور سکّہ نکال لاتے لڑکوں کو سکّے انعام میں مل جاتے۔لڑکوں کو پانی میں کودنے کے طریقے سے اُسے خاصی دلچسپی ہو رہی تھی۔ عرشہ پر سے اچھلنے اور گرنے کے درمیان میں جسم کو سیدھا رکھنا ایک مشکل کام تھا۔جسم کا مرکز اوپر ہوتا ہے اور الٹنے کا ڈر ہوتا ہے جب وہ اوپر سے کودتے تو ان کا سر نیچے ہوتا۔ پانی میں پہنچنے سے ذرا پہلے وہ ہوا میں غوطہ لگا کر جسم کو سیدھا کرتے اور پانی میں پیر پہلے اور باقی جسم بعد میں پہنچتا یہ ایک خوبصورت نظارہ تھا۔

ان لڑکوں میں ایک لڑکا سب سے بہتر غوطہ خور اور تیراک تھا۔اس کا اچھلنا پانی میں چھلانگ لگانا یہ سب غوطہ خوری دیکھنے والوں کو مسحور کر رہی تھی۔میں نے اس سے اچھا تیراک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔عرشے سے پانی تک کوئی ستر فٹ کا فاصلہ ہوگا۔وہ اس خوبصورتی سے چھلانگ لگاتا کہ انسان حیران رہ جاتا وہ بار بار چھلانگ لگاتا۔ ہر شخص اس سے متاثر ہو رہا تھا۔لیکن مس کروتھر اس سے زیادہ محظوظ ہو رہی تھی۔وہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ چاکلیٹی رنگ، بڑی بڑی اُداس آنکھیں، زندگی سے بھرپور اٹھارہ بیس سال کا ہوگا۔

یکا یک اس نے دوسرے لڑکوں کو خبردار کیا۔سارے کے سارے لڑکے بھاگ کر عرشے پر آ گئے اور لمبی لمبی گردنوں سے جھانک جھانک کر پانی میں دیکھنے لگے۔

''کیا بات ہوئی؟'' مس کروتھر نے پوچھا۔

میرا خیال ہے کہ ایک شارک اس پانی میں منڈلا رہا ہے۔۔۔۔!

''کیا شارک سے ڈرتے ہو؟''

شارک سے ڈرنا ہی چاہیے۔۔!

اتنے میں سارے لڑکے چاروں طرف جمع ہو گئے۔وہ سب لڑکے مس کروتھر کے پجاری تھے۔اس نے ان سب پر جادو سی کر دی تھی۔

یکا یک وہ کپتان سے بولی۔''میرا خیال ہے کہ یہ سارے لڑکے شارک سے نہیں ڈرتے ہیں''۔یہ کہہ کر اس نے اس اٹھارہ سالہ لڑکے کو سکّہ دکھایا اور پانی سے لانے کا حوصلہ دیا۔لڑکے نے صاف انکار کر دیا۔دوسرے لڑکے ہنسنے لگے۔لڑکا دوسرے لڑکوں کے ہنسنے پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

بولا۔''شارک ہے''

''کوئی شارک وارک نہیں ہے۔کود جاؤ پانی میں'' یہ کہہ کر مس کروتھر نے بہت سارے سکّے لڑکے کو دیکھائے اور پانی کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکے نے گردن ہلا کر صاف انکار کر دیا۔اس نے سکّے ایک ایک کر کے پانی میں پھینکنا شروع کئے لڑکا حسرت سے سکّوں کو دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا مگر پانی میں جانے سے صاف انکار کرتا رہا۔

یکا یک مس کروتھر نے اپنے پرس سے ایک سونے کی اشرفی نکالی اور لڑکے کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ کپتان نے منع کیا۔

وہ اشرفی کو دھوپ میں انگلی اور انگوٹھے سے اچھالنے لگی جس کی چمک سے لڑکے کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کپتان نے اسے ڈانٹا۔اور کہا''لڑکے کو لالچ مت دو وہ کوئی خطرناک حرکت نہ کر بیٹھے''۔

اس نے اشرفی لڑکے کے سامنے پھر چمکائی لڑکے نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔اس نے لڑکے کو آہستہ سے کہا''میرے لئے بھی نہیں۔''اس جملے نے لڑکے کو سحر زدہ کر دیا۔معلوم نہیں یکا یک مس کروتھر کے دل میں کیا آیا۔اس نے سونے کی اشرفی کو اچھالا اور پانی میں پھینک دی۔قبل اس کے کہ ہم سب سنبھلتے ہم نے دیکھا کہ ادھر سکّہ چمکتا ہوا پانی میں گرا چشم زدن میں وہ لڑکا اپنی جگہ سے اُچھلا اور پانی میں کود گیا۔ہم سب عرشے کی ریلنگ پر جھک جھک کر دیکھنے لگے۔وہ دہشت ناک نظارہ سب نے دیکھا ادھر سکّہ صاف وشفاف پانی میں گرا لڑکا تیزی سے غوطہ لگا کر اُٹھانے گیا۔ادھر شارک چمکتے سکّے کی طرف بجلی کی طرح پلٹی اور لڑکے کو پھاڑتی ہوئی گذر گئی۔

پانی خون سے لال ہو گیا۔

عرشہ پر سناٹا چھا گیا ہر شخص پر دہشت طاری ہو گئی تھی۔سب سے پہلے مس کروتھر کی کھسیانی ہنسی کی آواز آئی۔وہ کہہ رہی تھی''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ واقعی شارک ہوگی''۔

سب لوگ خاموش رہے۔کپتان زور سے کھنکارا اور اس نے پانی میں تھوک دیا۔مس کروتھر اُٹھی، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔اس نے کپتان سے کہا''مجھے اندر کیبن میں لے چلو''۔کپتان نے اسے حقارت سے دیکھا اور خاموش رہا۔وہ لڑکھڑائی اور اندر جانے لگی۔یکا یک اسے قے ہوئی سب نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔''

ٹروکر خاموش ہو گیا۔پھر آہستہ سے بولا۔

''ایسی لڑکی یا عورت کو کیا کہیں گے؟''

کوئی کچھ نہ بولا۔سب پر سکّے طاری تھے۔۔!

☆

''تتلیوں پہ کیا گزری''

سہیل غازی پوری (کراچی)

غزل بہ رنگِ غزل کب ہے، فن ہے بے رنگین
حروفِ تازہ نہ ہوں تو سخن ہے بے رنگین

کوئی نہ رنگ، نہ خوشبو گلاب چہروں میں
اداسیاں ہیں مسلط، چمن ہے بے رنگین

خدا ہی جانے یہاں تتلیوں پہ کیا گزری
دھنک کے رنگ اڑے ہیں، بدن ہے بے رنگین

زمیں پہ رنگ برستے ہیں آسماں سے مگر
عجب تماشا ہے گل پیرہن ہے بے رنگین

وہ اپنے ماضی سے چھٹکارا چاہتے ہوں گے
جو لوگ کہتے ہیں رسمِ کہن ہے بے رنگین

طرح طرح کے جہاں گل کھلائے جاتے تھے
بہت دنوں سے وہی انجمن ہے بے رنگین

یہی تو کہتے چلے آئے ہیں سیانے لوگ!!
حصول جس کا ہو آساں وہ دھن ہے بے رنگین

وہی ہے بزم، وہی لوگ ہیں، وہی اشعار
مگر سنا ہے کہ اب دادِ فن ہے بے رنگین

سہیلؔ فرق نہ آیا کہیں بھی جذبے میں
تو خود کو پانے کی پھر کیوں لگن ہے بے رنگین

پرتپال سنگھ بیتاب (جموں، کشمیر)

نئے پانی میں ہاتھ ڈالتے ہیں
چلو اِک اور خواب دیکھتے ہیں

ہم کوئی اور چیز ڈھونڈتے ہیں
ہم کہاں پتھروں کو پُوجتے ہیں

وقت ہے دُھن کوئی چُرا لیجیے
ابھی نغمے ہوا میں گُونجتے ہیں

اُونچے پربت میں ہے کہیں نیچے
جس خزانے کو لوگ ڈھونڈتے ہیں

جب سے ہم ہو گئے سمندر کے
روز اُبھرتے ہیں روز ڈوبتے ہیں

وہ جو ہم سے کبھی جدا نہ رہا
رات دن ہم اُسی کو ڈھونڈتے ہیں

ہار جاتے ہیں جیت کر ہر روز
روز ہم اپنے من کو مارتے ہیں

اپنی بے رنگیوں میں ہم بیتاب
رنگ قوسِ قزح کے دیکھتے ہیں

عظمیٰ صدیقی

(لندن)

قسم جو کھائی ہے عظمیٰ نبھا کے دیکھیں گے
زمانے بھر سے ترا غم چھپا کے دیکھیں گے

کوئی بتائے ہمیں کس گلی میں رہتا ہے
ہم ایک بار مقدر کو جا کے دیکھیں گے

گزر گئی ہیں جو بن برسے اپنے آنگن سے
اُنہی گھٹاؤں کو پھر سے بلا کے دیکھیں گے

چلیں گے ساتھ ترے زندگی کے موسم میں
وہ اور ہوں گے جو تیور ہوا کے دیکھیں گے

یہ عمر کیا ہے ترے انتظار میں اے دوست
مہ و نجوم کی عمریں بچھا کے دیکھیں گے

سنوارے موسمِ گل جس کو رنگ و نکہت سے
اسے گلاب بھی پلکیں اُٹھا کے دیکھیں گے

جو خود کو بھول کے جینا ہی زندگی ٹھہرا
تو رفتہ رفتہ تمہیں بھی بھلا کے دیکھیں گے

لکھیں گے دل کی حکایت خزاں کے پتوں پر
طلسمی جھیل میں اُن کو بہا کے دیکھیں گے

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

چھایا ہے کیسا شہرِ تمنّا پہ رنگِ یاس — ہر سمت ایک خوف ہے، ہر سمت اِک ہراس
اَب اور کس سے ہو ہمیں ہمدردیوں کی آس — اس دور میں تو درد بھی آیا نہ ہم کو راس
کوئی بھی چہرہ گردِ الم سے تہی نہیں — کوئی بھی دل نظر نہیں آتا ہے بے ہراس
یوں تو نہ جانے کتنے تھے ہمدرد و غمگسار — لیکن ہجومِ درد میں آیا نہ کوئی پاس
احباب کا خلوص تھا اک خواب دل نشیں — ثابت ہوا ہے وہم و گماں میرا ہر قیاس
رخصت دلوں سے ہوگئی مہر و وفا کی آب — جیسے گلوں سے روٹھ گئی ہو گلوں کی باس
اندر سے ٹوٹ جاتا ہے انسان اے زہیر — آئے نظر نہ جب کوئی ہمدرد غم شناس

○

سیفی سرونجی

(سرونج، بھارت)

جب ہارنا نصیب ہو ہر اک سبیل سے — پھر کیا ملے گا تمہیں آگے اپیل سے
گہرائیوں سے کوئی ابھر کر نہ آسکا — کیسے بچوں گا میں تری آنکھوں کی جھیل سے
ایسا نہو عذاب الٰہی برس پڑے — مت فائدہ اٹھایئے قدرت کی ڈھیل سے
اتنا اکڑ کے آپ نہ چلئے زمین پر — دیکھا ہے دم توڑتے انسان کو کیل سے
لڑتے ہوئے تمہیں بھی زمانہ گذر گیا — رہنے لگے ہیں دوستو ہم بھی علیل سے

خورشید انور رضوی (اسلام آباد)

فساد اک گھر کے اندر دیکھتے ہیں — یہ منظر اک برابر دیکھتے ہیں
خود اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں نقصاں — اُسے پھر ہاتھ مل کر دیکھتے ہیں
بہت ہم پاؤں پھیلاتے ہیں اپنے — نہیں ہم اپنی چادر دیکھتے ہیں
ہماری آنکھ ہی کھلتی ہے اُس دم — بلا جب سر کے اوپر دیکھتے ہیں
تقابل کیا کریں اپنا کسی سے — سبھی کو خود سے بہتر دیکھتے ہیں
قیامت سے فزوں ہے یہ قیامت — بپا ہر سمت محشر دیکھتے ہیں
سُنی ہے جو خبر اچھی نہیں ہے — چلو حالات چل کر دیکھتے ہیں
نوشتۂ سرِ دیوار کیا ہے — ذرا اُس کو تو پڑھ کے دیکھتے ہیں
جنہیں ہے دوستی کا ہم سے دعویٰ — اُنہی ہاتھوں میں خنجر دیکھتے ہیں
عدو کا سارا دم خم لاؤ لشکر — سرِ میداں نکل کر دیکھتے ہیں
تماشا اک سمجھ کر اہلِ دنیا — ہمیں خورشید انور دیکھتے ہیں

○

پنہاں

(یو۔ایس۔اے)

زندگی تنگ بہت کرتی ہے ہر نفس جنگ بہت کرتی ہے
سادگی ہے کوئی سنگریز کہ جو روح میں رنگ بہت کرتی ہے
کوئی جادو ہے محبت شاید دل کو یہ دنگ بہت کرتی ہے
دشمنِ جاں ہے مری اپنی انا رنگ میں بھنگ بہت کرتی ہے
یاد وہ پھول سی ایک شام کہ جو بارش سنگ بہت کرتی ہے
طفلِ بیمار کی صورت پنہاںؔ شاعری تنگ بہت کرتی ہے

تنویر شاہد محمد زئی

(مظفر گڑھ)

تلاشِ رزق جاری ہے مگر کتنے وسیلوں سے یہ سب رستے نکلتے ہیں لہو کی گرم جھیلوں سے
میں تنہا تھا مگر مجھ کو کوئی آواز دیتا تھا کبھی چاہت کی وادی سے، کبھی نفرت کے ٹیلوں سے
مرے دشمن کو خالی ہاتھ ہی جانا پڑا آخر مرے قاتل نکل آئے مرے اپنے قبیلوں سے
جہاں دولت ہی سب کچھ ہو، جہاں انصاف بِک جائے بھروسہ کیا گواہوں کا، توقع کیا وکیلوں سے
چلی گولی تو منظر ہوگئے تبدیل لمحوں میں اچانک اُڑ گئیں مرغابیاں پُرکیف جھیلوں سے
لُٹی شاموں کا مرکز ہے میری اُجڑی ہوئی روہی لہو صبحیں اُترتی ہیں میری بستی کے ٹیلوں سے
ہمیں تنویرؔ جینے کی سزا ہر حال ملنی ہے ہمارا جسم داغا جا رہا ہے گرم کیلوں سے

شگفتہ نازلی

(لاہور)

راکھ کے بادل ہٹے، پروانگی لکھی گئی مرحلے جونہی طے ہوئے تو روانگی لکھی گئی
کرب کے قطرے اَلم کی بارشوں میں ڈھل گئے وقت کی دیوار پہ یوں زندگی لکھی گئی
جُو کے دَھارے گُل میں ملتے ہی رہیں خواہشوں کے طاق پہ تھی بندگی لکھی گئی
اُس کے سارے دیئے پانی کی زد میں آرہے اُنگلیوں سے لہروں کی افسُردگی لکھی گئی
چلتے چلتے جیسے گردِ راہ ہو کر رہ گئے تنہا سُوکھے پیڑ پہ وا ماندگی لکھی گئی
کوئی بھی تو قمقمہ لپکا نہیں ساحل کی اُور بے اِرادہ ریت پہ پھر تیرگی لکھی گئی
کتنی محفل سے چھپائی سرد مہری کی لہر پھر بھی پیشانی پہ جُوں بیگانگی لکھی گئی
پہلے بھی کُچھ کُچھ سمجھ ہی آتا تھا جب گئے اس سے بھی تو دیوانگی لکھی گئی!

○

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

اپنے دکھوں کا اس طرح درماں نہ کیجیے
مغموم ہو کے چاک گریباں نہ کیجیے

لکھیں نئے طریقے سے افسانۂ حیات
بیتے دنوں کی تلخیاں عنواں نہ کیجیے

رونے سے کم نہ ہو گی یہ ویرانیِ نظر!
پلکوں پہ آنسوؤں سے چراغاں نہ کیجیے

اس سے حسین چہرے پہ پھیلے گی تیرگی
یادوں کے دیپ دل میں فروزاں نہ کیجیے

انسان بن کے جانچیے انسان کا معیار!
عہدے سے آدمی کو ہراساں نہ کیجیے

○

کرشن گوتم

(چندی گڑھ، بھارت)

یوں تو کوئی اُس سے مرا رشتہ نہیں لگتا
سب کچھ ہے مرا وہ، مرا کیا کیا نہیں لگتا؟

میں کیسے کہوں وہ مجھے اچھا نہیں لگتا
کل تک وہ جو اپنا تھا وہ اپنا نہیں لگتا؟

باقی ہیں ابھی اور بھی ہونے کو فیصلے
اتنے پہ ختم ہو مرا دعویٰ ، نہیں لگتا

کس درجہ دل اُتر کے ہے آیا نشیب میں
جو سرتا پا فریب ہے جھوٹا نہیں لگتا!

جاتی ہوئی دنیا سے بھلا اور کیا کہیں
سپنا ہے ، مگر جو کبھی سپنا نہیں لگتا!

اپنے سے تو لگتے ہیں بہت لوگ جہاں میں
لیکن مجھے کوئی کہیں تم سا نہیں لگتا

وہ دن گئے کہ دل کو لگاتے تھے بار بار
دل اب نہیں لگتا، نہیں لگتا، نہیں لگتا

اک پل کی حق شناسی سے اب دل کہاں لگے
کہتے نہ تھے لگتا نہیں، دیکھا؟ نہیں لگتا!

ہے داغ کا وہ رنگ کہ ہر دور میں گوتم!
پھیکا نہیں پڑتا کبھی ہلکا نہیں لگتا

○

ندیم ہاشمی

(کراچی)

حالِ دل سُن کے حال ہو جائے
اِس قدر تو کمال ہو جائے

پھر سرِ راہ دیکھ کر ہم کو
حسن محو سوال ہو جائے

موسموں کی بھی قدر ہوتی نہیں
جب طبیعت نِڈھال ہو جائے

مانگ بیٹھا ہوں یہ دُعا یارو
منصبِ دل بحال ہو جائے

یاد رکھیں سدا جہاں والے
دوستی بے مثال ہو جائے

وہ جو آئے اداس بانہوں میں
ہجر اپنا وصال ہو جائے

ہاشمی جی یہی غنیمت ہے
اُس کو جتنا خیال ہو جائے

نورزمان ناوک

(تلہ گنگ)

شجر جب ذائقے تقسیم کرتا ہے — ثمر جھک کر اُسے تسلیم کرتا ہے
ہمیشہ سے گزشتہ اور آئندہ — ہمارا حال ہی تفہیم کرتا ہے
زوالا زائچہ ہے ضابطے کا یاں — جو آتا ہے نئی ترمیم کرتا ہے
شکاری ہے بس اپنی بھوک تک، وہ بھی — درندہ بھی ہمیں تعلیم کرتا ہے
عطا کرتا ہے اُس کو صبر کی اجرک — خُدا بھی درد کی تکریم کرتا ہے
تکلم میں نہیں رکھتے مِری جاں ہم — دِلوں کو حرف جو دو نیم کرتا ہے
مِری مٹی کے بکھراؤ کو کُوزہ گر — وصالِ چاک سے تنظیم کرتا ہے
سوالوں کی نئی کونپل نکل آئے — جوابوں کی وہ یوں ترقیم کرتا ہے
الف اسرار اُس پر ہی کھُلیں ناوکؔ — جو حرفِ میم کی تعظیم کرتا ہے

نعیم الدین نظرؔ

(میرپورخاص)

رات تھی مجبور جانے کے لیے — رہ گئے قصّے سنانے کے لیے
نوچتا ہوں شاخِ گل کے زیورات — آشیانے کو سجانے کے لیے
اے شبِ ہجراں تُو کیوں آئی ادھر — دوست ہیں یاں دل جلانے کے لیے
سرخ جوڑا پہن کر وہ چل دیے — رہ گئیں یادیں ستانے کے لیے
نرم و نازک ہاتھ میں چھالے پڑے — سخت محنت کی کمانے کے لیے
لڑکھڑاتا پھر رہا ہوں شہر میں — مے کشی اپنی دکھانے کے لیے
اوس گرتی ہے چمن میں رات بھر — بند کلیوں کو کھلانے کے لیے
میرے گھر سے اس کی خوشبو کو نظرؔ — پھر ہوا آئی چُرانے کے لیے

جتندر پرواز

(پٹیالہ، بھارت)

سکھ دکھ میں گرم و سرد میں سیلاب میں بھی ہیں — ماں کی دعائیں موسمِ شاداب میں بھی ہیں
ہونے لگی شکست جمع ہر گام پر مجھے — دشمن پتا چلا میرے احباب میں بھی ہیں
دامن کو پاک رکھنے کے حق میں تھا میں مگر — وہ کہہ رہی تھی داغ تو مہتاب میں بھی ہیں
دلّی سخنوروں کا ہے مرکز مگر میاں — اردو کے کچھ چراغ تو پنجاب میں بھی ہیں
رنگین مرتبان میں یہ خوش نہیں تو کیا — کچھ مچھلیاں اداس تو تالاب میں بھی ہیں
پرواز مختلف ہے کہاں حالِ دل ترا — ایسی تو بیقراریاں سیماب میں بھی ہیں

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....٦

چوتھی جماعت میں فیل ہوگیا

ریلوے اسکول چوتھی جماعت تک تھا۔اس کے بعد ہائی اسکول میں داخل ہونا تھا۔اس دور میں سندھ میں جو تعلیمی نظام تھا وہ پاکستان کے دوسرے صوبوں سے بہت مختلف تھا۔چونکہ ایک زمانے میں سندھ انتظامی طور پر بمبئی کے تحت تھا اس لئے یہاں اب بھی بمبئی پریسیڈنسی کا نظام قائم تھا۔اس کے مطابق میٹرک گیارہ کلاسوں کا تھا اور جماعتوں کو''سٹینڈرڈ'' کہا جاتا تھا۔چوتھی کے بعد ہائی اسکول کی پہلی جماعت فرسٹ اسٹینڈرڈ تھی اور میٹرک ساتویں اسٹینڈرڈ کا تھا۔اس کے علاوہ حساب اور دوسرے مضامین انگلش میں تھے۔صرف تاریخ اردو میں تھی۔پاکستان میں یہ بات مشہور تھی کہ سندھ کا میٹرک بہت مشکل ہے اور یہاں صرف گاہے گاہے ہی میٹرک میں فرسٹ ڈویژن آتی ہے۔سلطان بھائی جان جو اپنی کلاس میں بہت ہوشیار لڑکوں میں شامل تھے انکی بھی سیکنڈ ڈویژن ہی آئی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ بہت عرصے تک میر پور خاص سے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لانے والا لڑکا صرف عاشق علی تھا جس نے بعد میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور وہ پاکستان کے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات رہا۔یہ ایک غریب گھر کا لڑکا تھا مگر اس کی کامیابیاں میر پور خاص میں ضرب المثل بن گئی تھیں۔

جیسا میں نے پہلے لکھا ہے میرا شروع کا تعلیمی دور بہت مشکل اور پریشان کن تھا اس لئے کہ نہ تو مجھے پڑھائی سے کوئی دلچسپی تھی نہ ہی مجھے اسکول کی قید پسند تھی مگر رفتہ رفتہ میری جنرل نالج اور غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے مجھے اسکول میں امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔اس کے باوجود نصابی طور پر اور نمبر حاصل کرنے کے لحاظ سے اب بھی میں کلاس میں اول یا دوئم پوزیشن پر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اب بھی حبیب اور عزیز ہماری کلاس کے تیز ترین لڑکے تھے۔ان دونوں کو حساب کے مضمون میں خاص مہارت حاصل تھی۔اور میری ''سودمرکب'' کے سوالوں سے جان جاتی تھی۔پھر پہاڑوں نے الگ میری جان کو ضیق لگادی تھی۔بہرحال مجھے اس صورت حال سے کوئی تشویش بھی نہیں تھی کیونکہ مجھے اب بھی پڑھائی سے بہت زیادہ دلچسپی نہ تھی اور میں کسی قسم کی مسابقت کی دوڑ میں شامل نہیں تھا۔

مگر پھر یہ معلوم ہوا کہ ہائی اسکول میں داخلے کے لئے ایک امتحان ہوتا ہے جو بہت مشکل ہے اور اس کو پاس کرنا ضروری ہے۔اس نے مجھے اس معاملے میں ذرا سنجیدہ کردیا اور چوتھی جماعت میں، میں نے پڑھائی پر کچھ توجہ دینی شروع کردی۔اس کی وجہ سے مجھے بہت جلد کلاس میں ایک خاص مقام حاصل ہوگیا اور میرے اساتذہ یہ کہنے لگے کہ جن چند لڑکوں کا ہائی اسکول میں داخلہ یقینی ہے میں ان میں شامل ہوں۔

اس وقت میر پور خاص میں ایک ہی ہائی اسکول جو شہر میں تھا (فوراً ہی بعد میونسپل ہائی اسکول قائم ہوا)۔اس سکول کی عمارت سرخ اینٹوں کی بنی تھی۔چوتھی جماعت کے ختم ہونے سے ایک ماہ پہلے داخلے کا امتحان ہوا۔اگر کوئی اس امتحان میں فیل ہو جاتا تھا تو اسے چوتھی جماعت دوبارہ پوری کرنی پڑتی تھی۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ سکول کے وسیع برآمدے میں بنچیں بچھی تھیں اور امتحان طویل اور تھکا دینے والا تھا پھر نگہبانی کے لئے بالکل نئے اور اجنبی چہرے تھے۔یہ ہائی اسکول کے استاد تھے۔ہم لوگوں پر ایک دہشت چھائی ہوئی تھی۔ اپنے طور پر مجھے ایسا لگا کہ میرا امتحان اچھا اور تسلی بخش ہوا تھا۔نتیجہ تین دن بعد آنا تھا اور کامیاب لڑکوں کے ناموں کی فہرست بلیٹن بورڈ پر لگنی تھی۔

ہمارے محلے میں ایک لڑکا بالکل میرا ہم عمر تھا مگر وہ ریلوے اسکول کے بجائے شہر میں گورنمنٹ بھرگھڑی اسکول میں پڑھتا تھا۔اسکے والد بھی میرے ابّا کی طرح گارڈ تھے۔میری اس سے بڑی اچھی دوستی تھی اور ہم لوگ راتوں کو دیر تک ساتھ کھیلتے تھے۔مگر کسی وجہ سے اسے مجھ سے حسد تھا وہ عام طور پر مجھ سے ہر معاملے میں مقابلہ کرتا تھا اور اپنے طور پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بہتر ہے۔اس کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ وہ ریلوے اسکول کے بجائے سندھ حکومت کے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔میں چونکہ اس دور میں کسی قسم کے مقابلے کی دوڑ میں شامل تھا ہی نہیں اور اپنے حال میں خوش تھا اس لئے مجھے نہ اسکی پراوہ تھی نہ ہی اس کا احساس کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔تیسرے دن جب نتیجہ نکلا اور فہرستیں آویزاں ہوئیں تو میں ازلی کاہلی اور تعلیم میں عدم دلچسپی کی وجہ سے اپنا نتیجہ دیکھنے کے لئے کسی قسم کی بیقراری یا بے صبری میں مبتلا نہ تھا میرا ارادہ تھا کہ میں سہ پہر کو، جب بھیڑ کم ہو جائیگی اپنا نتیجہ دیکھنے جاؤنگا۔قریب صبح گیارہ بجے محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ فیروز عالم داخلے کے امتحان میں فیل ہوگیا۔میری تو جان نکل گئی، فیل ہونے کے ڈر اور شرمندگی کے ساتھ ساتھ امّاں کے غیض و غضب کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔گھر سے باہر نکل کر معلوم کیا کہ کس نے بتایا کہ میں فیل ہوگیا ہوں تو سب نے اسی لڑکے کا نام لیا۔میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ہاں تمہارا تو اس لسٹ میں نام نہیں۔میں ہانپتا کانپتا لال سکول پہنچا اور لڑکوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور فہرست میں نام تلاش کرنے لگا۔ میرے ہونٹ خشک تھے، دل دھڑک کر سینہ توڑ کر باہر آنا چاہتا تھا اور دماغ گھوم

رہا تھا۔ جب دیکھا تو فہرست میں نام موجود تھا۔ بار بار نام پڑھا اور پھر بھی یقین نہیں آیا تو وہاں کھڑے لڑکوں سے کہا کہ نام پڑھ کر مجھے سنائیں انہوں نے بھی نام پڑھا اور اس کی تصدیق کی کہ نام تو ہے۔ میں پھر بھی مطمئن نہ تھا وہاں کھڑے ایک ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ انہیں لڑکوں کے نام ہیں جنہیں اسکول میں داخلے کے لئے کامیاب سمجھا گیا ہے۔ جب انہوں نے بھی کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے تو یقین آیا۔ گھر آیا اور سب کو بتایا۔ وہاں آکر پتہ چلا کہ فیل تو وہ ہوا تھا، اس کا نام تو کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے کہ وہ اکیلا ہی فیل نہیں ہوا بلکہ میں بھی اس کے ساتھ فیل ہو گیا ہوں اس نے محلے میں یہ خبر پھیلائی تھی۔ جب سچ کھلا تو اس کے ابّا نے اس کی خوب پٹائی کی۔ مگر ہماری دوستی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا اور میں اب بھی اسکا دوست ہوں اگر چہ سالوں پہلے ہمارے راستے اس وقت جدا ہو گئے جب پہلے وہ میٹرک میں فیل ہو کر مجھ سے ایک سال پیچھے رہ گیا اور پھر بعد میں میڈیکل کالج میں بھی داخل نہ ہو سکا۔ مگر ہم قریبی دوست رہے۔

اس نے ایم ایس سی کیا اور پروفیسر آف کیمسٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اب بھی پاکستان واپسی پر اس سے ملاقات رہتی ہے اور جب کبھی بچپن کا یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہم خوب ہنستے ہیں۔

مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ان چند گھنٹوں میں، جب تک میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ لیا تھا کہ میں پاس ہو گیا ہوں، جتنا خوفزدہ اور پریشان ہوا اتنا شاید پھر کبھی نہیں ہوا۔ اس سے میری زندگی اور میری سوچوں پر یہ اثر پڑا کہ پھر تمام عمر، حتیٰ کے بعد میں جب خدا کے فضل سے میں اپنے پروفیسروں کی نظر میں نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ اپنی پوری یونیورسٹی میں اول درجے کا امیدوار ہوتا تھا تو بھی مستقل خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں فیل نہ ہو جاؤں۔ میری اس کمزوری پر میرے ہم جماعت بہت ہنستے تھے۔ اس پر یہاں یہ لکھنا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ سالوں بعد جب میں ڈیٹرائیٹ میں اپنی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کا امتحان دے رہا تھا تو بھی میں فیل ہونے کے خیال سے خوف زدہ رہتا تھا میں اپنے امریکی استاد کی جان کھاتا رہتا تھا کہ میں ضرور فیل ہو جاؤنگا اس پر تنگ آکر اس نے ایک بار کہا تھا کہ فیروز اگر ڈیٹرائیٹ سینٹر سے صرف ایک لڑکا پاس ہوگا تو وہ تم ہو گے، پھر تم اس قدر کیوں ڈرتے ہو (سبحان اللہ)۔

شاید میری بعد کی کامیابیاں اسی واقعہ کا ردعمل اور نتیجہ ہوں جو میرے چوتھی جماعت میں فیل ہونے کی افواہ کے سلسلے میں میری نفسیات پر اثر انداز ہوا تھا۔

گورنمنٹ ہائی سکول میر پور خاص

میں نے مئی ۱۹۵۴ء میں ریلوے پرائمری اسکول سے چوتھی جماعت پاس کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میر پور خاص جولائی ۱۹۵۴ء میں داخلہ لیا۔ اس سکول میں داخلے کے سلسلے میں ہونے والے امتحان اور اس کے ساتھ ہی میرے فیل ہونے کی افواہ کا میں پچھلے باب میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ میر پور خاص کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی شہر میں ایک خاص عزت اور شہرت تھی۔ یہ سکول ۱۹۳۵ میں قائم ہوا تھا اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ اس وقت سندھ اور بمبئی کے علاقوں میں اعلیٰ ملازمتوں پر تعینات تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے میڈیکل کالج کے پروفیسر اور شعبہ طب کے سربراہ صالح میمن صاحب، جن کی پورے صوبہ سندھ میں ذبردست قدر و منزلت تھی، نے بھی اسی اسکول سے شاید ۱۹۴۵ء میں میٹرک کیا تھا۔ ان کے بقول اس وقت سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ پورے اسکول کے چار سو لڑکوں میں صرف بیس یا بائیس لڑکے مسلمان تھے۔ یہ سکول تین عمارتوں میں قائم تھا۔ اس کی خاص بلڈنگ سرخ رنگ کی اینٹوں کی عمارت تھی جس پر محرابیں بنی تھیں اور برآمدے پر لکڑی کی جالیاں لگی تھیں انہیں جافری کہا جاتا تھا۔ اس کے چہار طرف اس کا اپنا احاطہ تھا جس میں نیم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ اسی کمپاؤنڈ میں ہماری ڈرل کی کلاسیں ماسٹر شیر محمد لیا کرتے تھے جو ریٹائرڈ فوجی تھے اور دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاظ پر خدمات انجام دے چکے تھے۔ ان کا جنگ کا جوش ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا اور وہ ہمیں مشقیں کراتے ہوئے سخت جوش میں آجایا کرتے تھے۔ سرکاری دفاتر کے لئے اس قسم کی عمارتیں نہ صرف میر پور خاص بلکہ سندھ کے دوسرے شہروں میں بھی قائم تھیں میر پور خاص میں تھر پارکر کے ضلعی انتظامیہ کے دفاتر جس میں کلکٹر کا دفتر اور اس کا دربار ہال بھی شامل تھا، بالکل ایسی ہی ایک عمارت میں قائم تھا۔

اس عمارت کے بالکل ساتھ ہی مگر علیحدہ کمپاؤنڈ میں ایک اور عمارت جو جدید طرز کی اور چوکور کمروں اور لمبی راہ دری پر مشتمل تھی۔ اس کے بالکل سامنے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے کمپاؤنڈ میں ایک پرانا قبرستان تھا جو اب بند ہو چکا تھا اور قبریں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ اس میں کہیں کہیں کھجڑی کے درخت تھے اور ٹوٹی ہوئی قبروں کے درمیان سخت دھول اور ریت تھی۔ جتنی سرخ عمارت خوبصورت اور پرشکوہ تھی یہ اتنی ہی بدرونق اور خستہ حالت میں تھی۔ اس کے بعد کچھ دور تقریباً دو فرلانگ پر ڈاکٹر ڈریگو کی کلنک کے سامنے ایک تین منزلہ گھر کو بھی اسی اسکول کے استعمال کے لئے حاصل کر لیا گیا تھا۔ اس عمارت میں ہائی اسکول کی سب سے نچلی کلاسیں ہوتی تھیں اور ہمارا سائنس ہال بھی اسی عمارت میں تھا۔ سرخ عمارت میں انتظامی دفاتر، ہیڈ ماسٹر کا کمرہ جغرافیہ ہال اور اونچی کلاسیں قائم تھیں۔ ان عمارتوں کے علاوہ بھی سرخ عمارت کے ساتھ ہی بغلی گلی میں ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت تھی جس کا بہت بڑا صدر دروازہ لوہے کی خوشنما جالیوں سے بنا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا صحن تھا اور اس کے چاروں طرف کمرے بنے تھے یہ اسکول کا ہوسٹل تھا اس لئے کہ اس اسکول میں پورے ضلع تھر پارکر سے لڑکے پڑھنے آتے تھے اور انکی رہائش اور طعام کا انتظام بھی اسکول کے ذمہ تھا۔ اس کے باوجود پاکستان بننے کے بعد لڑکوں کی تعداد اس قدر

تیزی سے بڑھی تھی کہ دن میں دو شفٹیں ہوتی تھیں اس پر بھی جب ضرورت پوری نہیں ہوئی تو شہر میں میونسپل ہائی سکول قائم کیا گیا۔ میونسپل ہائی سکول سے بھی اعلی معیار کے لڑکے نکلے اور اس سکول کا بھی شہر کی تعلیمی خدمات میں نا قابل تردید حصہ ہے مگر مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی خوف نہیں کہ شہر میں گورنمنٹ ہائی سکول کی وقعت اور اس کے طلبہ اور اساتذہ کے معیار کو ہمیشہ رشک کی نظر سے دیکھا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان دونوں اسکولوں کے درمیان مقابلے اور مسابقت کی فضا قائم ہوئی جو شہریوں اور طلبہ کے لئے کئی سال تک نہایت دلچسپی کا سبب بنی رہی۔ جن لوگوں کو میر پور خاص کا وہ دور یاد ہے انہیں یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ ان دو سکولوں کے درمیان کرکٹ، ہاکی، ایتھلیٹک ، ڈبیٹنگ اور جنرل نالج کے مقابلوں کے دوران کس قیامت کی فضا قائم ہو جاتی تھی اور دونوں اسکولوں کے طلبہ اور اساتذہ ان مقابلوں کو جیتنے کے لئے اپنی جان لڑا دیا کرتے تھے۔

سندھ کے ہائی اسکولوں میں ابھی تک بمبئی کا نظام تعلیم نافذ تھا۔ یعنی یہاں کلاسوں کے بجائے اسٹنڈرڈز ہوتی تھیں اور پانچویں جماعت کو فرسٹ اسٹنڈرڈ کہا جاتا تھا اور میٹرک دس نہیں بلکہ گیارہ جماعتوں یعنی سیونتھ اسٹینڈرڈ کا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے فرسٹ اسٹنڈرڈ کے چار سیکشن تھے اور سندھی اور اردو بولنے والے بچوں کی تعداد کے حساب سے انہیں مزید اردو اور سندھی سیکشنز میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس طرح ان سیکشنز کے نام اس طرح تھے۔ فرسٹ اردو اے، فرسٹ اردو بی، فرسٹ سندھی اے اور فرسٹ سندھی بی۔ چاروں سیکشنز کے علیحدہ علیحدہ استاد تھے اور ان سیکشنز کے درمیان بھی مقابلے کا ماحول تھا۔

میرا داخلہ فرسٹ اردو بی میں ہوا۔ اس سیکشن کے انچارج ماسٹر سمیع صاحب تھے۔ اسکول شروع ہونے پر صبح ہی صبح سرخ عمارت میں اسمبلی ہوتی تھی جس میں لڑکے اپنی اپنی کلاسوں کی لمبی قطار میں کھڑے ہوتے تھے، پاکستانی جھنڈا کھلتا تھا، اس کے بعد اقبال کا ترانہ چین وعرب ہمارا گایا جاتا تھا (اس وقت تک پاکستان کا موجودہ ترانہ وجود میں نہیں آیا تھا) اور پھر ہمارے ہیڈ ماسٹر دین محمد آرائن ایک زبردست تقریر کرتے تھے۔ آرائن صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات پر تو کئی باب لکھے جاسکتے ہیں مگر فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ایک نہایت پر اثر، پر جوش، اور بارعب انسان تھے قدرت نے انہیں قیادت اور رہنمائی کی ذبردست صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وہ علیگڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ انکی تقاریر میں حب الوطنی اور مستقبل میں ترقی کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کے علاوہ جنرل نالج کے موضوعات شامل ہوتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقعہ پر جب انہوں نے امریکہ کے ذکر پر اس کے دارالخلافہ واشنگٹن کا ذکر کیا تو جوش میں آگئے اور امریکہ کا بڑا نقشہ منگوا کر لڑکوں کو چیلنج کیا کہ وہ بتائیں کہ اس نقشے پر واشنگٹن کہاں واقع ہے جب بڑی جماعتوں میں سے کسی نے بھی زبان نہیں کھولی تو میں نے آگے بڑھ کر نقشے پر وہاں انگلی رکھ دی جہاں واشنگٹن ڈی سی ہے تو وہ حیران ہونے کے ساتھ بہت خوش ہوئے۔ دراصل ہمارے گھر میں جنرل نالج، حالات حاضرہ اور دیس دیس کے قصّوں کا بہت رواج تھا اور سلطان بھائی جان نے گھر کی دیواروں پر دنیا کا نقشہ بنایا ہوا تھا وہ اور سلطانہ آپا جب کہیں کا تذکرہ کرتے تو وہ اس نقشے کے پاس جا کر اس جگہ پر انگلی رکھتے تھے (اللہ کے فضل سے آج بھی لوگ میری جنرل نالج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے)۔ ایک ایسے ہی دوسرے موقعہ پر جب انہوں نے پوچھا کہ تسمانیہ کہاں ہے تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ آسٹریلیا کے جنوب میں ہے۔ ان واقعات سے اسکول میں مجھے خاص اہمیت حاصل ہوگئی اور آرائین صاحب نے کئی دفعہ صبح اپنے خطبے میں میرا ذکر کیا۔

ہائی اسکول کی ابتدا کچھ آہستہ ہوئی۔ ہماری جماعت اس پرانی گھر نما عمارت کی دوسری منزل پر تھی جو ڈاکٹر ڈریگو کی کلنک کے پاس تھی۔ اپنی کلاس تک چڑھنے کیلئے ایک بیحد خستہ حال لکڑی کا زینہ تھا جو ہمارے چڑھنے سے ہلتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے دونوں طرف ایک جنگلا تھا اور ہم اسے پکڑ لیتے تھے۔ ہم تمام بچے ایک قطار میں چڑھتے تھے ایک دن ایسے ہی قطار میں چڑھتے ہوئے میرے پیچھے آتے ہوئے ایک لڑکے کا پاؤں میری ایڑھی سے ٹکرایا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا یہ صاف رنگت اور بلی جیسی پیلی نارنجی آنکھوں کا لڑکا اصغر تھا۔ اس دن سے اصغر سے دوستی ہوگئی (بعد میں اصغر نے بھی بہت ترقی کی۔ اس نے انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد کراچی کے نیوکلیئر پاور اسٹیشن پر کام کیا اور پھر وظیفے پر اعلی تعلیم کے لئے فرانس گیا اب وہ خود اپنی فرم کا مالک ہے اور بجلی کے بڑے جنریٹرز کی تنصیب کا کام کرتا ہے) اسی کے ساتھ کچھ اور لڑکوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ مہتاب سعید جو میرے ساتھ ریلوے پرائمری اسکول سے ساتھ تھا وہ بھی میری کلاس میں تھا اس کے علاوہ ریلوے پرائمری اسکول ہی کے دو لڑکے جو پڑھائی میں بہت تیز تھے اور جن کی عزت آج بھی نہ صرف میرے بلکہ ہر اس فرد کے دل میں ہے جس نے اس دور میں ان دونوں کے ساتھ پڑھائی کی ہے، بھی اسی کلاس میں تھے۔ ان کا نام حبیب اور عزیز ہے۔ حبیب نہ صرف پڑھائی میں بہت تیز تھا بلکہ اس کی اردو کی لکھائی بہت ہی خوبصورت تھی اور وہ حقیقت میں کتابت کرتا تھا۔ ساتویں جماعت میں جب مجھے لکھنے لکھانے کا شوق چرایا اور میں نے ایک ناولٹ قیسی رامپوری اور عادل رشید سے متاثر ہو کر ''ان دیکھے راستے'' لکھا تو حبیب نے مروت کی خاطر اسے خوشخط کالی سیاہی سے لکھ کر مجھے دیا جو بالکل ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی چھاپے خانے سے چھپ کر آیا ہو۔ ان دونوں لڑکوں میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے اور اپنا اور ملک کا نام روشن کرتے مگر ان کے حالات نے اس کی اجازت نہیں دی اور انہوں نے اعلی نمبروں سے میٹرک پاس کرنے کے باوجود تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا اور سندھ کے نواحی شہروں میں اسکول ماسٹری اختیار کر لی۔ ایک دفعہ میر پور خاص چھوڑنے کے بعد میرا ان سے بہت زیادہ تعلق نہیں رہ سکا۔ اس

کے علاوہ ایک اور لڑکا جس کا نام انصار تھا اور جسے ہم ''موٹو انصار'' کہتے تھے میرے ساتھ ریلوے اسکول سے آیا تھا اور کالج تک میرے ساتھ رہا۔اب بھی اس سے کبھی کبھی رابطہ ہو جاتا ہے۔سندھی سیکشن کے دولڑکے،فیض محمد ہالیپوٹہ اور محمد حسین لغاری بھی پہلے اسکول، پھر کالج اور اس کے بعد میڈیکل کالج تک میرے ساتھ رہے۔فیض نے آنکھوں کے امراض میں اور محمد حسین لغاری نے انگلینڈ سے سرجری میں اعلیٰ اسناد لیں اور دونوں اپنے اپنے مضامین میں سندھ کے میڈیکل کالجوں میں پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ہم تمام لڑکے بہت جوش اور جذبے سے بھرے تھے اور میں خاص طور سے اپنی عادت کی وجہ سے بہت ہی بے صبر تھا کہ جلد پانچویں کی پڑھائی شروع ہو مگر ماسٹر سمیع صاحب شاید ان دنوں علیل تھے اس لئے وہ کلاس میں آتے تو تھے مگر دن کا زیادہ حصہ میز پر سر رکھ کر آنکھیں بند کئے رہتے تھے۔کبھی کبھار ہم لڑکوں سے کہہ دیتے کہ فلاں چیپٹر خود ہی پڑھ لو یا فلاں لفظ اتنی دفعہ لکھ ڈالو۔ادھر ایک تو میں ویسے ہی نہ جانے کس وجہ سے اپنی تمام زندگی بہت جلدی میں رہا ہوں۔پھر اردو کے دوسرے سیکشن میں جس کے انچارج مولانا خدا بخش تھے پڑھائی بہت زور وشور سے جاری تھی اور میں آتے جاتے دیکھتا کہ خدا بخش صاحب بڑی حد تک ناچ ناچ کر بلیک بورڈ پر نہ جانے کیا کیا لکھا کرتے تھے۔اور ان کی جماعت کے لڑکے یک زبان ہو کر ایک نعرے کی شکل میں انہیں جواب دیتے اسکے علاوہ ان کی کلاس کے لڑکے بھی ہمیں چڑھاتے تھے۔میں نے اپنی زندگی میں بعض دفعہ اپنی صاف گوئی، منہ پھٹ ہونے اور لیڈری کے شوق کی وجہ سے بہت مصیبتیں جھیلی ہیں۔ایک دن میں نے کلاس میں کھڑے ہو کر یہ کہہ دیا کہ سر آپ تو ہمیں کچھ پڑھاتے ہی نہیں اور دوسری کلاس میں مولانا خدا بخش صاحب تو نہ جانے کتنا آگے نکل گئے ہیں (حالانکہ ابھی صرف ایک ہی ہفتہ ہوا تھا) سمیع صاحب نے مجھے بہت گھور کر دیکھا اور کہا میاں اتنا پڑھاؤنگا کہ چیں بول پڑو گے اور اس کے بعد حقیقت میں انہوں نے بہت اور اچھا پڑھایا مگر اس کے ساتھ ہی کئی دفعہ میرے کان بہانے بہانے سے صرف اس لئے مروڑے کہ میں نے شکوہ کیا تھا۔اس مرحلے پر بھی مجھے ایک فائدہ اپنے گھر کے سماجی اور علمی ماحول کی وجہ سے ہوا۔اس جماعت میں انگریزی شروع ہوتی تھی۔یعنی انگریزی کی پہلی کتاب جو ''پرائمر'' کہلاتی تھی پڑھنی تھی۔یہ اے، بی، سی، ڈی سے شروع ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ مشکل ہوتی جاتی تھی یعنی اس میں الفاظ بعد میں آتے تھے۔میں نے اپنے گھر میں سلطانہ آپا اور سلطان بھائی جان سے پہلے ہی یہ کتاب پڑھ کر ختم کر لی تھی اور میں انگریزی کی دوسری کتاب کے بھی نصف پر تھا جبکہ باقی تمام دوسرے لڑکوں کے لئے یہ کتاب بالکل نئی تھی اس لئے بھی مجھے کلاس میں سبقت حاصل ہو گئی تھی مگر میرا حساب کمزور تھا (جو آج تک کمزور ہے) بہرحال ہائی سکول میں پہلا سال اچھا گذرا مگر سال کے آخیر میں جب سالانہ امتحان ہوا تو میں اول نہ آسکا اور شاید اصغر یا حبیب اول آئے (مجھے اس بات کی شرمندگی ہے کہ مجھے یہ یاد نہیں، بدقسمتی سے میرے کسی پرانے ہم جماعت کو بھی حتمی طور پر یہ یاد نہیں کہ اس جماعت میں کون اول آیا تھا)۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اللہ کی دی ہوئی قدرتی صلاحیتوں کی وجہ سے کامیاب تو تھا مگر میں خود پڑھائی یا محنت کے معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا اور زیادہ تر اپنی توجہ کھیل کود، کہانیوں کی کتابوں، ایم اسلم اور نسیم حجازی کے ناولوں، جنرل نالج اور موسیقی پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔دراصل میں اوّل آنے یا کسی اور طالب علم سے مقابلے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا۔اس لئے اوّل نہ آنے کا کوئی ملال نہ تھا۔

بہرحال چھٹی جماعت شروع ہوئی۔اس میں ہمارے استاد کچھ عرصے ایوب صاحب رہے اور اس کے بعد جمنا داس صاحب نے چارج سنبھالا۔ایوب صاحب سندھی تھے اور بہت ہی نیک اور خاکسار طبیعت کے انسان تھے۔شلوار قمیض پہنتے تھے اور ٹوپی لگاتے تھے۔انہی کی کلاس میں ہم نے سندھ کی تاریخ اور اس کے کلچر کا مطالعہ کرتے ہوئے مرزا قلیچ بیگ، رئیس احمد بھرگڑی، سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے متعلق پڑھا۔یہ کلاس اسکول کی مین بلڈنگ میں ہوتی تھی۔بہت کھلا کھلا کمرہ تھا اور اسکے دونوں جانب جافریوں والا برآمدہ تھا۔کلاس میں ایک فرحت بخش ٹھنڈک سی رہتی تھی۔ایوب صاحب کی جو بات مجھے اور یقین ہے کہ اور دوسرے لڑکوں کو بھی آج تک یاد ہوگی وہ یہ ہے کہ وہ جغرافیہ کا یہ سبق یاد کرانے کے لئے اگر کراچی سے سمندر کے راستے لندن کا سفر کیا جائے تو راستے میں کون کون سے سمندر اور بندرگاہیں پڑیں گی ہم سے کہتے تھے کہ آنکھیں بند کر کے تصور کرو کہ ہم بحری جہاز میں سفر کر رہے ہیں، پھر وہ کنٹری شروع کرتے تھے کہ اب جہاز نے سیٹی دی، پھر جہاز چلا اب ہم بحر عرب سے گذر رہے ہیں اور اب یہ بڑی بڑی لہریں آرہی ہیں اور اب دور سے عدن کی پہاڑیاں نظر آنے لگی ہیں اور اب ہمارا جہاز عدن کی بندرگاہ پر ٹھہرے گا۔اسی طرح وہ پورے ایک گھنٹے میں ہمیں بحر احمر، سوئز کنال اور بحر قلزم وغیرہ سے سفر کراتے ہوئے لندن کی بندرگاہ تک پہنچا دیتے۔بہت ہی خوبصورت انداز تھا اور وہ یہ بار بار کرتے تھے۔ہم تمام طلبہ کو بھی ان کا انداز بیان اتنا پسند تھا کہ ہم کبھی کبھی خود فرمائش کر کے ان سے کہتے تھے کہ ہمیں لندن کا سفر کروائیں۔چونکہ کم عمری ہی سے سلطانہ آپا اور سلطان بھائی جان کی باتوں کی وجہ سے میری روح دنیا کی سیاحی کے لئے بے قرار تھی (جس کا اس وقت کبھی پورے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا) اس لئے میں خاص طور سے ایوب صاحب کی باتوں سے بہت محظوظ اور مسحور ہوتا تھا۔مجھے اس پختہ عمر میں آکر اس کا یقین ہے کہ میری ہی طرح شاید انکی بھی دلی تمنا دنیا گھومنے کی ہوگی جو پوری نہ ہو سکی تھی شاید اس طرح کی باتیں کر کے وہ اپنا جی خوش کر لیا کرتے تھے۔اللہ ان کی روح کو جنت الفردوس میں میووں سے لدے باغات اور کوثر وتسنیم کی سیاحت سے سرفراز کرے آمین

ایوب صاحب کچھ عرصے بعد ٹرانسفر ہو کر کہیں اور چلے گئے اور ہمارے نئے استاد جمنا داس صاحب مقرر ہوئے۔یہ نسبتاً جوان، انتہائی گورے

چٹے تھے اور ہمیشہ بہت نفیس انگریزی لباس بشمول ٹائی پہنتے تھے۔ خاص طور سے گرمی میں انکا چہرہ سرخ ٹماٹر ہو جایا کرتا تھا۔ ان کا انگریزی کی تعلیم پر زیادہ زور تھا مگر یہ غصہ کے بہت تیز اور مار پیٹ کے بہت شوقین تھے مجھ سمیت کلاس کے سارے لڑکے کسی نہ کسی وجہ سے ان سے ضرور پٹے ہیں۔ ان کی ایسی کوئی بات مجھے یاد نہیں جس کا یہاں تذکرہ کیا جا سکے۔

یوم جمہوریہ پاکستان

۱۹۵۵ میں میں نے پانچویں جماعت پاس کر کے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تھا اور میں اس جماعت میں اپنے شفیق استاد ایوب صاحب کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ چھ سات ماہ کے بعد ان کے تبادلے کے بعد جمنا داس صاحب ہمارے استاد مقرر کئے گئے۔ ان کے حوالے سے مجھے انکا غصہ اور پڑھائی میں صرف انگلش پر زور کے علاوہ کوئی اور خاص بات یاد نہیں۔

بہر حال جیسا میں لکھ چکا ہوں انگلش میرا بہت مضبوط مضمون تھا اس لئے ان کی نظر میں میں کلاس کا سب سے ہوشیار لڑکا جانا جاتا تھا۔ مگر اپنی فطرت کی وجہ سے جو کسی قدر تشدد پسند تھی ماسٹر جمنا داس نے مجھے مار پیٹ سے معاف نہیں کیا تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے میرے گال پر زور دار تھپڑ جڑ دیا کرتے تھے۔ میں اپنی باتونی اور شریر فطرت یا ان کی کسی حرکت پر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے کے کان میں چپکے سے تبصرہ کرنے کی وجہ سے ان کو اس مار پیٹ کا کافی موقعہ فراہم کرتا تھا۔

چھٹی جماعت کا امتحان ۱۹۵۶ میں ہونا تھا۔ اس سے پہلے جو قابل ذکر واقعہ ہوا وہ قومی اہمیت کا حامل ہے۔ مارچ ۱۹۵۶ میں پاکستان کا پہلا آئین مکمل ہوا۔ اس سلسلے میں بہت بڑی بڑی تقریبات ہوئی تھیں یوں تو یہ تقریبات میر پور خاص میں بھی ہوئی تھیں مگر کراچی چونکہ اس زمانے میں پاکستان کا دارالخلافہ تھا اور آئین ساز اسمبلی بھی یہیں قائم تھی اس لئے وہاں جو تقریبات ہوئی تھیں ان کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ ایسی تقریبات شاید پھر پاکستان میں دوبارہ کبھی نہ ہو سکیں۔ یوں تو ہم میر پور خاص میں رہتے تھے مگر خاندان کے تمام کنبے کراچی میں تھے اور اس زمانے میں چاہتیں، محبتیں اور مروتیں بھی اپنی جگہ قائم اور زندہ تھیں۔ خاندان میں میرے تمام ہم عمر ساتھیوں اور میری امّاں کے بھائی اور بھتیجوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہم یہ تقریبات دیکھنے کراچی آ جائیں۔ میرے ابّا کو ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے مفت پاس ملتے تھے یوں ہم مارچ کے مہینے میں دو ہفتے کے لئے کراچی چلے گئے۔

ہم کراچی جا کر ہمیشہ مظہر ماموں جان کے یہاں جو برنس روڈ پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے ٹھہرا کرتے تھے۔ یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ انکا فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا اور اس میں دو بیڈ روم ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم اور تنگ سی راہ داری تھی جہاں باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ تھے۔ ان کا اپنا کنبہ کئی افراد پر مشتمل تھا اور ہم بھی کئی لوگ تھے مگر اس کے باوجود جس محبت سے وہ اور ہماری ممانی جان اور انکے بچے ہمیں رکھتے تھے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ میری اپنی ماموں زاد بہن غزالہ سے بہت ہی گہری دوستی تھی میں اس کے ساتھ گولہ گنڈا اور آئس کریم کھانے جاتا تھا۔ مجھے کراچی کی چوڑی چوڑی سڑکیں جن پر تیز رفتار ٹریفک کی بھرمار تھی پار کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا مگر غزالہ جو خود بھی بہت چھوٹی تھی مگر کراچی میں رہنے کی وجہ سے دلیر ہو گئی تھی میرا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کراتی تھی۔ غزالہ کی بڑی بہن انتخاب آپا میری منجھلی بہن ریحانہ آپا کی ہم عمر تھیں اس لئے وہ بھی پکی سہیلیاں تھیں۔ ہمارے آنے سے ان کے گھر میں جیسے عید ہو جاتی تھی اور جس دن ہمیں واپس میر پور خاص آنا ہوتا تھا سب بہت جذباتی ہو جاتے تھے۔ میری ممانی جان اور امّاں ایک طرف اور دوسری طرف ہم بچے گلے مل کر ضرور روتے تھے اور ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے بیٹے منظر بھائی جان ہماری بگھی (وکٹوریہ) کے ساتھ ساتھ اپنی سائیکل ڈال دیا کرتے تھے اور اس وقت تک جب تک ریل گاڑی روانہ نہیں ہوتی تھی وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے رہتے تھے۔ منظر بھائی جان تو ویسے بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اس سے پہلے جب میں اور چھوٹا تھا اور کراچی آتا تھا تو وہ مجھے اپنی سائیکل پر بٹھا کر شام کو بندر روڈ پر سیر کرانے لے جاتے تھے اور وہاں ایک ٹھیلے سے جس پر بہت سے انناس سجے ہوتے تھے انناس کا بیحد ٹھنڈا شربت پلاتے تھے۔ اسی جگہ کے قریب ڈاؤ میڈیکل کی شاندار عمارت تھی اور ایک دفعہ میرے پوچھنے پر کہ یہ کیا ہے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ میڈیکل کالج ہے اور یہ کہ یہاں سعادت ماموں جان کے صاحب زادے عشرت بھائی جان پڑھتے ہیں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ کہہ دیا تھا کہ میں بھی یہیں پڑھونگا اور ڈاکٹر بنوں گا (شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی) کیا اب وہ روائتیں وہ محبتیں وہ خلوص باقی ہیں؟؟ لوگ نہیں بدلتے صرف زمانہ انہیں بدلنے جانے پر مجبور کرتا ہے بقول علامہ اقبال

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

مگر اس دفعہ ہم ذوالفقار بھائی جان، جو میری سب سے بڑی خالہ کے بڑے بیٹے تھے، کے یہاں ٹھہرے۔ ذوالفقار بھائی جان کا تذکرہ میں گزشتہ ابواب میں بڑی تفصیل سے کر چکا ہوں اور یہ بھی کہ وقت کے ہاتھوں اور تقسیم اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قیام کی وجہ سے ان کے حالات بہت بدل چکے تھے اور وہ بہت اونچے عہدے کو چھوڑ کر پاکستان میں کچھ مشکل حالات سے گذر رہے تھے۔ اس وقت ان کا اپنا مکان نہیں تھا اس لئے وہ میرے رشتے کے ماموں سید صفات حسین جو پولیس میں ایک بڑے عہدے پر تعینات تھے اور مشن روڈ پر ایمپائر سنیما کے بالکل سامنے ایک سرکاری بنگلے میں قیام پذیر تھے، رہتے تھے۔ صفات ماموں ذوالفقار بھائی جان کی بیگم رشیدہ بھائی جان کے سگے بھائی تھے اور ان دونوں گھرانوں میں بہت ہی قربت تھی۔ یہاں آ کر مجھے اور بھی اچھا لگا اس لئے کہ یہاں بچوں کی ایک فوج تھی اور چونکہ میری طبیعت میں کسی قسم کی

جھجک نہیں تھی اس لئے نہ صرف میں ان تمام بچوں سے جلد گھل مل گیا بلکہ اپنی فطرت اور لفاظی کی وجہ سے جلد ہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

یہاں صفات ماموں کے بچوں میں وجاہت جو مجھ سے کچھ بڑا تھا مگر میری اس سے گاڑھی چھنتی تھی، فصاحت جو مجھ سے کچھ چھوٹا تھا اس سے بھی میں ان کے ڈرائنگ روم میں کشتیاں لڑتا تھا اور اس کے ساتھ کرائے کی سائیکلیں چلاتا تھا اور انکی بیٹی تانی، تھی۔ تانی کچھ کم گو اور الگ تھلگ سی رہتی تھی۔ ذوالفقار بھائی جان کے بڑے بیٹے انصار بھائی جان میری عمر کے نہ تھے اس لئے ان سے کوئی بہت زیادہ راہ رسم نہیں تھی۔ انہوں نے والی بال کا ایک کلب ''پیراگون'' کلب قائم کیا ہوا تھا اور وہ خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر والی بال کھیلا کرتے تھے۔ مگر ان کی تین بہنوں یعنی وجیہہ، نوشابہ اور رضوانہ (جو دراصل وجی، نوشی اور رضو کہلاتی تھیں) سے تو ایسی دوستی اور قربت تھی کہ بقول میری امّاں کے ان کے بغیر تو میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا تھا۔ وہ تینوں بھی مجھ سے جیسی محبت اور اپنائیت سے پیش آتی تھیں وہ ناقابل تحریر ہے۔ خدا کے فضل سے ان تینوں سے اب بھی وہی دلی قربت اور باہمی محبت کا رشتہ قائم ہے مگر وقت اور فاصلوں کی وجہ سے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں ان سے اس قدر مل سکوں جتنا میرا دل چاہتا ہے۔

بہر حال ۲۳ مارچ کے دن ''یوم جمہوریہ پاکستان'' کی تقریبات زور شور سے شروع ہوئیں۔ شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے جن پر صدر پاکستان اسکندر مرزا کی تصویریں تھیں۔ اخباروں نے خاص ایڈیشن نکالے تھے جن پر صدر کے علاوہ وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی بھی تصاویر تھیں۔ جگہ جگہ جلوس پریڈ اور ریلیاں تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں کی سجاوٹ تھی۔ مشن روڈ پر صفات ماموں کے بنگلے کے پاس ایک لڑکیوں کا سکول تھا جہاں میری خالہ زاد بہن کشور جہاں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ وجی نوشی اور رضو بھی وہیں جاتی تھیں۔ یہ سب سے پہلے مجھے اسی اسکول میں لے کر گئیں۔ کشور آپا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ان کے ہیڈ مسٹریس ہونے کی وجہ سے مجھ سے کسی نے اس بات کی پوچھ گچھ نہیں کی کہ میں لڑکا ہو کر وہاں کیوں آیا ہوں۔ چھوٹی سی تقریب ہوئی، کچھ تقریریں اور پھر مٹھائی بانٹی گئی جو ہم نے بہت شوق سے کھائی۔ دراصل وہاں جانے کی وجہ ہی یہ تھی کہ ہمیں معلوم تھا کہ مفت مٹھائی ملے گی۔ اس کے بعد سب بچوں میں ایک بہت ہی خوبصورت تمغہ جو اس قدر سنہری تھا کہ مجھے آج بھی خیال آتا ہے کہ وہ سچ مچ کے سونے کا تو نہیں تھا، بانٹا گیا۔ یہ ہرے اور سفید رنگ کے ربن کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور اس پر اردو میں بہت ہی خوبصورت ابھرے ہوئے الفاظ سے ''یوم جمہوریہ پاکستان/۲۳ مارچ ۱۹۵۶'' لکھا ہوا تھا۔ میں سالوں اس تمغے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا اور خاص طور سے میرپور خاص کے لوگوں کے لئے یہ ایک نادر چیز تھی کہ انہوں نے ایسا تمغہ اور کسی کے پاس نہیں دیکھا تھا افسوس کئی دفعہ گھر اور شہروں بلکہ ملک کی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ تمغہ کھو گیا۔ مگر اس کا اب کیا غم کہ جب سے اب تک کتنی دفعہ آئین توڑا گیا، کتنی دفعہ نئے آئین بنے اور کتنی دفعہ ''صدر'' مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے اور ''مارشل لا ایڈمنسٹریٹر'' صدر بن بیٹھے۔ مگر میرے معصوم ذہن پر اس دن کے جو نقوش بنے وہ اب بھی قائم ہیں۔ اسکول سے چھوٹ کر ہم ''ایمپائر'' سنیما کی طرف بھاگے کہ وہاں مفت فلم دکھائی جا رہی تھی۔ فلم تھی ''نوکر'' جو بے حد کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس میں نذیر اور سورن لتا تھے اور اسکا ایک گیت

راج دلارے۔۔۔ میری انکھیوں کے تارے
تو ہے دل میں بساؤں۔۔ تو ہے گیت سناؤں

اس قدر مشہور ہوا کہ اس نے مقبولیت کے کئی ریکارڈ توڑ دیئے۔ یہ کوثر پروین کا گایا ہوا تھا۔ شہر میں عید کا سماں تھا۔ سنیما سے نکلے تو ہر سڑک پر لوگوں کا ہجوم تھا ایک عجیب رونق تھی۔ میں سمجھا کہ بس اب یہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے مگر معلوم ہوا کہ اب شام کو شہر کا چراغاں اور رات کو کلفٹن کا میلہ دیکھنے جانا ہے۔

ہم بچوں کو چراغاں اور کلفٹن کا میلہ دکھانے کا انتظام صفات ماموں کی بیگم نسیم ممانی نے کیا تھا جو عام طور سے بچوں کی تفریح کے لئے کوئی نہ کوئی پروگرام ویسے بھی ترتیب دیتی رہتیں تھیں۔ شام کو ایک اونٹ گاڑی آ گئی۔ اس پر دریاں اور گدّے بچھے تھے اور کچھ گاؤ تکیے بھی تھے۔ ہم سب بچے جس میں رفن ماموں اور ہمو بھائی جان کے بچے بھی شامل تھے کچھ بڑوں کے ساتھ اس پر سوار ہو گئے۔ یقیناً کراچی میں اس رات کے بعد بھی چراغاں ہوئے ہونگے اور شاید اس سے اچھے چراغاں ہوں مگر مجھے اس رات کا چراغاں جیسا یاد ہے اور جو تصور میرے ذہن پر چسپاں ہے اس کے لحاظ سے اس سے بہتر چراغاں پھر دیکھنے کو نہیں ملا۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کی بلڈنگ، پی آئی ڈی سی ہاؤس، قانون ساز اسمبلی اور چیف کورٹ کی عمارتیں سفید قمقموں سے ایسی سجی تھیں کہ میں جو میرپور خاص جیسے چھوٹے شہر سے آ رہا تھا انہیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا اور میرا دل بھی اس خوشی اور فخر سے جھوم اٹھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ پھر ہماری اونٹ گاڑی کلفٹن کی طرف روانہ ہوئی۔ یاد رہے کلفٹن اس زمانے میں بہت دور تھا اور صدر کے بعد کلفٹن تک غیر آباد علاقہ تھا مگر اس دن ہزاروں لوگ پیدل کلفٹن کے لیے رواں دواں تھے اور نہ صرف سڑک بلکہ اس کے دونوں جانب لوگوں کا ہجوم کلفٹن کی جانب رواں تھا۔ کلفٹن کے پل تک پہنچتے پہنچتے اس قدر ہجوم تھا اور اس قدر کاریں، ٹرکیں، اونٹ گاڑیاں اور پیدل چلنے والے لوگ تھے کہ ہماری گاڑی اس میں پھنس گئی۔ بس اس سے آگے ہم نہیں جا سکے مگر اس میں بھی ایک مزہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ سمندر میں جہازوں پر بھی چراغاں کیا گیا ہے اور یہ جہاز قطار سے کھڑے ہیں اور یہاں سے بھی نظر آ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا دور سمندر میں کئی جہاز کھڑے تھے اور ان پر بھی زبردست چراغاں کیا گیا تھا۔ بہر حال ہم نے پانی پر یہ چراغاں دور ہی سے دیکھا، سجے ہوئے جہازوں کا عکس سمندر کے پانی میں جھلملا رہا تھا اور یہ ایک جادوئی منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے تو ایسے منظر کا تصور بھی

نہیں کیا تھا کہ تصور بھی اسی شے کا کیا جاسکتا ہے جس کی ذہن میں کوئی تصویر پہلے سے ہو یا جسکی کچھ آ گہی ہو۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان مناظر کا ایک ایسا نقش میرے ذہن پر ثبت ہے کہ میں اسے آج تک نہیں بھولا ہوں۔اس وقت تک میں بہت تھک چکا تھا اور چھوٹا بھی تھا۔اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ واپسی کیسے ہوئی کیونکہ میں وہیں اونٹ گاڑی پر بچھے ہوئے گدّے پر گہری نیند سو چکا تھا۔گھر آنے پر شاید مجھے رضونے جگایا تھا۔

کراچی کے اس سفر کے دوران دو شادیاں بھی ہوئیں اور میری امّاں کے بقول یہ بہت اچھا ہوا کہ ''ایک پنتھ دو کاج''۔

پہلی شادی میری بڑی خالہ بی کے بیٹے اقبال بھائی جان جنہیں ہم اُتی بھائی جان کہتے تھے کی ہوئی۔ان کے ولیمے کے دن ذوالفقار بھائی جان کی بڑی بیٹی صبیحہ آپا کی شادی ہوئی۔ان شادیوں سے پہلے گانوں اور رتجگوں کی محفلیں ہوئیں۔اُتی بھائی جان اس زمانے میں ''تن سازی'' کے شوق میں مبتلا تھے اور ایک مقامی انسٹیٹیوٹ میں ورزش کے لئے جاتے تھے۔ان کا جسم اس قدر خوب صورت تھا کہ وہ ''مسٹر پاکستان'' کے مقابلے میں جاسکتے تھے۔میں اپنے دبلے اور انتہائی دھان پان جثہ کی وجہ سے ''ڈیڑھ پسلی'' کہلاتا تھا۔جب وہ اپنی قمیض اتار کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے پٹھوں کی نمائش کرتے تھے تو مجھ سے مزید چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پیار میں طعنے دیا کرتے تھے۔ان کی دوسری وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ کراچی میں گوا (GOA) کی کمیونٹی کے بہت قریب تھے اور اپنے کرسچین دوستوں کی وجہ سے بڑی حد تک صرف انگریزی بولتے تھے اور انہی کے ساتھ کراچی کے ڈانس کلب میں انگریزی ڈانس بھی کرنے جاتے تھے۔بہر حال یہ شادیاں دلچسپ رہیں اور ان سب سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم واپس میرپور خاص آئے۔

دوسرے دن میں نے اپنے اسکول میں تمام لڑکوں بلکہ ماسٹروں کو بھی خوب خوب متاثر کیا کہ میں کراچی میں یوم جمہوریہ کی حیرت انگیز تقریبات دیکھ کر آرہا ہوں۔اس شیخی میں میری لفّاظی کے علاوہ ''یوم جمہوریہ تمغے'' نے میری بڑی مدد کی۔

''آج کا مشاعرہ''

ماضی میں مشاعرہ ایک تربیت گاہ ہوتا تھا۔لیکن آج کا مشاعرہ تربیت گاہ نہیں رہا۔اب اس کا شمار Performing Arts میں ہوتا ہے۔اب شاعر کو اسٹیج پر آ کر اپنی اداکاری سے سامعین کو متاثر کرنا پڑتا ہے۔اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ شاعر شعر پڑھنے کی باقاعدہ تربیت حاصل کرے اور اس سلسلہ میں اپنی سریلی آواز سے بھی فائدہ اٹھائے۔پھر یہ کہ اسٹیج پر آ کر اٹھنے، بیٹھے، پینے کھانے حتیٰ کے پبلک کا سامنا کرنے کے انداز میں بھی استغنا یا کم از کم لاابالی پن پیدا کرے بلکہ ہو سکے تو لڑکھڑا کر بھی دکھائے تا کہ سامعین کو یقین آ جائے کہ موصوف کے اندر تخلیقی دباؤ نے یہ حال کر دیا ہے۔دراصل آج کل کے مشاعرے سامعین اور شعراء کے درمیان ہونے والے دنگل ہیں، جب کوئی شاعر اس قسم کے دنگل میں ہارتا ہے تو اس کی ہار سے ہُوٹ کرنے والے سامعین کا مُوڈ شگفتہ ہو جاتا ہے اور جب شاعر کامیاب ہوتا ہے تو ہُوٹ کرنے والوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے؟۔۔۔۔بعض شعراء تخلیق کاری پر کم اور اداکاری پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں، مجھے یاد پڑتا ہے کہ کھنّیا لال کپور نے اپنے کسی مضمون میں ایک ایسے ہی فنکار کے بارے میں لکھا تھا کہ ایک روز کسی جان پہچان والے نے اس سے پوچھا:

''حضّت! یہ آپ نے ایک جراب الٹی پہن رکھی ہے۔خیریّت تو ہے نا؟''

اور حضّت نے جواب دیا ''قبلہ ہم تو فنکار آدمی ہیں، ہمیں سدھ بدھ ہی کہاں ہیں۔ہم تو ہمہ وقت عالمِ بالا میں رہنے والے لوگ ہیں''۔تب موصوف نے اپنی قمیض اتار دی اور کہا دیکھو۔''میں نے نیچے بنیان بھی الٹی پہن رکھی ہے۔ہوش میں ہوتے تو ان باتوں کا خیال رہتا''۔لیکن سب فنکار ایسے نہیں ہوتے مگر بیشتر اداکاری کرتے ہیں۔ایک بار میں نے ایک بزرگ شاعر کو مشاعرے کے لیے تیار ہوتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔موصوف نے پہلے تو اپنی اچکن کا بٹن غلط لگایا تا کہ اچکن ایک طرف سے ذرا اونچی دکھائی دے۔پھر انہوں نے اپنے لمبے لمبے بالوں کو بکھیر دیا تا کہ دیوانے نظر آئیں۔اس کے بعد موصوف نے منہ سے پان کا سرخ لعاب نکال کر اچکن کو داغدار کیا اور مشاعرہ پڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔لباس اپنے پہننے والے کی شخصیت، موڈ اور کردار کو ظاہر کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے مگر جب لباس شخصیت کو ظاہر کرنے کی بجائے چھپانے لگے اور ایک وضع کی شخصیت پر ایک اور قسم کی شخصیت کی چھاپ لگا دے تو صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔یوں لگتا ہے جیسے کوئی ڈرامے کی اسٹیج پر آ کر کسی اور کردار کی نمائندگی کر رہا ہو۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

فکرِ فردا

مذہبِ ابراہیمی اور ہمارا گاؤں

صفوت علی صفوت (نیویارک)

دوماہ پیشتر ''اسلامک سوسائٹی کنے ٹی کٹ مغرب'' کی جانب سے صدر محترم آصف اختر صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ کہنے لگے کہ قریبی گاؤں میں ایک چرچ کی جانب سے دعوت ہے کہ وہ ایک مکالمے کا سوچتے ہیں اور اس میں یہودی، عیسائی اور مسلمان مل بیٹھ کر اس موضوع پر مفصل گفتگو کریں کہ اُن کے ہاں ''خدا'' (God) کے نام کیا اور کتنے ہیں اور ہر مذہب کے پیروکار اپنے خدا کی کیسے عبادت کرتے ہیں اور اُسے کیسے پکارتے ہیں۔

جب بھی مسلمانوں (یعنی مسلمان اکثریت والے مسلم ممالک) سے گرمی سردی ہوتی ہے تو یہاں کے علماء کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں کے عیسائیوں کو جو کہ بھاری اکثریت میں ہیں، اسلام اور یہودیت کی بنیادی باتوں سے آگاہ کیا جائے۔ اگرچہ مجھ سے قابل اور بہتر لوگ اس کام کے لیے موجود ہیں اس بار میری شامت آئی۔ اس سے پہلے بھی مجھے 9/11 کے واقعہ کے فوراً بعد ایک بہت بڑے چرچ میں سینکڑوں لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ بس خدا نے عزت رکھ لی۔ اُس کی روداد کلکتہ سے نکلنے والے ''انشاء'' میں چھپ چکی ہے۔ اس بار گلزار جاوید صاحب نے چہارسُو کے لئے اس تحریر کے لئے ڈرایا دھمکایا مجبور ہو کر چند باتیں لکھے دیتا ہوں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ چرچ میں بیٹھے ہوئے لوگ انتہائی تہذیب یافتہ تھے نہ کوئی نعرے بازی تھی نہ ادھم دھکڑ۔ پروگرام صبح اتوار 11 بجے شروع ہوا۔ سب سے پہلے چرچ کے منتظم نے رہبائی آئزن کریمر اور میرا تفصیل سے تعارف کرایا۔ یہودی رہبائی کو وہاں کے لوگ پہلے سے جانتے تھے لہٰذا زیادہ تر بات یہ ہوئی کہ مسلم مقرر ایک پروفیشنل مولوی نہیں بلکہ ایک سائنس دان ہیں جو کہ اس ملک میں چالیس برس سے مقیم ہیں اور امریکہ کی مشہور زمانہ NASA تک میں کام کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ محفل اور بھی ہمہ تن گوش ہوئی۔ میں اپنا تعارف سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح سے یہ برف پگھلے گی اور بات خدا کے نام سے کہیں سیاست کو آئی تو کیا کہوں گا؟

اس چرچ کے سینئر منسٹر ''چلالی'' نے پہلے ہی رہبائی اور مجھ سے تمام پروگرام طے کر لیا تھا۔ لہٰذا ہم تینوں نے یہ بات مانی کہ پہلے رہبائی اور پھر منسٹر اور دونوں کے بعد میری باری آئے گی۔ بعد ازاں ہم تینوں ایک دوسرے سے سوالات کریں گے۔ اُس کے بعد عوام کو سوال پوچھنے کی اجازت دی جائے گی اور ہم تینوں اپنے اپنے عقیدے کے مطابق جواب دیں گے۔

رہبائی آئزن کریمر نے بات شروع کی اور بتایا کہ یہودی مذہب میں خدا کے نام کی اتنی عزت ہے کہ ہم براہ راست اُس کا ''اصل نام'' لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور بات یوں کرتے ہیں کہ ہم کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ''خدا'' ہی کو پکار رہے ہیں مگر درمیان میں انتہائی عزت کی وجہ سے پورا نام نہیں لیتے خاص طور پر ہیکل کے اندر۔ انگریزی میں مثال یوں دی کہ ہم ''GOD'' کہنے کی بجائے G-D کہہ دیتے ہیں۔ تاہم رہبائی نے چند ناموں کا تذکرہ تفصیل سے کیا۔ میں اُن کی تقریر کے نوٹس (Notes) لے رہا تھا۔ ایک لفظ جو اُن کے ہاں (یعنی عبرانی زبان میں) استعمال ہوتا ہے وہ ہے ''اِلوھم'' (Elohem)۔ اس نام کی خاص بات یہ ہے کہ عربی میں اُسی روٹ سے نکلتا ہے جس سے اِلٰہ نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک اور نام جو کہ عبرانی زبان میں ہیں وہ انگریزی میں ہم Adona لکھیں گے۔ میں بعد میں بھی اس لفظ پر غور کرتا رہا۔ عبرانی اور عربی زبان کی مماثلت کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے معانی ایک ایسی ذات کے ہیں جو کہ ''دُنیوی'' نہ ہو یا صرف دُنیا کی نہ ہو۔ واللہ اعلم!

اس کے بعد محترم میزبان ''چارلی ہیمبرک سیٹو'' Charles Hambrick Stow کی باری آئی۔ اُنہوں نے یہ کہا کہ ان کے نزدیک عبرانی زبان کے نام بھی موزوں ہیں تاہم عیسائی دنیا میں جو سب سے اہم لفظ ہے وہ ہے ''اَبّ'' بمعنی ''والد'' یا انگریزی میں ''Father'' کے ''Father in the Heaven''۔ وہ ذات جو کہ بہشت میں ہے اور یہ کہ وہ نہ صرف لوگوں کا بلکہ تمام کائنات کا ''باپ'' ہے اور ہم سب اُس کے بچے ہیں۔ اور یہ کہ عیسیٰؑ بھی اسی طرح اُس کے ایسے بچے ہیں جو کہ ہم سب کے لیے انتہائی محترم ہیں۔ لہٰذا ہمارے مذہب میں عبرانی اور عربی زبان کے لفظ ''اَبّ'' کی زیادہ اہمیت ہے اور ہم اپنی ہر دعا اور Prayer میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اب چونکہ ہماری عبادت تقریباً ساری کی ساری انگریزی ہوتی ہے لہٰذا ''Father'' کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ راقم جیسے رہبائی کی تقریر کے نوٹس لے رہا تھا ایسے ہی منسٹر صاحب کی تقریر بہت غور سے سُن رہا تھا اور نوٹس لے رہا تھا۔ کئی اور باتیں بھی ایسی کہیں کہ جس سے یہ ظاہر ہوا کہ عیسیٰؑ نے یہ کہا ہو ''میں اور خدا ایک ہیں''۔ یوحنّی کی انجیل کا حوالہ دیتے ہوئے۔ ''I and my Father are one'' یہ الفاظ John Chapter X-V.30 میں موجود ہیں۔ اُن کی تقریر ختم ہوئی تو میری باری آئی۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنی تقریر کا لبِ لباب پیش کروں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حاضرین میں 150 کے قریب عیسائی اور یہودی موجود تھے۔ ہم مسلمانوں میں تین آدمی مسجد کی طرف سے تھے اور میری فیملی کے لوگ (میری دو بیٹیاں اور میرا بیٹا) اور اس کے علاوہ میرا پہلا نواسا جو کہ صرف چھ ماہ کا ہے وہ بھی موجود تھا۔ چرچ کی تمام خواتین اُس کی طرف متوجہ تھیں۔ بادل نا خواستہ میں کھڑا ہوا۔ یہ بات سوچ کر کہ کہاں پروپیگنڈہ یہ ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا کہ جب دو بڑے بھائی اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار

کر چکے ہیں تو مجھے اب تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔اس پر بہت زور سے قہقہوں کی آواز آئی اور تالیاں بجیں پھر یہ کہا کہ میرا نواسہ (6ماہ کا) یہاں اس لئے موجود ہے کہ وہ میری سیکورٹی فورس کا انچارج ہے اس پر ایک مزید قہقہہ لگایا گیا۔ایک عورت نے کہا کہ ''We love your Grandson'' دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ شائد یہ اچھا شگن ہے۔

اسلام کی چند بنیادی باتیں بتانے کے بعد کہا کہ قرآن کی پہلی ہی آیت جو محمدؐ پر نازل ہوئی اس میں سب سے پہلے لفظ خدا کے لئے ''رب'' کا استعمال ہوا۔ ''اِقْرا بہ اسم ربّ'' ۔ربّ کے معانی ہیں وہ ذات جو تخلیق کرتی ہو۔جو زندگی کا سہارا ہو۔جو اُس کو متاع دیتی ہو۔اور یہ کہا کہ انگریزی میں ہم ربّ کا ترجمہ ''Pro-life'' کر سکتے ہیں یعنی یہ لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس پر مزید قہقہہ لگا۔یاد رہے کہ اس ملک میں Abortion کی مخالفت میں یہ لفظ Ao-life استعمال ہوتا ہے۔یعنی اگر ہم تینوں ایک ہی سوچ کی بات کریں تو خدا زندگی بخشتا ہے۔انہیں جملوں کو آگے بڑھاتے ہوئے قرآن کے اگلے جملہ الفاظ کا ذکر کیا۔کہ رب کی تعریف خود قرآن نے کردی۔ الـذی خَلَق ۔ یعنی یہ وہ ذات ہے جس نے تخلیق کیا۔ ''خلق الانسان من علق'' انسان کو تخلیق کیا ایک نطفے سے۔یہ بات بھی بتائی کہ علق میں معلق کا گمان بھی ہوتا ہے جو اس کے بنیادی (Root) معنی کی نشاندہی کرتا ہے۔انگریزی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''It clings to thewall of the uterus'' ایک لمحے کے لئے چرچ میں بیٹھے ہوئے لوگ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔تو میں نے اُنہیں یاد دلایا کہ اسلام کی یہ کتاب سائنس کے بہت نزدیک ہے۔ہماری کتاب یہودی کتابوں کے ڈیڑھ ہزار سال بعد لکھی گئی۔اس لحاظ سے بھی یہ سائنسی حقائق کی بہتر ترجمانی کرتی ہے۔میری اس بات کا یقیناً اثر ہوا کیونکہ بعد کے سوالات کے درمیان مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ آخر میں سائنسدان ہونے کے ناطے خدا میں اور اُس کے وجود کا کیسے اعتبار کرتا ہوں۔چونکہ یہاں بات خدا کے ناموں کی ہو رہی تھی، راقم نے یہ کہا کہ خدا کی وحدانیت میں ہم مسلمان لوگ یہودیوں کے زیادہ نزدیک ہیں۔اسکے برعکس نسلی تعصب کی نفی میں عیسائیوں کے زیادہ قریب ہیں۔آگے الحمد شریف کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اللہ ایک ایسا لفظ ہے جو کہ ''واحد'' ہے۔نہ مذکر نہ مؤنث، نہ ہی جمع کا کوئی صیغہ ہے۔اس طرح رحمان کے معانی میں بھی لفظ رحمٰن کا کوئی مؤنث نہیں نہ ہی جمع اور صرف واحد کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

آخر میں بہت ہی اہم بات کہی جو کہ حضرت عیسیٰؑ کے منہ سے نکلی ہوئی اور تمام تر ٹرانسلیشن اور ہر قسم کی اونچ نیچ کے باوجود اُنہیں الفاظ میں موجود ہے جو کہ اُنہوں نے خود استعمال کی۔جس کا ترجمہ آج تک نہ ہو پایا اور وہ انجیل میں موجود ہے۔اللہ، الٰہ، الوھم، الٰہی، الائی (عبرانی زبان میں) ان سب کا روٹ ایک ہی ہے اور یہی الفاظ خود عیسیٰؑ نے استعمال کئے ''الائی الائی لما سبقتنی'' الٰہی الٰہی لما سبقتنی'' عربی زبان میں۔یعنی اے الٰہ اے الٰہ '' O God why have you fore saken me ''یعنی اللہ تینوں مذاہب میں موجود ہے اگر آپ سوچیں اور غور کریں۔ظاہر ہے کہ اللہ کا لفظ عہدِ جاہلیہ کے عربوں میں موجود تھا۔مگر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی زبان سے آیا تھا اسی لئے الوھم آج بھی عبرانی زبان میں موجود ہے۔

ابھی یہیں تک لکھ پایا تھا کہ میرے لئے ایک اور حکم ٹیلی فون پر موصول ہوا چند روز پیشتر جناب ڈاکٹر مولوی محمد اسماعیل آزاد صاحب کی نئی کتاب ''امام ابوحنیفہؒ '' احوال وکوائف چھپی تھی۔ٹیلی فون پر جناب غلام مرتضیٰ راہی صاحب تھے بتایا کہ جو نسخہ مجھے ملنے والا ہے وہ اس کتاب کا اوّلین نسخہ ہے۔ اور جناب آزاد صاحب نے مجھے سب سے پہلے بھیجا ہے۔آپ کو بھی خبر دیتا ہوں کہ یہ نسخہ مجھے مل گیا ہے۔پہلے دو باب پڑھ چکا ہوں۔یقین جانیے کہ اس قسم کی کتابیں اب کم ہی لکھی جاتی ہیں۔سوچتا ہوں کہ آئندہ مضمون میں چرچ میں کئے گئے سوالات کا جواب لکھوں اور چند باتیں ابوحنیفہ کے متعلق اور حضرت اسماعیل آزاد صاحب کی کتاب پر کی جائیں۔انشاءاللہ۔

DAME IS NO MORE

ڈیم کا خطاب پانے والی ہالی وڈ کی مشہور و معروف اداکارہ الزبتھ ٹیلر انتقال کر گئیں۔

پیدائش: ۲۷فروری ہیمسٹڈ،لندن، یوکے
والد: فرانسس لین ٹیلر
والدہ: سارہ سودن
تعلیم: تین سال کی عمر سے آغاز
فلمی کیئر: ۱۹۴۲ء سے ۲۰۰۳ء
مشہور فلمیں:

1. Jiant 2. There is one born every minute 3. Butter field 8 4. cleopetra 5. Night watch 6. Winter kills 7. Hammesmith is out

شادیاں: (۱) ۶مئی ۱۹۵۰ء تا ۲۹جنوری ۱۹۵۱ء ہمراہ کونارڈ ہلٹن،
(۲) ۲۱فروری ۱۹۵۲ء تا ۲۶جنوری ۱۹۵۷ء ہمراہ مائیکل ویلڈنگ،
(۳) ۲فروری ۱۹۵۷ء تا ۲۲مارچ ۱۹۵۸ء ہمراہ مائیکل ٹوڈ،
(۴) ۱۲مئی ۱۹۵۹ء تا ۶مارچ ۱۹۶۴ء ہمراہ ایڈی فشر،
(۵) ۱۵مارچ ۱۹۶۴ء تا ۲۶جون ۱۹۷۴ء ہمراہ رچرڈ برٹن،
(۶) ۱۷اکتوبر ۱۹۷۵ء تا ۲۹جولائی ۱۹۷۶ء ہمراہ رچرڈ برٹن،
(۷) ۴دسمبر ۱۹۷۶ء تا ۷نومبر ۱۹۸۲ء ہمراہ جان وارنر،
(۸) ۱۶اکتوبر ۱۹۹۱ء تا ۱۳اکتوبر ۱۹۹۶ء ہمراہ لیری فورٹینسکی،
وفات: ۲۳مارچ ۲۰۱۱ء لاس اینجلس، کیلی فورنیا۔

فیض اور صنفِ نعت

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ
(نیویارک)

فیض کے مجموعہ ''شامِ شہرِ یاراں'' کے آغاز میں پاکستان کے ایک مقبول افسانہ نگار جناب اشفاق احمد صاحب (۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۴ء) کا لکھا ہوا ایک مختصر مضمون درج ہے جس کا عنوان ہے ''ملامتی صوفی''۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

''میرا اور فیض صاحب کا نظریاتی اختلاف ہے۔ میں ایک شرعی آدمی ہوں اور فیض صاحب ملامتی صوفی ہیں۔ فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی سلسلہ میں بیعت کر کے نہیں کیا نہ ہی میرے اندازہ اور تحقیق کے مطابق انہوں نے وردِ وظیفہ یا چلہ کشی کی ہے۔ انہوں نے صوفیا کا ایک تیسرا راستہ اختیار کیا ہے جو مجاہدے پر محیط ہے۔ اس کو بزرگانِ دین ادب اور تواضع کا نام دیتے ہیں۔

یہ ادب، یہ صبر، ایسا دھیما پن اس قدر درگذر، کم سخنی اور احتجاج سے گریز۔ یہ صوفیوں کے کام ہیں۔ ان سب کو فیض صاحب نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اوپر سے ملامتی رنگ یہ اختیار کیا ہے کہ اشتراکیت کا گھنٹہ بجاتے پھرتے ہیں کہ کوئی قریب نہ آئے اور محبوب کا راز نہ کھل جائے۔ واہ باباٹل کیا کہنے۔

میری اور باباٹل کی نہیں بن سکتی لیکن کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموش اور چپ چاپ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرورِ کائنات کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کبھی کسی بدزبان، شُدھُو، بداندیش، یہودی دکاندار کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے: ''آج فیض کو بھیجو۔ یہ بھی دھیما ہے صابر ہے بُردبار ہے۔ احتجاج نہیں کرتا۔ پتھر بھی کھالیتا ہے ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے''۔

مجھے جب جناب طاہر خان صاحب کی طرف سے حکم ملا کہ میں فیض صاحب کے حوالے سے کچھ کہوں تو میں بھی عجب کشمکش میں پڑ گیا۔ مجھے کبھی فیض صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا اور جو حوالے ان کے اشعار اور ان کی تحریروں کے ذریعے مجھ تک پہنچے ہیں ان کی بنا پر میں بھی یہی کہوں گا کہ میری اور فیض صاحب کی دوستی ممکن نہیں۔ پھر خیال آیا کہ صوفی ازم کا قائل تو میں ضرور ہوں اور فیض صاحب چلئے ملامتی صوفی ہی سہی صوفی تو ہیں۔ اس اطمینان بخش خیال کے باعث میں نے حامی بھر لی کہ چلئے میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔

فیض صاحب کے شائع شدہ کلام میں ایک نعت ملتی ہے جو فارسی زبان میں ہے اور صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نعت ان کے آخری مجموعہ ''غبارِ ایام'' کے آخری صفحے پر رقم ہے اور اس نعت کا انداز و اسلوب ایسا ہے کہ نعتیہ ادب کے حوالے سے اس جیسا انداز اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ نعت انہوں نے کب کہی اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا مگر لگتا ہے کہ غالباً انہوں نے یہ نعتیہ اشعار اپنی عمر کے آخری دور میں کہے ہونگے۔ اس نعت نے نعتیہ ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے جو شائد اردو ادب کے ناقدین اور بالخصوص نعتیہ ادب کے ناقدین کی نظر سے اب تک اوجھل ہے۔ ان پانچ اشعار میں جس سلیقے، جس احترام اور جس پاکیزہ جذبے کے ساتھ فیض نے پیغمبرِ آخر الزماں سرورِ کائنات کے ہاں اپنے دور کے حالات کی خبر پہنچائی ہے اور جس یقین کے ساتھ آپ ﷺ کے شافعِ محشر ہونے اور مظلوموں اور بیکسوں کے غمخوار ہونے کا اظہار و اعتراف کیا ہے وہ نعتیہ ادب میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اس نعت کے اشعار پیش کرنے سے پہلے میں بغرض تمہید اور فیض صاحب کی شاعری کے تعارفی حوالے سے ان کے تین نمائندہ اشعار پیش کروں گا تاکہ آپ کی فکر اور آپ کے احساسات اس چمنستان کی طرف مرکوز ہو جائیں جس کے رنگوں نے فیض احمد فیض کی قبائے سخن سجائی ہے اور جس کی مہک ان کے اشعار میں ڈھل کر ان کے قارئین اور سامعین کو مسرور و مسحور کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ یہ اشعار بھی ان کے مجموعہ ''غبارِ ایام'' سے لیے گئے ہیں:

بہت ملا نہ ملا زندگی سے، غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

کرے نہ جگ میں الاؤ، تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے

ان تین اشعار میں میرے خیال کے مطابق فیض صاحب کی مکمل زندگی کی جھلک مل جاتی ہے۔ پہلے شعر میں وہ اپنی زندگی کے اثاثے کی بات کر کے اس سلیقے سے اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ قناعت کے سامنے شکایت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ دوسرے شعر میں وہ ہر اس شعر کو لغو اور وقت کا زیاں سمجھتے ہیں جس میں اثر نہ ہو اور جو دل و دماغ پر انقلاب نہ لا سکے۔ تیسرے شعر میں وہ اپنے طرزِ زندگی پر خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں اور زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کیلئے بزمِ نشاط کے رچانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مری نظر میں یہ اشعار فیض صاحب کی سوچ اور ان کے طرزِ زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ اب اس

سوچ اور طرز زندگی کا حامل انسان جو باہنر بھی ہے اور باخبر بھی، جب حالات سے مایوس ہو کر حضور سرورِ کائنات کی نسبت اپنی زبان کھولتا ہے تو جو الفاظ نکلتے ہیں ان میں روائتی نعتیہ انداز کی بجائے ایسے موضوعات سامنے آئیں گے جو منفرد اور مختلف ہی نہیں بلکہ قاری یا سامع کو چونکا دینے والے بھی ہوں گے۔

اس نعت کی خصوصیت یہ ہے یہ نعتیہ ادب کے خصوصی مضامین یعنی سرکارِ دوجہاں کی سراپا نگاری، مولود نگاری، تقدسِ سرزمینِ طیبہ، امیت، مہرِ نبوت، باعث تخلیقِ کائنات وغیرہ سے ہٹ کر محض بشری مشکلات اور اپنے مشاہدات کا تذکرہ ذاتِ خیرالبشر کے سامنے کر کے عدل کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہیں بخوبی خبر اور مکمل یقیں ہے کہ حضورِ اکرم محشر کے روز میدانِ محشر میں موجود ہوں گے اور وہاں اس عدالت میں ظالمانِ جہاں کی باز پرس بھی ہوگی اور مظلومین کی تشفی اور سرخروئی کا اہتمام بھی۔

اس نعت کے حوالے سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ اکثر شعراء کے ہاں نعت کا مقام کلام کے آغاز میں ہوتا ہے اور غیر نعت گو شعراء اگر تبرکاً نعتیہ اشعار کہیں تو اُسے کتاب کے شروع میں حمدِ باری تعالیٰ کے بعد صرف نعت ہی سے اپنے کلام کا آغاز کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے اسے کتاب کے آخر میں جگہ دی ہے جو ان کی افتادِ طبع کی غمازی کرتی ہے۔

فیض کی نعت

اے تُو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو
آوردہ اُم سرائے دِگر از برائے تو

(اے سرورِ کائنات آپ ہر رنجیدہ دل کی رہائش گاہ ہیں یعنی ہر رنجیدہ دل میں رہتے ہیں۔ میں بھی اپنا رنجیدہ دل لیکر آپ کیلئے ایک اور رہائش گاہ لایا ہوں)

خواجہ بہ تخت بندہ تشویشِ ملک ومال
برخاک رشکِ خسروِ دوراں گدائے تو

بادشاہ تخت نشین ہو کر بھی ملک اور دولت کا غلام ہے مگر آپ کا غلام، گو خاک پر بیٹھا ہے اس کا مقام بادشاہوں کیلئے باعث رشک ہے۔

آنجا، قصیدہ خوانیِ لذاتِ سیم وزر
اِینجا فقط حدیثِ نشاطِ لقائے تو

وہاں یعنی بادشاہوں کے ہاں سونے اور چاندی کے خزانوں کی لذت کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور فقیروں کے ہاں صرف محبت کی زبان میں آپ کے پیکرِ اطہر کے دیدار کے تذکرے رہتے ہیں۔

آتش فشاں زقہر وملامت زبانِ شیخ
ازاشک ترزِ دردِ غریباں ردائے تو

شیخ کی زبان سے ملامت اور قہر ایک آتش فشاں کے لاوے کی طرح نکلتا ہے لیکن غریبوں اور مسکینوں کے درد کو دیکھ کر آپ کی چادرِ پاک آنسوؤں سے نم رہتی ہے۔

باید کہ ظالمانِ جہاں راصدا کُنَد
روزے بسوئے عدل وعنائت صدائے تو

یقیناً حشر کے روز دنیا جہان کے ظالموں کو بلوایا جائے گا آپ کے حکم سے تاکہ عدل وانصاف کیا جائے۔

تضمین بر کلامِ فیض

ہے نورِ ذات کیا، شانِ شہِ اُمم کیا ہے
ترے مقام کو سمجھے خرد میں دم کیا ہے

مآل زہد وعبادت ہے کیا، گداز بغیر
بغیرِ عشق محمد ﷺ کمر کا خم کیا ہے

ہوئے وہ عرش پہ مہمان اپنے خالق کے
عیاں ہے آپ پہ، ہے لوح کیا، قلم کیا ہے

یہ بات روزِ قیامت کھلے گی عالم پہ
مقامِ دستِ شفاعت ہے کیا، کرم کیا ہے

ہم ایسے لوگ محبت کے راز کیا جانیں
نگاہِ شوق میں کعبہ ہے کیا صنم کیا ہے

ہزار علم و ذہانت پہ کوئی ناز کرے
ہوا غلام نہ ان کا تو محترم کیا ہے

تخلیقِ کائنات وغیرہ سے ہٹ کر محض بشری مشکلات اور اپنے مشاہدات کا تذکرہ ذاتِ خیرالبشر کے سامنے کر کے عدل کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہیں بخوبی خبر اور مکمل یقیں ہے کہ حضورِ اکرم محشر کے روز میدانِ محشر میں موجود ہوں گے اور وہاں اس عدالت میں ظالمانِ جہاں کی باز پرس بھی ہوگی اور مظلومین کی تشفی اور سرخروئی کا اہتمام بھی۔

''تصویر''

علامہ انور صابری مائیک پر تشریف لائے تو فوٹو گرافر نے ان کی تصویر لے لی۔ مولانا نے ازراہِ انکسار کہا ''بھائی میری فوٹو کس لیے لے رہے ہو؟'' فوراً جواب آیا۔ ''مولانا! یہ بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی''۔

مزاح کا ایٹمی سائنسداں

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

دو ہفتے ہوئے جب حفیظ میمن صاحب نے ہم سے کہا کہ خاکہ لکھنا ہے تو ہم نے ان سے عرض کیا ''بھائی جو خود خاکی ہو وہ بھلا دوسرے کا خاکہ کیا لکھے گا؟'' تاہم انہوں نے وضاحت کی جس کا خاکہ لکھنا ہے وہ بھی خاکی ہے۔ ہم سمجھے یہ کسی وردی والے کی بات کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کہنے والے تھے کہ اس کام کے لیے ہم قطعاً Unworthy ہیں لیکن انہوں نے یقین دلایا کہ اُس کا تعلق آپ ہی کی برادری سے ہے۔ پھر جب اس ہستی کا نام سامنے آیا تو ہم نے اس ''اقربا پروری'' کو ایک سعادت سمجھ کر قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ خاکہ حاضر ہے جو اپنی فطرت میں نہ ہلکا ہے نہ بھاری ہے۔

صاحبو، مزاح لکھنا کوئی مذاق نہیں۔ ایک سنجیدہ گو شاعر نے کہا تھا۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اندازہ لگائیے کہ جب ''مصرعِ تر'' اتنی مشکل سے جنم لیتا ہے تو ''مصرعِ شر'' کس طرح برآمد ہوتا ہوگا؟ اور جو اپنی پوری زندگی اسی ''افزائش نسل'' میں گزار دے اس کے ڈیل ڈول کا اتنا ہی حصہ بچ رہتا ہے جتنا اب مشاق یوسفی صاحب کا بچا ہے یا انور مسعود صاحب کا رہ گیا ہے حضرت ضمیر جعفری اور ضیاء الحق قاسمی (مرحومین) کو Exceptions میں سمجھئے۔

حاضرینِ کرام! جو کام کسی زمانے میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی نثر کیا کرتی تھی وہی کام دورِ حاضر میں انور مسعود کی شاعری کر رہی ہے۔ وہ تڑپا کر رُلاتے تھے یہ پھڑکا رلاتے ہیں۔ وہاں آہ تھی، یہاں واہ ہے۔ ہم نے اکثر مشاعروں میں انور مسعود صاحب کے سامعین کو ہنستے ہنستے روتے دیکھا ہے خاص طور پر اس وقت جب یہ ''بنیئوں'' کی کلیرنس سیل لگاتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر جب یہ ہانڈی میں ڈالنے کے لیے سبزی کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو فیصلہ خاتون خانہ اپنا ڈیپ فریزر کھول کر دو سیکنڈ میں کر لیتی ہے پروفیسر انور مسعود اُسے بھارت کے ساتھ ''جامع مذاکرات'' کی طرح طول دیتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک سبزی کے محاسن اور مفاسد اتنی باریک بینی کے ساتھ ذہن نشین کراتے ہیں کہ محفل میں بیٹھے ہوئے سخن فہم ان کی ''کچن فہمی'' کے قائل ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تو گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان سے پیشے کے انتخاب میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟ یہی ایک عظیم فنکار کا کمال ہے۔

ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ مزاح کے بعض شعرا کو سن کر اور پڑھ کر راشد الخیری والے آنسو ہی نکلتے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے مزاح اور مخول کے فرق کو مٹا دیا ہے اور مخول بھی ایسا جو ماحول کو مکدر کر دے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعری کا عام معیار زوال پذیر ہے۔ ایک سینئر شاعر ایک روز اپنی غزل لکھ کر فارغ ہوئے اور پانی پینے کے لیے اپنی اسٹڈی سے باہر نکلے۔ واپس لوٹے تو غزل غائب تھی جو بہت تلاش کے باوجود نہ ملی۔ انہوں نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی سے شکوہ کیا ''تم اس کا خیال نہیں رکھتیں۔ یقیناً اس کمبخت نے میری غزل چولھے میں ڈال دی ہے''۔ ان کی بیوی نے کہا ''خدا کا خوف کریں۔ اتنا سا بچہ آپ کی غزل پڑھ سکتا ہے؟''

انور مسعود جیسے گنے چنے باشعور، تعلیم یافتہ اور صاحبِ بصیرت اہلِ سخن نے نہ صرف شاعری کا معیار بلند کیا ہے بلکہ شاعروں کی توقیر میں بھی اضافہ کیا ہے ورنہ اس سلسلے میں بھی صورتِ حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔

ان کا ایک وصف یہ ہے کہ یہ صنف کی قید سے آزاد ہیں۔ ہماری مراد ان کی اپنی صنف سے نہیں بلکہ صنفِ ادب سے ہے۔ یہ نظم اور نثر دونوں میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں لیکن بحرِ ظلمات سے دور رہتے ہیں۔ انہیں بیک وقت کئی زبانوں پر عبور ہے یعنی اردو، پنجابی، فارسی اور انگریزی۔ شاعری ہو یا عام گفتگو۔ یہ ایک زبان کو دوسری میں، دوسری کو تیسری میں اور تیسری کو چوتھی میں اتنی صفائی کے ساتھ داخل کر دیتے ہیں کہ پانچویں زبان وجود میں آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ قطعہ دیکھیئے۔ اس میں ایک پورا مصرع انگریزی کا ٹانک دیا ہے:

سن کر بات معالج کی
کیوں میں اس پر کردوں رِٹ
کھجلی پر یہ رائے دی
You will have to
live with it

اس طرح کہنا چاہیے کہ انہیں پانچ زبانوں پر دسترس ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہوگئی اور اُردو قومی، فارسی میں یہ تدریس کرتے ہیں۔ پنجابی مادری زبان ہے اور پانچویں ان کی اپنی زبان ہے۔ انہیں بولتے اور شعر پڑھتے سُن کر ماننا پڑتا ہے کہ انسان واقعی حیوانِ ناطق ہے۔

انور مسعود صاحب کا کلام اس لیے زیادہ پسند کیا جاتا ہے کہ اس میں مزاح کے ساتھ ساتھ Message بھی ہے۔ دورِ حاضر کے مصائب و مسائل پر ان کی گہری نظر ہے اور عوامی رجحانات و میلانات کا یہ مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ہم اپنے اس خاکے کو پروفیسر صاحب کے بہت زیادہ اشعار سے بوجھل نہیں کرنا

چاہتے کیونکہ ہم نقاد نہیں، محض نثار ہیں لیکن Message والی بات نوک قلم پر آ ہی گئی ہے تو ایک قطعہ پیش خدمت ہے کہتے ہیں:

اجڑا سا وہ نگر کہ، ہڑپہ ہے جس کا نام
اس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہوسکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

انور مسعود کی ایک خوبی ان کی طرز ادا ہے۔ آپ ان کا کلام پوری محویت کے ساتھ انہیں دیکھتے ہوئے سنیں تو قائل ہو جائیں گے کہ شاعری ایک Performing art بھی ہے۔ یوسفی صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ گانے والی کی صورت اچھی ہو تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ انور مسعود صاحب کا شعر بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ صورت بھی ایسی ہے کہ کھنڈر یہ کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی لیکن جب ان کے شعر میں ان کی آنکھوں کی چمک شامل ہو جاتی ہے تو وہ دودھاری تلوار بن جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے اسٹیج پر ان کے پیچھے بیٹھ کر ان کا کلام سنا اور پنجابی کا کوئی مشکل لفظ پلّے نہیں پڑا۔ لیکن جب وہ شعر کسی دوسری نشست میں ان کی آنکھوں کی زبانی سنا تو وہی لفظ پکار اٹھا ''باؤ جی، ہنٹر دسو!''

انور مسعود صاحب مشاعروں میں اپنا پرانا کلام تو سناتے ہی ہیں، نہ سنائیں تو سامعین انہیں اسٹیج سے نہ اترنے دیں، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ ہر بار کچھ نہ کچھ نیا مال بھی لاتے ہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''مزاح کی نمو تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں۔'' بدقسمتی سے بیشتر شعرا نے برسوں سے کچھ نہیں لکھا اور وہ اپنی Antiques کی رائلٹی کھا رہے ہیں۔ بے چارے نثر نگار کو ہر بار ایک نئی تحریر کی مشقت جھیلنی پڑتی ہے جب کہ شاعر بلا تکلف اپنا ٹیپ Rewind کر دیتا ہے اور یہ روایت بہت قدیم ہے چنانچہ علی گڑھ کالج کے ایک مشاعرے میں جب اسّی سالہ رعشہ زدہ نوح قادری نے اپنی پچاس سال پرانی غزل کا مطلع پڑھا۔

نکلنے کو تو حسرت وصل کی اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنا چاہیے ویسی نہیں نکلی

تو آگے بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا ''حضور، بخدا اس میں نازنیں کا کوئی قصور نہ تھا۔'' یہ سن کر ظریف جبلپوری تیزی سے مائک پر آئے اور یہ شعر پڑھا:

سحر تک ان سے جھگڑا ہی رہا حسرت نکلنے کا
وہ کہتے تھے کہ ہاں نکلی؟ میں کہتا تھا نہیں نکلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج انور مسعود مزاحیہ شاعری کی آبرو ہیں۔ انہیں مزاح کا عبدالقدیر خان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی اسی اسٹیج سے ادبی دھماکے کر رہے ہوں گے جس کے لیے تمام حالات سازگار ہیں۔ حتیٰ کہ میریٹ اور شیرٹن ہوٹل بھی قریب ہیں ان کے کچھ دیگر ساتھی بھی میزائیل بردار بیٹھے ہیں۔ اب یہاں دمادم مست قلندر ہوگا۔ ہم کراچی کلب کی لائبریری و ادبی کمیٹی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں جس نے ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر کے اعزاز میں یہ تقریب منعقد کر کے ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کی تحسین کے لیے اس کا مرحوم و مغفور ہونا ضروری نہیں۔

(کراچی کلب کی تقریب اعزاز میں پڑھا گیا)

- بقیہ -

''خطرہ چار سو چالیس وولٹ''

کے دونوں جوان، شاہ بانو اور پچیاں مسکرانے لگتی ہیں)

ممتاز حسین: سر جی، حکیم صاب تو نہیں آئے!

جاوید سلطان: نہیں آئے، مطلب؟

ممتاز حسین: میرا مطلب ہے، سر!

عشرت: اب بک بھی دو!

ممتاز حسین: سر جی، میرا مطلب ہے کہ، کہ!

شاہ بانو: پھاہ ممتاز! اب دس وی دے، کیوں جھکنا پیا اے!

ممتاز حسین: سر جی، حکیم صاب نہیں آ سکتے!

جاوید سلطان: کیوں نہیں آ سکتے؟

ممتاز حسین: اس لئے سر جی، کہ حکیم صاب خود بیمار ہیں، بہت بیمار!

عشرت: بیمار ہیں؟

شاہ بانو: ربا خیر کریں (چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے) ہنٹر کیہہ ہوسی، اے تے ہنیر پے گیا؟

جاوید سلطان: یار ممتاز حسین، ساری بات صاف صاف بتلاؤ نا!

ممتاز حسین: صاب جی میں نے عرض کیا نا! حکیم صاب بہت بیمار ہیں اور شہر کے بڑے ہسپتال میں داخل ہیں۔ (ممتاز حسین نے اسکول کے بچوں کی طرح سبق دھرایا)

عبدالغفور: حکیم صاب اور ہسپتال؟ ہیں جی! (دھڑام سے بستر پر گر جاتا ہے)

ممتاز حسین: ہاں جی!

عبدالغفور: ہنٹر کیہہ ہوسی، میرا کیہہ بنڑسی؟ (گھبراہٹ میں ہاتھ، پیر اور سر مارتے ہوئے)

جاوید سلطان: (ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا لہرا کر) وہی ہوگا، جو منظورِ خدا ہوگا!

عبدالغفور: ہیں جی!

جاوید سلطان: (ہاتھ میں ڈنڈا لہرا کر غفور کی طرف بڑھتے ہوئے) ہاں جی!

(سارے لوگ ہم آواز ہو کر جملہ دہراتے ہیں)

''بہ نوکِ خار''

حال مست بے حال قلندر

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

بہ نوکِ خار می رقصم ۔ کہا اس نے
بہ نوکِ خار می رقصم ۔ بڑے اندوہگیں لہجے میں دہرایا

کہا میں نے، یہ نوک خار آخر کون سے افلاک پر بجھتی ہے
کہ اس کمرے کے غالیچے تو اونی ہیں

کہا اس مہرباں نے، میری حالت ان سے بھی بدتر ہے
وہ سب درویش جو کانٹوں کی نوکوں پر
برہنہ پا سراپا رقص کرتے ہیں
انہیں وجدان میں کچھ بھی نہیں محسوس ہوتا، پر
مری حالت تو ان سے بھی دگرگوں ہے
کہ دنیادار ہوں، بیوی ہے، بچے ہیں
منافع بخش تو شاید نہیں، لیکن بطور شغل کاروبار بھی ہے ایک چھوٹا سا
مری مصروفیت؟
چکّر پہ چکّر بنک کے، اگلی ادائی، پھر نئے قرضے
وصولی بچکوں کی، ہر مہینے ورکروں کو کیش پیمینٹ...
...صرف واخراجات لاکھوں کے
کئی لاکر، کئی بنکوں میں رکھے سیف ڈیپازٹ
کہیں پر پوسٹ ڈیٹیڈ چیک، کہیں پر کیش یا ہُنڈی
انہیں میں کیسے گنواؤں کہ یہ سارے
مرے رستوں کے کانٹے ہیں

انہی پر روز چلتا ہوں، بہت تکلیف ہوتی ہے۔
غلط کیا کہہ دیا میں نے.... بہ نوکِ خار می رقصم!

امجد اسلام امجد
(لاہور)

تلافی

بدن میں وصل کی خواہش، نظر میں مستی تھی
''زبان ہر سرِ مُو پوچھتی تھی دل کا حال''(۱)
وہ اس طرح مرے سینے سے آ کے لپٹا تھا
نکل گئے مری یادوں سے ہجر کے مہ و سال

ایک بے یقین منظر

حقیقت ہے مگر لگتا ہے جیسے معجزہ کوئی
وہ میرے سامنے بیٹھا ہے میرے خواب کی صُورت
ترنگ ایسی ہے جذبوں میں، فضا میں رنگ ہیں اتنے
کہ پہچانی نہیں جاتی دلِ بے تاب کی صُورت

○

(۱) زبانِ ہر سرِ مُو حالِ دل پُرسیدنی جائے
(غالب)

حضرت سائیں بلّھے شاہؒ کی سرائیکی کافی

یونس صابر
(پشاور)

ردیف ''الف''

''الف'' اللہ سے لا لہ گُوں دل ہے
میں نے ''ب'' کی خبر نہیں پائی
''ب'' پڑھوں، پر نہ کچھ سمجھ آئے
لذّت اس میں ''الف'' کی در آئی
''ع اور غ'' نہ سمجھ پاؤں
بات یہ بھی ''الف'' نے سمجھائی
قول بلّھے! ''الف'' کے سب پورے
مَیلے دل کی کریں جو ستھرائی

ردیف ''ب''

ذات، قوم اور وطن سے بیگانہ
بُلھا کہتا ''میں کون ہوں'' بھائی!
عشق سائیںؒ کا ہے اردو میں
مجھ سے کافی ''الف'' نے لکھوائی

○

خوابِ گراں

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

ہے کس کے حق میں یہ فغاں، ہے شعور کسکی بات کا
بتا سکے گا کیا کوئی، مقام اُسکی ذات کا

کیا تھا میں نے ذکر جب، جہانِ بے ثبات کا
اُڑا دیا جہان نے، مذاق میری بات کا

تھا کل تلک نگاہ میں جو سلسلہ حیات کا
سمجھ رہا ہوں اب اُسے فریب کائنات کا

کھُلی جو آنکھ تو ہوا ہوئے، وہ خواب سلسلے
دکھا رہے تھے جو مجھے، کمال میری ذات کا

ہوا تھا جو بھی نیند میں اُسے بھلا بھی دیجئے!
وہ خواب تھا، وہ خواب تھا، وہ دکھ تھا رات رات کا

یہاں کے لوگ طاق پر رکھے ہوئے ہیں موت کو
نہ ذکر کیجیے یہاں، جہانِ بے ثبات کا

نہ میں ہوں، کُچھ، نہ کچھ ہے تُو، نہ کچھ جہانِ رنگ و بُو
ہے خواب خواب میں فقط، ظہور اُسکی ذات کا

وہ تشنہ لب ہے اب کہاں، جو کل تھا جُزو داستاں
اُٹھائے پھر رہے ہو کیوں، نشاں اُسکی ذات کا

○

خلش

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

عجب سی بے کلی میں مبتلا رہنا بھی اچھا ہے
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں اور کس جگہ کا رہنے والا ہوں
کہاں سے آب وگل کے اس جہاں میں آ گیا
اور چند سانسوں کے لئے ٹھہرا
مگر پھر بھی
عجب سا وسوسہ دل میں پریشانی کا باعث ہے
کہ جانا ہے تو کیا سچ مچ وہاں بھی
بے کلی میں مبتلا رہنا مقدر ہے
مجھے رہنا پڑے گا عرصۂ بے نام میں کب تک
کہ میں سب بھول جاؤں گا
جہانِ آب وگل میں کتنے دکھ جھیلے
عذابِ جاں کنی کا ذائقہ چکھا
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں اور کس جگہ کا رہنے والا ہوں

○

کچے رنگ

فیصل عظیم
(کینیڈا)

جیسے بھی ہو، صاف کرو تو
دھیان رہے یہ
جامہ رنگ برنگا اپنے دیس کا ہے، سو
آہستہ آہستہ دھونا
دوسرے کپڑے اس کے ساتھ نہیں رکھنے ہیں
داغ اتر جائیں تو اچھا
ورنہ یہ پوشاک ہماری
داغ کے ساتھ ہی اپنے رنگ بھی کھو بیٹھے گی
اور ہاتھوں پر اپنے دھبے دے جائے گی
میں کیا جانوں ایسا کیوں ہے
اپنے دیس کے رنگ بہت کچے ہوتے ہیں

○

سُنامی کے پس منظر میں

طالب زیدی (میرٹھ، بھارت)

سمندر پیاس سے کیوں مر رہے ہیں
جَلا جاتا ہے کیوں گرمی سے سورج
گھٹا جاتا ہے کیوں دم آندھیوں کا
گھٹائیں کس کا سایہ چاہتی ہیں
پہاڑوں کو بلندی کا خطر کیوں
ہے صحراؤں کو تنہائی کا ڈر کیوں
یہ سب قُربِ قیامت تو نہیں ہے؟؟؟

''ماہیے''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

اِک خواب سا دیکھا ہے
صحرا کا ہر اِک منظر
بے آب سا دیکھا ہے!

خط لکھنا نہیں آتا
گر چار حرف پڑھتے
کچھ کہنا آجاتا!

اِتراؤ نہ تم اِتنا
یہ رُوپ ہے لمحوں کا
شرمائے گا کل کِتنا!

بادل نہیں برسے ہیں
اِس واسطے اب شاید
یہ نیناں ترسے ہیں!

پردیس سے آئے ہو
گھر والے پوچھتے ہیں
کیا تحفے لائے ہو!

شاید وہ اکیلی ہے
تنہائی ہی اب اُس کی
بس ایک سہیلی ہے!

○

قطعات

اقبال بھٹی
(برمنگھم، برطانیہ)

چشمِ تر کے ساتھ تبسم ظرف کا ایک سمندر ہے
جس کے دامن دولت ایسی بخت کا وہ سکندر ہے
غرض میں اقبالؔ کوئی۔ بسمل یا بے تاب رہے
ہونٹوں پہ نہ آئے لیکن درد جو دل کے اندر ہے

چشمِ تر ہے لب سوکھے اور بیچ سمندر رہتے ہیں
آپ کیا جانیں چُپ کے ہاتھوں کتنے دُکھ ہم سہتے ہیں
اقبالؔ مگر یہ بات نہیں۔ ہر اک سے کہنے کرنے کی
دل کی باتیں دل والے، دل والوں سے کہتے ہیں

برہنہ چھوڑ کر شاخیں پرندے اڑ گئے سارے
کسی طوفان کی آمد ہے، کہیں کچھ ہونے والا ہے
نہ ساحل ہے، نہ سائباں، گھر ابرقِ تپاں میں ہوں
کوئی کچھ پانے والا ہے، کوئی کچھ کھونے والا ہے

پرندہ واپسی کی سوچتا ہے
ارادے باندھتا ہے توڑتا ہے
عمل ہجرت کا ہے جاں سے گذرتا
خوشی سے کب کوئی گھر چھوڑتا ہے

○

نگینہ

احمد ظہور (اسلام آباد)

نگینہ مجھ کو دکھلا کر کہا مجھ سے نگینہ نے
ذرا دیکھو میرے ہاتھوں میں کتنا خوبصورت ہے
کئی پہلو ہیں اس کے رنگ ہر پہلو میں میرا ہے
جدھر سے بھی اسے دیکھوں میری اپنی ہی صورت ہے

لو اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا دیکھو اسے تم بھی
یہ اصلی ہے کہ نقلی ہے یہ ہیرا ہے کہ پتھر ہے

بڑھا کر ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھر لے لیا میں نے
الٹ کر بھی پلٹ کر بھی قریب و دور سے دیکھا
سمجھ میں کچھ نہیں آیا
کہ میں جوہری نہیں تھا جو نگینے کو پرکھ لیتا
خیال آیا اسے میں جوہری کے پاس لے جاؤں
یہ ہیرا ہے کہ پتھر ہے اسی سے پوچھ کر آؤں
کہ ایسے میں کسی نے دی صدا اپنے ہی اندر سے
میں بیٹھا ہوں تیرے اندر تو کیوں پوچھے گا باہر سے
میرے اندر کا جوہری ہنس دیا پھر بات وہ کہہ دی
ارے او بے خبر تو بھی رہا شاعر کا شاعر ہی
تو ہر رنگین پتھر کو نگینہ جان لیتا ہے
کہے جو کچھ کوئی تجھ سے اسی کو مان لیتا ہے
اسے ہاتھوں میں لے کر بھی نہ تو کچھ بھی سمجھ پایا
گداز اس کے بدن کا بھی نذر تجھ کو نہیں آیا
حرارت زندگی کی بھی نہیں محسوس کی تو نے
نہ ہی آواز اس کے دل کی دھڑکن کی سنی تو نے
نگینہ خود کو کہنا اس کا اک طرفہ تماشا ہے
نہیں ہے یہ نگینہ وہ جو پتھر سے تراشہ ہے
یہ رنگ بو کی اس دنیا کا اک شاہکار زندہ ہے
کہ جس کے پہلو رنگین میں اک دل بھی دھڑکتا ہے
کبھی جو مان جاتا ہے کبھی جو روٹھ جاتا ہے
ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو فوراً ٹوٹ جاتا ہے
یہ نازک آبگینہ ہے
کہ جس کا نام اس نے پیار سے رکھا نگینہ ہے

آج کا دھندا

تنہا تیاپوری
(پونے، بھارت)

رام کی رامائن میں جس کو
راون پیارا لگتا ہے
وہی آج کی سیتا ہے۔
اس سیتا کے آگے پیچھے
کوئی ریکھا
کہیں نہیں ہے!!!
آج کے راون کی گدّی پر
بازو بیٹھے
بھری سبھا میں خود پر اِتراتے رہتی ہے۔
شہرت کا اِک ''تمغہ'' پانے سے پہلے وہ
جانے کیا کیا کرتی ہے۔
سچ ہے
کچھ لینے کے بدلے
''کچھ'' دینا تو پڑتا ہے۔۔۔۔
یہی آج کا دھندا ہے!!!

○

لفظ مقدس ہوتے ہیں

جہانگیر اشرف
(برمنگھم، برطانیہ)

لفظ توریت
لفظ انجیل
لفظ ہی قرآن کی آیات ہیں

لفظ علماء
لفظ فقہاء
لفظ ہی پیغمبروں کے ارشادات ہیں

لفظ شعراء
لفظ اُدباء
لفظ فلسفیوں کے خیالات ہیں

لفظ دُعا
لفظ پُوجا
لفظ ہی عابد کی عبادات ہیں

لفظ رابطے
لفظ ضابطے
لفظ ہی دستورِ حیات ہیں

لفظ ابلیس کی انا
لفظ آدم کی التجاء
لفظ ہی ذریعۂ نجات ہیں

لفظ ہی لوحِ محفوظ پر تحریر
لفظ ابنِ مریم کی تقریر
لفظ کی پہچان سے ابنِ آدم اشرف المخلوقات ہیں

میرے دوستو!
جہاں لفظوں کا احترام نہیں ہوتا
اُس بستی کے مکینوں کا کوئی مقام نہیں ہوتا

میرے ہم نفسو!
لفظوں کو خواہشوں کا اسیر نہ کرو
لفظ مقدس ہوتے ہیں
لفظوں کو بے توقیر نہ کرو

''تیرگی''

تصور اقبال
(اٹک)

دِیا جب سے بجھا دل کا
نہ جگنو ہے نہ تارا ہے
فقط اک یادِ ماضی ہے
جواب میرا سہارا ہے
نگاہ و دل کے رستے بھی
بڑے تاریک لگتے ہیں
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
اور اِس تیرہ شبی نے
ہر طرف سے مجھ کو گھیرا ہے
کسی دیوار پر جیسے
تصوّر ایک مکڑی کا
بڑا سا کوئی جالا ہے
چراغِ آرزو بھی اب
تو بس بجھنے ہی والا ہے۔

○

''بت شکن''

ایم ایل شرماناؔز
(چندی گڑھ بھارت)

وہ تندرست اور بیدار نہیں
جسکی آنکھ نرگسِ بیمار نہیں
یوں تو جی رہے ہیں سب لوگ
مگر زندگی پر اعتبار نہیں
کرتا ہے محبت ہر کوئی
مگر دِل پر اختیار نہیں
ہے حسن کا ہر کوئی شیدا
مگر تابِ جلوۂ دیدار نہیں
مرتا ہے پروانہ شمع پر
شمع میں جذبۂ ایثار نہیں
حسن و عشق جدا ہی سہی
بیچ میں مگر کوئی دیوار نہیں
ہر حسینہ کی ادا دلکش سہی
مگر صنم سا کوئی دلدار نہیں
روضۂ تاج خوبصورت سہی
ہوتی عشق کی کوئی یادگار نہیں
ہے چمن میں گل گشت بے سُود
گر دل میں رونقِ بہار نہیں
اپنی بے گناہی پر جو کرتا ہے تکبّر
اُس بے گناہ سا کوئی گنہگار نہیں

اِک نابینا زُلیخا کے سوا
دلِ یوسف کا کوئی خریدار نہیں
دیتے ہیں تسلی سب لوگ مگر
رفیقۂ حیات سا غمگسار نہیں
گلوں میں آب و تاب کہاں
اُنکے ہمراہ اگر خار نہیں
مانگتے ہیں دعائیں رب سے
مگر خدائی پر اعتبار نہیں
جھوٹ پر کرتے ہیں یقین
سچ پر اُنہیں اعتبار نہیں
سلے میں مانگتا ہے محبت
دل میں بشر کے پیار نہیں
رشتوں میں پڑ جاتی ہے دراڑ
گر راہ محبت استوار نہیں
ملتا نہیں عشق میں قرار
اگر دل عاشق بیقرار نہیں
بت شکن سے پوچھتا ہے ناؔز
بت میں جلوۂ پروردگار نہیں؟

○

ڈرامہ

''خطرہ چارسو چالیس وولٹ''

گلزار جاوید

راولپنڈی

سین......۱

۔ مقام ۔

سینئر سپرینٹنڈنٹ پولیس کے بڑے، عالی شان گھر کا لگژری بیڈ روم

۔ کردار ۔

بیگم عشرت سطان اور گھر میں کام کرنے والی ملازمہ شاہ بانو

فون کی گھنٹی: ٹرن، ٹرن، ٹرن، ٹرن۔

عشرت: ہیلو! (نیند سے مخمور آواز میں) سوری، جی بول رہی ہوں، میں نے کہا نا! عشرت سلطان بول رہی ہوں، آپ؟ ہاں، آں، ٹھیک (ناگواری سے کاغذ قلم تلاش کرتے ہوئے) کوشش تو کر رہی ہوں (موبائل اٹھا کر) جی لکھایئے! سوری، ریپیٹ کیجیے، Excuseme، آپ کیا کہہ رہی ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا! (جھلا کر فون بند کر دیتی ہیں) غفور، او غفور، کہاں مرگیا؟

فون کی گھنٹی: ٹرن، ٹرن، ٹرن۔

عشرت: جی! میں نے کہا نا آپ کی گفتگو میری سمجھ سے باہر ہے! پھر کسی وقت فون کیجیے گا، ویسے بھی میرے پاس وقت ہے نا اسٹیمنا (فون جھٹک کر گاؤن تلاش کرنے لگتی ہے)

فون کی گھنٹی: ٹرن، ٹرن۔

عشرت: یہ ایس۔ ایس۔ پی۔ جاوید سلطان کا گھر ہے کوئی یتیم خانہ نہیں (غصّے سے) سمجھ میں آیا آپ کے! What؟ اچھا! (حیرت سے) تو اتنی دیر سے محترمہ اداکاری کا شوق فرما رہی تھیں (ہنستے ہوئے بیڈ پر بیٹھتی ہے اور سر میں انگلیاں پھیرنے لگتی ہے) ٹھیک ہے، جب دل کرے، مگر (جملہ ادھورا چھوڑ کر) ہوں، ہوں، ہاں، آں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تُو جیتی میں ہاری، اس پُھدو کو اتنا ضرور بتلا دینا کہ میں اب کالج کی ہر دلعزیز عشرت حسین نہیں ہوں جسے دیکھ کر لڑکوں کی سانسیں رُک جاتی تھیں (کھلکھلا کر ہنستے ہوئے) لائن مارنے کی کوشش کی تو سالے کو اندر کرا دوں گی (دیوار پر لگی گھڑی دیکھتے ہوئے) چل پھر ٹھیک ہے، نائن پی ایم شارپ، اوکے (ٹیلی فون بند کر کے) غفورے، او غفورے، کہاں مرگیا؟

شاہ بانو: وہ جی، بیگم صاب جی، وہ ہے نا (سانس درست کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتی ہے)

عشرت: کون؟

شاہ بانو: وہ جی!

عشرت: کیا وہ جی؟

شاہ بانو: (شرماتے ہوئے) وہ ہے نا، وہ، میرا مرد!

عشرت: تیرا مرد (چبا کر) ہاں، کیا ہوا اُسے؟

شاہ بانو: او جی، اُسے بہت زور کا تپ چڑھا ہے۔

عشرت: کیا چڑھا ہے؟

شاہ بانو: تپ، بیگم صاب جی! میرا مطلب ہے، وہ جی، آپ لوگ جسے، جسے (حافظے پر زور دیتے ہوئے) بخار کہتے ہیں (خوشی سے اچھل کر نبض پر ہاتھ رکھتی ہے)

عشرت: اچھا، اچھا، ٹھیک ہے، اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے، بخار وخار سے بندہ مرتا نہیں!

شاہ بانو: ہائے، ہائے جی بیگم صاب! میرا تراہ نکلا جا رہا ہے اور آپ کہتی ہیں کہ میں خوش ہو رہی ہوں! ویسے جی، بیگم صاب جی! ایک بات تو بتلائیں میرے کو (راز داری سے قریب ہو کر) شہر میں زنانی کے مرد کو تپ میرا مطلب ہے جی، بخار چڑھے تو اسے خوش ہونا پڑتا ہے!

عشرت: چل چل اب بکواس نہ کر، کام کا سوچ، کام کا!

شاہ بانو: (باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے) جو حکم بیگم صاب جی۔

سین......۲

۔ مقام ۔

ایس۔ ایس۔ پی کے گھر کا ٹی وی لاؤنج

۔ کردار ۔

عشرت اور جاوید سلطان

جاوید سلطان: (ہاتھ سے تولیہ باندھے ہوئے غصّے کی حالت میں برآمد ہوتا ہے) اس گھر کا باوا آدم شروع دن سے نرالا ہے، جسے دیکھو صاحب بنا پھرتا ہے، ڈور بیل بجے یا فون بیل، بھاگنا کسے پڑتا ہے؟ مجھے، یعنی شہر کے اکلوتے ایس۔ ایس۔ پی پولیس کو (ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے جو خاموش ہو چکا ہے) کسی زمانے میں شہر کوتوال کہلاتا تھا ایس۔ ایس۔ پی پولیس، شہر کا بچہ بچہ جس کی دہشت سے ڈرا نہیں، کانپا کرتا تھا اور آج! آج میرے اپنے گھر میں کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں!

عشرت: یہ کیا بُو بُو لگا رکھی ہے؟ (کچن سے ایپرن باندھے ہوئے برآمد ہوتی ہے)

جاوید سلطان: جان کی امان پاؤں تو ناشتہ طلب کروں؟
عشرت: ہرگز نہیں!
جاوید سلطان: یار کچھ تو خیال کرو! آخر کو ہم شہر کو توال ہیں، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا!
عشرت: (غصّے سے آواز اونچی کرتے ہوئے) سر پیٹے گا، سر!
جاوید سلطان: سر پیٹے گا! مگر کیوں؟ ہم تو بڑے رحم دل پولیس والے ہیں۔
عشرت: جی ہاں! اسی لیے تو گھر کے اندر اور گھر کے باہر صدا ایک سا موسم رہتا ہے۔
جاوید سلطان: بھئی کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟ (اپنائیت سے بیگم کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے) صبح ہی صبح سرکار کا موڈ کیوں خراب ہے؟
عشرت: ہٹایئے بھی ان چونچلوں کو (ناگواری سے ہاتھ پرے کرتے ہوئے) وہ ہے نا! آپ کا لاڈلا غفور۔۔۔
جاوید سلطان: غفور! کیا ہوا غفور کو؟
عشرت: طبیعت ناساز ہے جناب کی!
جاوید سلطان: کیا پھر ہاتھ وات جلا بیٹھا؟
عشرت: نہیں (طنزیہ انداز میں) بتلائے بخار ہیں آپ کے لاڈلے غفور میاں! جب بھی گھر میں مہمان کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے کوئی نہ کوئی آسن پاٹی لے کر پڑ جاتا ہے۔
جاوید سلطان: بھئی پریشان کیوں ہوتی ہو، ڈاکٹر نیاز کو فون کر دو اور ڈرائیور کے ہمراہ غفور کو بھیج دو دوائی لینے (بیگم کے کندھے پر منہ ٹکا کر) By The Way، آ کون رہا ہے؟
عشرت: میری بیسٹ فرینڈ رخشندہ آ رہی ہے!
جاوید سلطان: باپ رے، بھاگو، آدم بُو!
عشرت: اس طرح کام نہیں چلے گا، اس غفورے کا کچھ کیجیے!
جاوید سلطان: (پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر) کرتا ہوں بابا، کرتا ہوں، دفتر جا کر پہلا کام یہی کروں گا۔

سین.....۳

۔ مقام ۔
شہر کے وسط میں ایس۔ایس۔پی پولیس کا دفتر
۔ کردار ۔
جاوید سلطان، حولدار برکت علی، ڈاکٹر خادم حسین بھٹی

جاوید سلطان: (چیک اٹھا کر داخل ہوتے ہوئے) وعلیکم السلام! ہاں بھئی برکت علی سناؤ کیا حال ہے؟ (کرسی پر بیٹھ کر کاغذات دیکھتے ہوئے)
برکت علی: آپ کی دعا ہے سر!
جاوید سلطان: اور کیا خبریں ہیں؟
برکت علی: سر آج شام چار بجے چیف سیکرٹری صاحب نے طلب کیا ہے آپ کو (کاغذ کھول کر بڑھاتا ہے، جاوید سلطان کی چبھتی ہوئی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے) میرا مطلب ہے یاد کیا ہے، گیارہ بجے علمائے شہر کے ساتھ میٹنگ پہلے سے طے ہے، بارہ بجے بچوں کے رفاہی ادارے کا افتتاح ہے اور دس سے گیارہ بجے کا وقت شہریوں سے ملاقات کے لیے وقف ہے۔
جاوید سلطان: ہوں، ہاں، شہریوں سے ملاقات، وقت کیا ہوا ہے؟ (گھڑی دیکھ کر چونکتے ہوئے) بلاؤ بلاؤ، ایک ایک کر کے جلد بلاؤ۔
ڈاکٹر خادم: السلام علیکم سر! (چیک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)
جاوید سلطان: وعلیکم السلام، بیٹھیے (فائل پر نظر مرکوز کیے ہوئے) میرا خیال ہے، آپ پہلے بھی تشریف لا چکے ہیں!
ڈاکٹر خادم: درست فرمایا آپ نے! مگر حضور میرا مسئلہ ابھی تک وہیں کا وہیں ہے۔
جاوید سلطان: یعنی؟ (چشمہ ہاتھ میں لے کر منہ میں دباتے ہوئے)
ڈاکٹر خادم: معافی چاہتا ہوں حضور! آپ نے وہ مقولہ تو سُنا ہوگا!
جاوید سلطان: کونسا؟ (فائل کے صفحات بے دلی سے الٹتے ہوئے)
ڈاکٹر خادم: ''پنچوں کا ارشاد بجا، پرنالہ وہیں بہے گا''
جاوید سلطان: آسان لفظوں میں مختصر بات کیجیے، مختصر!
ڈاکٹر خادم: قصّہ کچھ یوں ہے!
جاوید سلطان: ایک منٹ، ایک منٹ، میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا!
ڈاکٹر خادم: پر حضور!
جاوید سلطان: آپ کام کرانا چاہتے ہیں کہ نہیں؟
ڈاکٹر خادم: چاہتا ہوں حضور، سو فیصد چاہتا ہوں!
جاوید سلطان: (ڈاکٹر خادم کا جملہ اچک کر) ابھی کے ابھی ڈرائیور کے ساتھ میرے گھر جایئے وہاں ایک مریض چیک کیجیے، واپس آنے سے قبل آپ کا کام تمام!
ڈاکٹر خادم: جی!
جاوید سلطان: کام ہو جائے گا، ہو جائے گا، اب جایئے، Hurry up, quick۔
ڈاکٹر خادم: (خوشی ضبط کرتے ہوئے) سچ حضور!
جاوید سلطان: راستے سے بیان حلفی بھی لیتے آیئے گا اس پر لکھ کر دے دوں گا۔
ڈاکٹر خادم: معافی چاہتا ہوں حضور! (چیک اٹھا کر باہر نکل جاتا ہے)

سین.....۴

۔ مقام ۔
شہر کی مصروف شاہراہ
۔ کردار ۔
جاوید سلطان اور ڈرائیور ممتاز حسین

جاوید سلطان: (موبائل کان سے لگاتے ہوئے) جی! بول رہا ہوں، سر! جی سر، حاضر جناب! وقت پر نہیں سر، وقت سے پہلے، بہت پہلے (موبائل بند کرتے ہوئے) نجانے یہ لوگ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں، ممتاز! اگلے موڑ سے دائیں ہاتھ، میرا مطلب ہے ڈی۔آئی۔جی صاحب کے آفس لے لینا۔

ممتاز حسین: رائٹ سر!

جاوید سلطان: ہاں! برکت علی میں بول رہا ہوں (موبائل کان سے لگا کر) سنو! آج کی تمام میٹنگ اور اپائنٹمنٹ کینسل کر دو، میں ڈی۔آئی۔جی صاحب کی طرف جا رہا ہوں، ابے گدھے اگر وہ میٹنگ کینسل کی تو دونوں کی چھٹی ہو جائے گی تیری بھی اور میری بھی، سمجھا! (موبائل آف کر کے سوچنے لگتا ہے پھر نمبر گھوما کر تھوڑے انتظار کے بعد) ہاں بھئی ہاں جاوید سلطان بول رہا ہوں، مسکین احمد سے بات کراؤ! ہاں مسکین احمد، ٹھیک، بالکل ٹھیک، ہاں ہاں ٹھیک ہے، اتنا قانون میں بھی جانتا ہوں اور تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اگر آج شام تک تم نے مکمل چالان پیش نہ کیا تو، ایک منٹ، میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں (موبائل دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی کے ساتھ) ہاں عشرت خیریت! اس ٹائم فون کیوں کیا؟ نہیں بابا میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا! میں تو یہ کہہ رہا تھا، اچھا! ہوں ہوں، پھر؟ چلو ٹھیک ہے، واپسی پر دیکھتے ہیں! Don't Worry، As soon as possible، o.k، o.k۔

سین.....۵

۔ مقام ۔

جاوید سلطان کی کوٹھی کے Back yard میں سرونٹ کوارٹر

۔ کردار ۔

جاوید سلطان، غفور اور اس کی آٹھ، پانچ اور تین سال کی بیٹیاں۔

جاوید سلطان: (پولیس وردی میں ملبوس پر وہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتا ہے) ہاں بھئی عبدالغفور، خیریت تو ہے! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟

عبدالغفور: (اٹھنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) صاب جی! پنڈا تو کئی دنوں سے گرم چل رہا تھا، کل رات سے تو بخار نے پوری طرح جکڑ لیا ہے (سردی سے دانت بجنے لگتے ہیں)

جاوید سلطان: بخار نے جکڑ لیا ہے تو یہاں پڑے کیا کر رہے ہو! جاؤ ڈاکٹر سے دوائی لے کر آؤ، اور ہاں میں نے ڈرائیور کے ہمراہ جو ڈاکٹر بھیجا تھا اُسے کیوں نہیں دکھایا تم نے؟

عبدالغفور: نا صاب جی نا، یہ ظلم مت کیجیے!

جاوید سلطان: کونسا ظلم؟ (حیرت سے)

عبدالغفور: میں مر جاؤں گا صاب جی، میں مر جاؤں گا!

جاوید سلطان: مر جاؤں گا! کیوں مر جاؤ گے بھئی؟ کچھ نہیں ہوتا، معمولی بخار ہے، بس۔

عبدالغفور: (لیٹے لیٹے ہاتھ باندھ کر) میں ڈاکٹری دوائی نہیں کھا سکتا صاب جی، نہیں کھا سکتا!

جاوید سلطان: کیوں نہیں کھا سکتے؟

عبدالغفور: یہ ظلم ہے صاب جی، سراسر ظلم!

جاوید سلطان: کونسا ظلم؟ (کمرے کے دروازے سے آدھا اندر آدھا باہر پلٹتے ہوئے)

عبدالغفور: صاب جی! آپ سے پہلے بیگم صاب بھی بہت خفا ہو کر گئی ہیں!

جاوید سلطان: کس بات پر؟ (گھڑی دیکھتے ہوئے) پہیلیاں مت بجھاؤ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔

عبدالغفور: وہ جی، میرا مطلب یہ ہے! (تھوک نگلتے ہوئے آنسو صاف کرتا ہے)

جاوید سلطان: اب بک بھی دو، کیا مطلب ہے تمہارا!

عبدالغفور: میں جی ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتا!

جاوید سلطان: آخر کیوں؟

عبدالغفور: اللہ بخشے ابا جی کہا کرتے تھے ڈاکٹری دوائی سے نزلہ زکام ایک دم بند ہو جاتا ہے، جو بندے کے دماغ پر اثر کرتا ہے، جس سے کبھی کبھی بندہ فوت بھی ہو جاتا ہے!

جاوید سلطان: (بے بسی سے عبدالغفور کی طرف بڑھتے ہوئے) کیا بکواس کر رہے ہو تم؟

عبدالغفور: میں سچ کہہ رہا ہوں صاب جی! میں نے ساری حیاتی انگریزی دوائی کو ہاتھ تک نہیں لگایا بلکہ ہمارے پورے پنڈ میں کسی ایک بندے نے ڈاکٹری دوائی تکی تک نہیں!

جاوید سلطان: جو جی میں آئے کرو، میری بلا سے Go To Hell، (دروازے کو ٹھوکر مارتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے)

سین.....۶

۔ مقام ۔

شہر کے بڑے ہوٹل کا ڈائننگ ہال

۔ کردار ۔

عشرت، رخشندہ، عرفان اور بہت سے دوسرے

عشرت: تُو تو کہہ رہی تھی کہ وہ ملنے کے لیے مرا جا رہا ہے!

رخشندہ: سچ ہی تو کہا تھا میں نے!

عشرت: بہت خوب! یہ تو مدعی سست، گواہ چست والی صورتحال ہے!

عرفان: (عقب سے کرسی گھسیٹتے ہوئے) ہرگز نہیں، مدعی چست بھی ہے اور حاضر بھی!

عشرت: چرب زباں پہلے بھی تھے، اب تو چرب مکاں بھی ہو گئے ہو! (عرفان کے سراپے کو جانچتے ہوئے)

عرفان: بس تھوڑا سا پیٹ نکل آیا ہے، وگرنہ!
رخشندہ: اگر یہ تھوڑا سا ہے، تو زیادہ کتنا ہوتا ہے؟
عرفان: یار، یہ کیا شرافت ہے! کھانا نہیں کھلانا تو اس کے اور بہت سے طریقے ہیں! تین بچوں کے باپ کو خوابوں کے شہزادے کے روپ میں دیکھنا سراسر زیادتی ہے!
عشرت: کس خوش فہمی میں مبتلا ہو صاحبزادے؟
عرفان: بس بس، تمہارے منہ سے یہ لفظ سننا تھا، میں اور خوش فہمی، وہ بھی تھانیدارنی سے، توبہ اللہ توبہ (دائیں ہاتھ سے بایاں کان اور بائیں ہاتھ سے دایاں کان پکڑتے ہوئے)
عشرت: ہاں شاہ بانو (موبائل کان سے لگا کر) کیا بات ہے؟ ہیں، اچھا، پھر! کیا کہا اُس نے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں پہنچ رہی ہوں (موبائل پرس میں ڈالتے ہوئے) Sorry Guys! میں آپ لوگوں کو بہت Miss کروں گی مگر جانا ضروری ہے۔
رخشندہ: خیریت! کیا کہہ رہی تھی شاہ بانو؟
عشرت: یار وہ اس کا شوہر ہے نا!
رخشندہ: شاہ بانو کا؟
عشرت: ہاں!
رخشندہ: کیا ہوا اُسے؟
عشرت: بیمار ہے، کئی دنوں سے بیمار ہے۔
عرفان: بیمار ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ!
عشرت: تمہارا کیا خیال ہے ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں!
عرفان: پھر؟
عشرت: وہ لاٹ صاحب، ڈاکٹری دوائی نہیں کھاتے!
رخشندہ: لاٹ صاحب، کچھ تو کھاتے ہوں گے! پھکی شکی، معجون واجون یا پھر دم دردو!
عرفان: رخشندہ ٹھیک کہتی ہے! گاؤں کے لوگ نیم حکیم پر اعتبار کرتے ہیں یا پیر فقیر پر اعتقاد، ڈاکٹر کو تو وہ لوگ، خطرہ چار سو چالیس وولٹ خیال کرتے ہیں!
عشرت: (جانے کے لیے اٹھتے ہوئے) Thank you very much، تم لوگوں نے میرا مسئلہ حل کر دیا!

سین.....۷

۔ مقام ۔
جاوید سلطان کے گھر کا کار پورچ
۔ کردار ۔
جاوید سلطان، عشرت، ڈرائیور ممتاز حسین

عشرت: (گاڑی کی آواز پر ڈرائنگ روم سے برآمد ہوتی ہے) Thank God، کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں! کہاں ہیں وہ؟
جاوید سلطان: کون؟
عشرت: ارے بھئی میں نے فون پر تم سے کہا تھا کہ دو پولیس کے جوان لیتے آنا، غفورے کو گاؤں بھیجنا ہے، پھر وہ جانے اور اُس کے گھر والے۔
جاوید سلطان: گھر والے یا حکیم!
عشرت: گھر والے، باہر والے، حکیم یا رشتے دار What ever، ہماری ذمہ داری تو ختم ہو!
جاوید سلطان: ذمہ داری ختم ہو نہ ہو، بندہ ضرور ختم ہو جائے گا!
عشرت: (پلٹتے ہوئے) کیا مطلب؟
جاوید سلطان: مطلب یہ کہ اس کے کوارٹر میں جا کر دیکھو تو پتہ چلے نا!
عشرت: میں کچھ نہیں جانتی، میں تو یہ چاہتی ہوں۔۔۔۔!
ممتاز حسین: (گھبراہٹ کے عالم میں) سر، سر!
جاوید سلطان: ممتاز حسین کیا بات ہے؟
ممتاز حسین: وہ جناب! میں عبدالغفور کے کوارٹر میں گیا تھا، وہ تو جی نجانے کیا اول فول بک رہا ہے؟
جاوید سلطان: تم چلو میں آتا ہوں (ڈرائنگ روم میں آ کر موبائل پر نمبر ملاتا ہے) ہیلو! جی جی، جاوید سلطان بول رہا ہوں، ڈاکٹر صاحب مجبوری ہے، جی جی، وہ میرا ملازم ہے نا، جی عبدالغفور، جی جی، کمبخت کئی روز سے بخار میں پھُک رہا ہے، مگر، ہاں ہاں، پلیز!

سین.....۸

۔ مقام ۔
جاوید سلطان کے گھر کا مین گیٹ
۔ کردار ۔
جاوید سلطان، ممتاز حسین

جاوید سلطان: کہاں مر گئے تھے؟
ممتاز حسین: (سلیوٹ مار کر) ممتاز حسین حاضر ہے جناب!
جاوید سلطان: یار یہ سلیوٹ کا نہیں، کام کا وقت ہے!
ممتاز حسین: سر! (دوبارہ سلیوٹ مار کر)
جاوید سلطان: یار تم اتنی مہربانی کرو، جلدی سے جا کر ڈاکٹر نیاز کو لے آؤ (زچ ہو کر)
ممتاز حسین: یس سر! (سلیوٹ مارنے کے لیے پاؤں اٹھاتا ہے جاوید سلطان کی طرف دیکھ کر واپس زمین پر رکھ لیتا ہے)

سین.....۹

۔ مقام ۔
عبدالغفور کا کوارٹر

۔ کردار ۔

جاوید سلطان، عشرت، عبدالغفور، شاہ بانو اور اُس کی تینوں بچیاں

عبدالغفور: ہائے میرے ربّا میں کیہہ کراں، کیہڑے پاسے جاواں؟ (دو لحاف میں لپٹا ہوا پلنگ پر کانپ رہا ہے)

شاہ بانو: وے غفورے، کی کرنا پیا ایں، کجھ تے حوصلہ کر، ایدر ویکھ! کُڑیاں دا رو رو کے کی حال بنڑ گیا اے (پریشان اور ہونق لڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

عبدالغفور: (ناراضگی سے) میری جان تے بنڑی ہوئی اے، تینوں کُڑیاں دی پئی اے، (پھر کانپنے لگتا ہے اور دانت بھی بجنے لگتے ہیں)

عشرت: جاوید کچھ کرو!

جاوید سلطان: کیا کروں، بتلاؤ؟ سب کچھ تو کر رہا ہوں جو میرے بس میں ہے! (ناراضگی اور پریشانی سے) ممتاز حسین گیا ہے ڈاکٹر نیاز کو لینے۔

شاہ بانو: ہائے میں مرجاواں، ڈاکٹر تے میرا بندہ مار دیسی!

عشرت: کچھ نہیں ہوتا تمہارے بندے کو، دوائی نہیں کھائے گا تو ٹھیک کیسے ہوگا؟

عبدالغفور: مینوں پنڈ کہل دیو، حکیم صاب دے کول، بے بے کول، ابّے کول، سب بڑے یاد آرے نیں مینوں، بڑے یاد آرے نے (چھاتی پر ہاتھ مار کر روتا ہے)

سین......۱۰

مقام

جاوید سلطان کے گھر کا مین گیٹ

کردار

جاوید سلطان، عشرت، ممتاز حسین اور ڈاکٹر نیاز

ڈاکٹر نیاز: خیرت! آپ لوگ یہاں؟

عشرت: خیرت خاک ہوگی ڈاکٹر صاحب، وہ عبدالغفور!

ڈاکٹر نیاز: اللہ خیر کرے، کیا ہوا عبدالغفور کو۔

جاوید سلطان: ڈاکٹر صاحب! عبدالغفور اور اس کی بیوی اس بات پر بضد ہیں کہ وہ ڈاکٹر علاج نہیں کرائیں گے۔

ڈاکٹر نیاز: تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟

عشرت: آپ آیئے، اندر آ کر غفور کا معائنہ کر کے بتلایئے، اس کی حالت ہے گاؤں جانے کی؟

ڈاکٹر نیاز: پھر بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں!

جاوید سلطان: پریشانی کی کوئی بات نہیں؟

ڈاکٹر نیاز: اگر وہ ڈاکٹری دوائی نہیں کھانا چاہتا تو نہ کھائے، آپ کیوں زبردستی کرتے ہیں! یہ لیجیے (بیگ میں ہاتھ ڈال کر گولیوں کے چند پتے نکالتا ہے) ایک ایک گولی پیس کر چائے میں حل کر کے پلاتے رہیے اور عبدالغفور کی تسلی کے لیے گاؤں سے حکیم کو بلوا لیجیے!

عشرت: اگر حکیم نے کوئی دوائی دی تو پھر؟

ڈاکٹر نیاز: پھر کیا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ہوگا، مریض ٹھیک ان دواؤں سے ہوگا اور کریڈٹ، حکیم صاحب کی کرامات کو جائے گا، بس (ہنستے ہوئے جاوید سلطان کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

جاوید سلطان: مگر ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر نیاز: آپ عبدالغفور کو صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں کہ نہیں (دونوں میاں بیوی مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلاتے ہیں)

ڈاکٹر نیاز: ہمیشہ ڈاکٹر حکیموں کے بگڑے ہوئے مریض ٹھیک کرنے کا کریڈٹ لیا کرتے ہیں، اس بار ایک حکیم یہ کریڈٹ لے لے تو کیا مضائقہ ہے!

سین......۱۱

۔ مقام ۔

عبدالغفور کا کوارٹر

۔ کردار ۔

عبدالغفور، شاہ بانو، عشرت اور تینوں بچیاں

عشرت: لو عبدالغفور گرم گرم چائے پیو، میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے تمہارے لیے۔

شاہ بانو: (حیرت اور شرمندگی سے) آپ نے، بیگم صاب جی!

عشرت: کیوں! میں نہیں بنا سکتی چائے؟

شاہ بانو: نہیں جی، میرا مطلب یہ نہیں تھا (جھینپتے ہوئے) لے غفورے! چا پی لے، تو بڑا قسمت والا ہے کہ تیرے لیے بیگم صاب جی نے اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی ہے!

عبدالغفور: ہائے میرے ربّا، مینوں موت کیوں نہ آ گئی بیگم صاب سے چائے بنواتے ہوئے!

عشرت: چلو چلو، زیادہ باتیں نہ کرو، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، اور ہاں! شاہ بانو غفورے سے زیادہ باتیں نہ کرو، اسے آرام کرنے دو، تھوڑی دیر میں حکیم صاحب آنے والے ہیں گاؤں سے۔

عبدالغفور: حکیم صاب! (آواز نحیف ہونے کے باوجود خوشی نمایاں ہے)

شاہ بانو: ساڈے پنڈ آلے حکیم! (خوشی اور حیرت سے)

عشرت: ہاں ہاں بھئی، وہی!

سین......۱۲

۔ مقام ۔

جاوید سلطان کا دفتر

۔ کردار ۔

جاوید سلطان اور حولدار برکت علی

جاوید سلطان: (بہت ساری درخواستوں کا معائنہ کرتے ہوئے) یار برکت علی! ان درخواستوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ پورا شہر ظلم وزیادتی کا شکار ہے اور پولیس کا محکمہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا ہے!

برکت علی: جی سر، درست فرمایا آپ نے!

جاوید سلطان: (سر اٹھا کر برکت علی کو گھورتے ہوئے) اگر ایسا ہے تو مجرم یہ لوگ نہیں جن کے خلاف درخواستیں آئی ہیں بلکہ ہم لوگ ہیں!

برکت علی: جی سر، میرا مطلب ہے نو سر!

جاوید سلطان: (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) یار! ممتاز حسین کا تو پتہ کیا جائے (موبائل اٹھا کر نمبر ملاتے ہوئے) یہ حکیم صاحب والا چکر بھی خوب گلے پڑا ہے! ہاں بھئی ممتاز حسین! کیا رپورٹ ہے؟ اچھا، ابھی تک گاؤں نہیں پہنچے! ہوں ہوں، کچا چٹھہ پکّا چٹھہ، اس نام کے دو گاؤں ہیں، تم پکّا چٹھہ چلے گئے تھے، چلو ٹھیک ہے، گاؤں پہنچ کر مجھے رپورٹ کرو اور ہاں حکیم صاحب سے عزت سے پیش آنا، پولیس والی دھونس مت جمانا، ہیلو، ہیلو! ایک تو ان پولیس والوں کو موت آنے لگتی ہے، بندے کا پتر بنتے ہوئے (دوسری طرف سے فون بند ہونے پر غصّے کا اظہار کرتے ہوئے پھر سے کاغذات دیکھنے لگتا ہے)

سین......۱۳

۔ مقام ۔

گاؤں کی ناپختہ سڑک اور دائیں بائیں لہلہاتے کھیت

۔ کردار ۔

ممتاز حسین اور پولیس کے دو جوان سرکاری گاڑی میں سفر کرتے ہوئے

ایک جوان: سر جی کدھرے چائے شائے پلا دیں جی، یقین منّو بڑے زور سے ترہ لگی ہے!

ممتاز حسین: یار دلاور! تو بندہ اے کے نائی، دس منٹ پہلاں تے گڈی توں کھوں کے کھکھڑیاں کھوائی نیں فیروی تو رجیاں نئی، تراٹدھ ہے کہ کھوہ!

دوسرا جوان: سر جی! اے سوچل پولیس والے دا ٹڈھ اے، کسی شریف شہری دا نی! (دلاور کے صحت مند پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے)

ممتاز حسین۔ بکواس نہ کراوئے، چھیتی نال صاب نوں فون ملا!

دوسرا جوان: جو حکم جناب!

ممتاز حسین: سلاما لیکم سر جی! (وقفہ) جی سر، یس سر، سر، بالکل پریشانی نہیں ہوئی سر، جی جی، گاؤں آسانی سے مل گیا، جی جی، حکیم صاب کا مطب، جی، بہتر جناب۔

سین......۱۴

۔ مقام ۔

جاوید سلطان کا دفتر

۔ کردار ۔

جاوید سلطان، برکت علی اور چند سائلین نما مہمان

جاوید سلطان: آپ چائے لیجیے نا!

ایک مہمان: جی جی، بہت شکریہ۔

جاوید سلطان: معافی چاہتا ہوں (موبائل اٹھا کر نمبر ملاتے ہوئے) ہاں! بیگم صاحبہ کو بلاؤ، کہاں گئیں؟ اچھا سنو! بیگم صاحبہ جیسے ہی آئیں اُن سے کہنا کہ میری ممتاز حسین سے بات ہوگئی ہے، وہ حکیم صاحب کو لے کر بہت جلد پہنچ رہا ہے، میں بھی دفتر سے اٹھ کر سیدھا گھر بلکہ عبدالغفور کے کوارٹر پہنچ رہا ہوں (موبائل بند کرتے ہوئے) Sorry۔

مہمان: کوئی بات نہیں سر!

سین......۱۵

۔ مقام ۔

عبدالغفور کا کوارٹر

۔ کردار ۔

جاوید سلطان، عشرت، ممتاز حسین، پولیس کے دو جوان، عبدالغفور، شاہ بانو اور تینوں بچیاں

جاوید سلطان: (کوارٹر کے باہر ٹہلتے ہوئے گاڑی دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتا ہے) مبارک ہو بھئی حکیم صاحب آ گئے!

عبدالغفور: ہیں صاب جی! (خلافِ توقع بیٹھ جاتا ہے اور چہرے سے بہتر نظر آ رہا ہے)

دلاور حسین۔ سلاما لیکم سر! (سلیوٹ مار کر کمرے میں داخل ہوتا ہے)

عشرت: اکیلے آئے ہو؟

دلاور حسین: نہیں جناب، اکیلے کیوں آئیں گے!

جاوید سلطان: بلاؤ بلاؤ، اور لوگوں کو بھی بلاؤ!

دلاور حسین: یس سر! (سلیوٹ مار کر باہر نکل جاتا ہے)

جاوید سلطان: آؤ بھئی، آؤ ممتاز حسین!

ممتاز حسین: جی سر (سلیوٹ مار کر مودّب کھڑا ہو جاتا ہے)

جاوید سلطان: کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟

ممتاز حسین: نو سر، کوئی خاص نہیں۔

جاوید سلطان: یہ کچّا چٹھہ پکّا چٹھہ کی کہانی کیا ہے؟

ممتاز حسین: بس سر! گاؤں میں اکثر ایسا ہوتا ہے!

عشرت: اب دولہا میاں کو لے بھی آؤ، کیا بینڈ باجا بھیجنا پڑے گا انہیں لانے کو!

ممتاز حسین: دولہا میاں؟

جاوید سلطان: بے وقوف انسان! ان کا مطلب ہے حکیم صاحب کو لے آؤ۔

ممتاز حسین: (پریشان ہو کر) حکیم صاحب؟

عشرت: اور نہیں تو کیا؟ تم حکیم صاحب کو لینے گئے تھے یا کترینہ کیف کو؟ (پولیس

باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ فرمایئے

ایک صدی کا قصہ

سہراب مودی

دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب آرٹ کے ہر شعبے پہ پارسیوں کا تسلط ہوا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں تھیٹر کو مقبول کرنے میں پارسیوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آبادی کے تناسب سے دیکھا جائے تو یہ قوم آٹے میں نمک کے برابر ہے مگر اپنی لگن اور محنت سے انہوں نے نہ صرف ترقی کی بلندیاں سر کیں بلکہ ساتھ ہی اس ملک کی تقدیر بھی سنواری۔ اسکی سب سے بڑی مثال ٹاٹا گروپ آف کمپنیز ہے جس نے اس ملک کی معیشت کو ایک نئی سمت اور رفعت عطا کی۔ پارسیوں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اُسے بڑی ایمانداری اور نیک نیتی سے پایہ تکمیل تک پہونچادیا۔ وہ چاہے صابون کی ٹکیہ ہو یا سڑکوں پر دوڑنے والے بھاری بھرکم ٹرک۔ سڑک پر تالے بیچنے والے گودریج نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ آدمی میں اگر سچی لگن ہو تو وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ آج ٹاٹا اور گودریج کا شمار بہت بڑے صنعت کاروں میں ہوتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق اسی پارسی قوم سے ہے جو ایران سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا اور آج یہ لوگ اس ملک کی معیشت پر چھائے ہوئے ہیں۔ پارسیوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی حصہ داری ڈالی۔ وہ چاہے فن ہو یا صنعت و حرفت ہو یا تجارت، پارسی لوگ ہر شعبے میں پیش پیش رہے ہیں۔

سہراب میروان جی مودی بھی پارسیوں کے اسی جفاکش اور ایماندار قوم سے تعلق رکھتا تھا جنہوں نے اس ملک میں اپنی ایک خاص پہچان بنا لی ہے۔ سہراب مودی کا جنم 1897 کو بمبئی شہر میں ہوا۔ ممبئی جسے جادو کی نگری کہا جاتا ہے۔ اُسنے اپنے کیریر کی شروعات ایک Travelling Exibitor کے طور پر کی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ شہر شہر گھوما کرتا تھا۔ اُن دنوں تھیٹر بہت مقبول تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اُس زمانے میں تفریح کا واحد زریعہ تھیٹر ہی تھا۔

سہراب مودی شیکسپیر کا زبردست مداح و پرستار تھا اُن دنوں شیکسپیر کا ہر طرف بول بالا تھا۔ تھیٹر اور شیکسپیر جسم و جان کی طرح تھے۔ جب بھی ڈرامے کی بات چلتی تھی تو شیکسپیر فوراً ذہن میں آجاتا تھا۔ سہراب مودی خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اُسکے اندر چھپا ہوا اداکار باہر آنے کے لئے کلبلا رہا تھا پر قسمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ گو کہ اُس نے کئی خاموش فلموں میں اداکاری کی تھی مگر کوئی پزیرائی مل نہیں پائی تھی۔ اُس کے من پسند رول اُسے مل نہیں پا رہے تھے۔ وہ کسی قدر مایوس اور دل برداشتہ ہوا جا رہا تھا تبھی قسمت نے اُسکے ساتھ یاوری کی۔ اُسکی زندگی میں اچانک ایک ڈرامائی موڑ تب آیا جب اُسکے بڑے بھائی رستم مودی نے ''اتفاق'' گروپ سے ساجھے داری کر کے ''آریہ سبودھ ناٹیہ منڈل'' نام کی تھیٹر کمپنی کھولی۔ اس طرح سہراب مودی کو اپنے ڈراموں میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، سہراب مودی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اُسکے اندر بے پایاں لگن اور ولولہ تھا۔ اُسنے شیکسپیر کے شہرہ آفاق ڈرامے ''ہیملیٹ'' کا انتخاب کیا۔ کئی خیر خواہوں نے اُسے تنبیہ بھی کی کہ وہ شیکسپیر سے دور ہی رہے مگر سہراب مودی اپنی ضد کا پکّا تھا۔ اُسنے کسی کی نہ سنی۔ دراصل سہراب مودی سے قبل کئی لوگوں نے شیکسپیر کے ڈراموں کو اُردو اور ہندی میں ڈھالنے کی سعی کی تھی مگر اُن کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اسلئے اُن لوگوں نے سہراب مودی کو بہتر اسمجھایا کہ وہ اس غلطی کو نہ دہرائیں مگر وہ کہاں کسی کی سننے والا تھا۔ شیکسپیر تو اُسکے دل و دماغ میں رچا بسا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے بس شیکسپیر کے کرداروں میں کھویا رہتا تھا۔ اُسنے ''ہیملیٹ'' کے مکالموں کو چستہ اُردو میں ڈھالا اور پوری تیاری کے ساتھ وہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ یہ ڈرامہ ''خون کا خون'' نام سے پیش کیا گیا۔ جب یہ ڈرامہ پہلی بار پیش ہوا تو دیکھنے والے دانتوں تلے اُنگلیاں دبا کر رہ گئے۔ نہ جانے اُسکے مکالموں کی ادائیگی میں کیا جادوگری تھی کہ شائقین اُسکے ایک ایک مکالمے پر قربان ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ خود جہانگیر بنے ہوئے تھے اور نسیم بانو کو اُس نے پہلی بار اسٹیج سے متعارف کرایا تھا۔ اس ڈرامے نے ملک بھر میں دھوم مچائی۔ راتوں رات سہراب مودی اور نسیم بانو شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ وہ جس شہر میں بھی جاتے تھے لوگ کھلے دل سے اُن کا سواگت کیا کرتے تھے۔ سہراب مودی شیکسپیرن کلاکار کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ ہر رول کو پوری ایمانداری اور خلوص سے نبھایا کرتا تھا۔

اُسکے بعد سہراب مودی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ ایک کے بعد ایک اسٹیج ڈرامے پیش کرتے رہے۔ اونچی آواز میں لمبے لمبے ڈائیلاگ پیش کرنا اور وہ بھی ٹھیٹ اُردو میں، سہراب مودی کی پہچان بن گئی۔ مکالموں کی ادائیگی میں اُسے طرہ امتیاز حاصل تھا۔ اُسکے اس انداز کو کئی اداکاروں نے نقل کرنے کی کوشش کی مگر وہ سبھی ناکام رہے۔ سہراب مودی کی آواز میں جو گھن گرج تھی وہ کسی بھی مکالمے کو زندگی بخش دیتی تھی۔

حالات بدل رہے تھے۔ اسٹیج کی مقبولیت بھی بتدریج کم ہوتی

جارہی تھی۔فلموں نے اسٹیج ڈرامے کو پچھاڑنا شروع کر دیا تھا۔سہراب مودی بھی اس بدلاؤ کو سمجھ چکے تھے اسلئے اُس نے تھیٹر چھوڑ کے فلموں کا رخ کیا۔اُسنے سن 1935 میں اسٹیج فلم کمپنی نام سے اپنی پروڈکشن کمپنی کھولی جس کے تحت اُسنے اپنا مشہور ڈرامہ ''خون کا خون'' فلم پر اُتار کر اُسے من وعن پیش کیا۔یہ تجربہ بہت ہی تلخ ثابت ہوا۔فلم بری طرح ناکام ہوئی۔اُسکے بعد سن 1936 میں اس نے ''سعیدہ ہوس'' نام سے ایک اوڈرامے کو سلولائیڈ پر اُتارا۔یہ فلم بھی چل نہیں پائی۔یہ فلم بھی شیکسپیر کے ''کنگ جان'' نامی ڈرامے پر مبنی تھی۔فلموں کی ناکامی سے سہراب مودی کو کافی مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔اس زیاں سے وہ کافی مایوس اور دل برداشتہ ہوکر رہ گئے۔

1936 میں ہی اُس نے اپنی نئی فلم کمپنی ''منروا موی ٹون'' کی داغ بیل ڈال دی۔1938 میں سہراب مودی نے دو فلمیں بنائیں۔دونوں موضوعاتی اعتبار سے جدا تھیں۔''میٹھا زہر'' شراب کی تباہ کاریوں پر مبنی تھی جب کہ اُن کی دوسری فلم ''طلاق'' ہندو عورتوں کے بنیادی حقوق کے موضوع پر بنائی گئی تھی۔یہ دونوں فلمیں کامیاب تو رہیں مگر جس قسم کی کامیابی کے سہراب مودی متمنی تھے اُس سے یہ فلمیں قدرے دور تھیں۔1939 میں ''منروا موی ٹون'' نے فلم ''پکار'' بنائی۔یہ فلم عدل جہانگیر پر مبنی تھی۔اس فلم میں چندر موہن اور نسیم بانو کو پیش کیا گیا تھا۔فلم نے نہ صرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے بلکہ ''منروا موی ٹون'' کو فلم سازی کے ایک تاریخی دھارے پر ڈال دیا۔سہراب مودی کا نام تاریخی فلمیں بنانے والوں میں ایک معتبر نام بن کر رہ گیا۔''پکار'' کی کامیابی کے پیش نظر سہراب مودی نے 1941 میں ''سکندر'' اور 1943 میں ''پرتھوی ولبھ'' جیسی کامیاب فلمیں پردہ سیمیں پر پیش کیں۔''پکار'' میں اُس نے نسیم بانو کو ایک نئے رنگ وروپ میں پیش کیا۔اسکے سیٹس، کمال امروہی کے لکھے اسکے مکالمے آج بھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہیں۔سہراب مودی نے پکار میں مغلیہ دور کی کچھ عدالتی ایوانوں کا استعمال کیا جس سے اس فلم کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے۔فلم بینوں کو پہلی بار اتنے خوبصورت اور عالیشان سیٹس دیکھنے کو ملے۔

اپنی فلم ''سکندر'' میں پرتھوی راج کپور کو سکندر کے کردار میں پیش کر کے اُسنے اس کردار کو جاوداں کر دیا۔اُن دنوں گاندھی جی کی تحریک زور پکڑتی جارہی تھی۔فلم ''سکندر'' نے اس تحریک کو جلا بخشی۔اس فلم نے لوگوں کے دلوں میں دیش بھگتی کے جذبے کو اور زیادہ مستحکم اور ولولہ خیز کر دیا۔اس فلم کی مقبولیت دیکھ کر برطانوی حکمرانوں نے کئی شہروں میں اسکی نمائش پر روک لگا دی۔روک لگانے سے اس فلم کی مقبولیت اور بڑھ گئی اور ایک دہائی تک یہ فلم عوام الناس کی پسندیدہ فلم بنی رہی۔اس فلم نے کاروبار کی ساری حدیں پار کر دیں۔اس فلم کو ایک شہکار کا درجہ حاصل ہے۔

1946 میں نسیم بانو کے ساتھ اُنکے رشتے اُستوار نہ رہے۔رشتوں میں تلخی در آئی۔باوجود اسکے نسیم بانو نے 1950 میں اُنکی فلم ''شیش محل'' میں کام کرنا منظور کیا۔اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ جب ممبئی کے ''منروا تھیٹرس'' میں ''شیش محل'' کا شو چل رہا تھا، سہراب مودی بھی ہال میں بیٹھا ہوا تھا تبھی اُن کی نظر سامنے کی قطار میں بیٹھے ایک فلم بین پر پڑی جو آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا۔سہراب مودی کو اُس شخص کی اس بیہودگی پر بڑا غصہ آیا۔اُسنے تھیٹر کے ایک کارندے کو بلوا کر کہا کہ وہ اس شخص کے پیسے واپس کر کے اُسے تھیٹر سے باہر جانے کے لئے کہے۔وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی فلم کی بے عزتی سہہ نہیں سکتا۔جب اُس آدمی سے پوچھا گیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے کیوں بیٹھا ہے تو پتہ چلا کہ وہ اندھا ہے۔وہ تو بس سہراب مودی کے ڈائیلاگ سن کے اپنے من کو بہلانا چاہتا ہے۔یہ تھا سہراب مودی کے مکالموں کا جادو جو سر چڑھ کے بولتا تھا۔

1953 میں سہراب مودی نے پہلی تیکنی کلر فلم ''جھانسی کی رانی'' بنائی۔یہ فلم لاگت کے اعتبار سے کافی مہنگی فلم تھی جس کے لئے لندن سے ٹیکنیشن بلائے گئے۔فلم کی ہیروئن مہتاب تھی جو اس سے پہلے اُن کے معاون کے طور پر کام کر رہی تھی۔بعد میں سہراب مودی نے اُس سے شادی کر لی۔یہ فلم بری طرح ناکام رہی۔

سہراب مودی کی جگہ کوئی اور فلم ساز ہوتا تو شاید اتنے شدید جھٹکے کے بعد فلم سازی سے ہی توبہ کر لیتا پر سہراب مودی اُس خمیر کا آدمی نہیں تھا۔اُس نے سن 1954 میں فلم ''مرزا غالب'' بنائی جو بیحد مقبول رہی۔اس فلم کے گانے آج بھی اُتنے ہی مقبول ہیں جتنے اُس زمانے میں تھے۔اس فلم کو کئی اعزازات سے نوازا گیا۔1955 میں اُس نے فلم ''کندن'' بنائی جو نمی اور سہراب مودی کی بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔''کندن'' باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔1958 میں سہراب مودی نے فلم ''نوشیروان عادل'' بنائی جس کی صدا بہار موسیقی سی رام چندر نے ترتیب دی تھی۔آج بھی جب اس فلم کے گانے بجتے ہیں تو سننے والا کسی اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔

اس فلم میں راجکمار نے نوشیروان کا کردار ادا کیا تھا۔اُنکے مد مقابل مالا سنہا تھی جس نے ہیروئین کا رول نبھایا تھا۔ہدایت سہراب مودی کی تھی جس نے خود بھی ایک دم دار کردار ادا کیا تھا۔فلم بیحد کامیاب رہی تھی۔

1938 میں بنی فلم ''جیلر'' کو اُنہوں نے 1958 میں دوبارہ بنا لیا۔یہ اُنکے بینر تلے بننے والی آخری فلم تھی۔اُسکے بعد اُنہوں نے ''مینا کماری کی امر کہانی'' کی ہدایت کاری کی۔بعد میں وہ اداکاری کی طرف زیادہ دھیان دینے لگے۔اُنکی باہر کی فلموں میں سب سے یادگار فلم ''یہودی'' تھی جو اُنہوں نے بمل رائے کے اصرار پر کی تھی۔اُنکی آخری فلموں میں کمال امروہی کی ''رضیہ سلطان'' اور متھن چکرورتی کی ''باکسر'' تھی جو اُنہوں نے متھن کے کہنے پر کی تھی۔

سہراب مودی آخری وقت تک ایک شہنشاہ کی طرح جیا۔تنگی ترشی کا

دور رہا ہو یا خوشحالی کا اُسکے سبھاو میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ تو بس آخری پل تک فلموں کے ساتھ ہی جڑا رہا۔ فلموں کو ہی اُسنے اپنی زندگی کو محاصل بنا لیا تھا۔ آج بھی سہراب مودی کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ فلم انڈسٹری میں آج بھی اُسکی عزت وتوقیر جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ سہراب مودی قصہ پارینہ ہی سہی مگر جب بھی اچھی اور شہکار فلموں کا زکر ہوگا سہراب مودی کا نام سر فہرست ہوگا۔ اُن کی فلموں کی تفصیل یوں ہے۔

1۔خون کا خون	1935
2۔سعید ہوس	1936
3۔خان بہادر	1937
4۔آتما ترنگ	1937
5۔طلاق	1938
6۔میٹھا زہر	1938
7۔جیلر (پارٹ۔۱)	1938
8۔جیلر (پارٹ۔۲)	1938
9۔پکار	1939
10۔بھروسہ	1940
11۔سکندر	1941
12۔پھر ملنگے	1942
13۔پرتھوی ولبھ	1943
14۔پرکھ	1944
15۔ایک دن کا سلطان	1945
16۔منجدھار	1947
17۔نرسنہا اوتار	1949
18۔دولت	1949
19۔شیش محل	1950
20۔جھانسی کی رانی	1952
21.۔مرزا غالب	1954
22۔کندن	1955
23۔راج ہٹ	1956
24۔نوشیروان عادل	1957
25۔جیلر	1958
26۔میرا گھر میرے بچے	1960
27۔سمے بڑا بلوان	1969
28۔مینا کماری کی امر کہانی	1981

☆

کبھی مہر ہے، کبھی قہر ہے دل دوستاں بھی عجیب ہے
کوئی مہرباں، کوئی قہرماں یہ مرا جہاں بھی عجیب ہے

کبھی درد بن کے تڑپ اُٹھا، کبھی اشک بن کے چھلک پڑا
دل ناتواں کی نہ بات کر، دل ناتواں بھی عجیب ہے

کبھی خوب کُھل کے برس گیا، کبھی بوند بھر کو ترس گیا
ترے آسمان کی خیر ہو، ترا آسماں بھی عجیب ہے

نہ سبھی نے تجھ کو بھلا کہا، نہ سبھی نے مجھ کو بُرا کہا
تری داستاں بھی عجیب ہے، مری داستاں بھی عجیب ہے

ہوا نذرِ برق وہ یک بیک، میں سُلگ رہا ہوں ابھی تلک
مرا آشیاں بھی عجیب تھا، غمِ آشیاں بھی عجیب ہے

کوئی خواب بھی نہ دِکھا سکی، کوئی یاد ہی نہ دلا سکی
نہ جگا سکی، نہ سُلا سکی، شبِ رائیگاں بھی عجیب ہے

یہاں ہر عمل پہ گرفت ہے، وہاں کچھ نہ کرنے کی شرط ہے
تیرا یہ جہاں بھی عجیب ہے، ترا وہ جہاں بھی عجیب ہے

میں نے دل سے پوچھا کہ کیا ہوا، تجھے کس نے درد عطا کیا
تو وہ ہنس کے راز چھپا گیا، مرا رازداں بھی عجیب ہے

نہ سوال میں تھی کوئی ادا، نہ جواب ہی کوئی بن پڑا
جو لکھا تو صرف یہی لکھا کہ یہ امتحاں بھی عجیب ہے

کہیں تو خیالؔ ٹھہر ذرا، کوئی شخص تجھ کو بھلا لگا؟
کبھی یہ بُرا، کبھی وہ بُرا، تری ایں و آں بھی عجیب ہے

پروفیسر خیال آفاقی (کراچی)

ورثہ

''آرزوئے وصل''

اختر شیرانی

آرزو وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم عزیزوں کا حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

ان کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں، ہرسُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل و لالہ مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سُن سُن کہ وہ ہوتے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

سیرِ گُل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اخترؔ
ان کی الفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

لالہ کانجی مل صباؔ

سحر جب بسترِ راحت سے وہ رشکِ قمر اُٹھا
غلامی اس کی میں خورشید لے تیغ وسپر اُٹھا

ابھی تسکیں ہوئی تھی اک ذرا فریادوزاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اٹھا

گلے پر میرے خنجر پھیرتا وہ اور بھی ، لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اُٹھا

نہیں معلوم اے یارو صباؔ کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکا یک آہ کر اُٹھا

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

دل مطمئن اور نگاہِ دوستانہ سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ اس ''مسکن نشین'' کو جس کا رابطہ کتابوں کی دکان، لائبریری اور ادبی محفل سے کٹ گیا ہے ''چہارسُو'' باقاعدگی سے بھجواتے ہیں۔ اب میرا ''حلقہ احباب'' وہ مصنفین ہیں جن کی کتابیں مجھے مطالعے کے لیے گھر پر مل جاتی ہیں۔ اور ان میں آپ کے ساتھ ''چہارسُو'' بھی شامل ہے۔ مزید شکریہ اس بات کا بھی ادا کرنا ہے کہ آپ نے مجھے ''چہارسُو'' سے کبھی غیر حاضر نہیں ہونے دیا۔ اور ''قرطاسِ اعزاز'' پانے والوں پر میرے مضامین کی اشاعت سے ''چہارسُو'' کی مجلس میں میری حاضری بھی لگوا دیتے ہیں۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں جب میں محکمہ آبپاشی میں انجینئرنگ کی ملازمت میں میانوالی کے صحراؤں میں ''نقل نہر'' کی تعمیر پر متعین ہوا تو اس پیشہ ورانہ زندگی میں ادب سے میرا رابطہ کٹ گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کے عرصے میں انور گوئندی صاحب نے اپنے رسالہ ''کامران'' میں میرے افسانوں کی مکرّر اشاعت سے مجھے ادبی دنیا سے وابستہ رکھا۔ اس دور میں ہی ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے ''اوراق'' میں ''تجدید ادب'' کا موقعہ دیا اور ''اردو زبان'' کا پس پردہ مدیر بھی بنا دیا۔ انور گوئندی کے اس احسان کا تذکرہ میں ہر جگہ کرتا ہوں۔ اب آپ نے اپریل کے شمارے میں مسعود مفتی صاحب کو ''قرطاسِ اعزاز'' پیش کر کے ''چہارسُو'' کا رتبہ بلند کر دیا ہے۔ ہمارے ملک کے بہت سے ادیبوں کی تخلیق کاری کا مقصد ذاتی شہرت اور ناموری ہے اور وہ اس کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلتے ہیں اور میڈیا تک رسائی حاصل کر کے سمجھتے ہیں کہ اب وہ دوام ابد کے حقدار ہو گئے ہیں۔ لیکن زمانے کا جاروب کش جب ان کا نام ہی صاف کر ڈالتا ہے تو یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ وہ ''نروان'' سے محروم رہے اور عمر بھر ''دو پیسے'' کا کام ہی کرتے رہے۔ مجھے ایک مقبول و نامور ادیب یاد آ رہے ہیں جو اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے وفات تک قریباً ستّر اسّی سال تشہیر الاشاعت اخبارات، رسائل اور ریڈیو، ٹی وی کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کی سالگرہ کا جشن سات ستارہ ہوٹلوں میں منایا جاتا۔ مقالات پڑھنے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ پھولوں کے گلدستے پیش کیے جاتے۔ ملک کا کوئی مشاعرہ ان کی شرکت اور صدارت کے بغیر انعقاد پذیر نہ ہوتا۔ لیکن جب کوہِ ندا کے بلاوے پر دنیا سے اٹھ گئے تو اب قصّہ ماضی بن چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے قدموں میں بیٹھنے والے انہیں بھلا کر اب اپنی شخصیت چمکا رہے ہیں۔ اس قسم کے مقصد پرست ادیبوں کے برعکس مسعود مفتی صاحب کے باطن میں ایک سچا پاکستانی ادیب سانس لے رہا ہے۔ جو حالات وطن پر ''گریہ'' کرتا ہے تو ان کا احساس ملال افسانے کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ ''توبہ'' ان کے احساس کا آئینہ دار ہے اور قاری کے لیے ''عبرت نشان'' ہے۔ مقصودہ حسین صاحبہ نے ان پر اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلے ''پاکستانی ادب کے معمار'' میں ایک جامع کتاب لکھی ہے۔ اب ''چہارسُو'' کا یہ گوشہ بھی ان کے مطالعے میں معاونت کرے گا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مسعود مفتی صاحب کے گوشے میں ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا اور تاج سعید سے ملاقات کرا دی۔ اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ مسعود مفتی کے مضمون ''اب تو مر جانے کو جی چاہتا ہے'' میں واحد متکلم کی شہادت سے کئی قیمتی اور نادر باتیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے ۱۹۸۰ء کی اہلِ قلم کانفرنس کا ذکر بھی کیا ہے جس میں وہ خود تو موجود نہیں تھے لیکن اس میں جنرل ضیاء الحق کے خطبے کا ذکر سن چکے تھے۔ مجھے اس کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اور جنرل ضیاء الحق نے ایک خاص قسم کے ادیبوں پر وطنِ عزیز کی ہوا، پانی اور چاندنی حرام قرار دی تھی کہ ان کی وطنِ عزیز سے کمٹمنٹ مضبوط نہیں تھی اور فکری سرچشمے بھی بیرون ملک واقع تھے۔ آمر صدر کی تقریر کو ملک کے تمام نامور ادیبوں نے جن میں احمد ندیم قاسمی صاحب بھی شامل تھے مکمل یکسوئی سے سنا اور حد یہ ہے کہ فوجی صدر نے ایک شاعر کی نظموں سے چند اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے تو اس شاعر کو جو سرکار کے ملازم بھی تھے اپنی نوکری کی فکر لاحق ہو گئی۔ لیکن کانفرنس کے کسی اجلاس سے ''احتجاج'' کی معمولی سی آواز بھی نہ اٹھی۔ قاسمی صاحب بھی لب بستہ بیٹھے رہے۔ میں یہ بات ریکارڈ کی درستی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ دوسری مجلس میں قاسمی صاحب نے اپنا مقالہ ضرور پڑھا لیکن ریاست سے وفاداری کا تذکرہ بہتر انداز میں قدرت اللہ شہاب اپنے مضامین میں کر چکے تھے اور اب صدیق سالک صاحب بھی جو خود فوجی تھے اسی کا کریڈٹ لے رہے تھے۔ قاسمی صاحب نے جب اپنا مقالہ پڑھا تو صدر ضیاء الحق ہی نہیں تمام سرکردہ سرکاری افسران محفل سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ لمبے عرصے کے بعد قاسمی صاحب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے یہ ''کلیدی مقالہ'' صدر ضیاء کی موجودگی میں پڑھا تھا اور میں نے کئی مواقع پر واضح کیا کہ انہوں نے یہ مقالہ ''محفوظ ماحول'' میں پڑھا تھا۔ اور صدارتی خطبے میں اقتباس شدہ اشعار پر تو قاسمی صاحب خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔ میں اب بھی یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ قاسمی صاحب کے مقابلے میں وطنِ عزیز سے مسعود مفتی کی کمٹمنٹ زیادہ

مضبوط اوران کی ایمانیات کا حصّہ نظر آتی ہے۔ یہ کمٹمنٹ ان کی سرکاری ملازمت کے دوران بھی ان کی تخلیقات سے نمایاں ہو رہی تھی اور ریٹائرمنٹ کے بعد تو انہوں نے ایک سیاسی جماعت بھی بنائی اور خط کتابت سے کئی لوگوں کے خیالات کو منقلب کیا۔لیکن زمانے کی موٹی کھال کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔

افسانوں کے حصے میں طاہرہ اقبال، رینو بہل، گلزار جاوید اور جتندر بلّو کے افسانے میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ ہر افسانہ قرأت کے دوران ایک خاص قسم کا ردّعمل بھی پیدا کرتا ہے جو بالآخر افسانے کی کامیابی کی شہادت دیتا ہے۔ میں یہاں خاص طور پر مشتاق اعظمی صاحب کے افسانے ''قطرہ قطرہ احساس'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو احساس کی شدت سے لکھا گیا اور اختصار وکفایت لفظی کے باوجود اپنا بھرپور تاثر پیدا کرتا ہے۔ یہ افسانہ ''اندر کی عمارت'' میں ہونے والی واردات کی خبر انوکھے انداز میں دیتا ہے۔ کڑی دھوپ کے سفر میں پیاس ''اور ہتھیلی کی لکیروں میں زندگی کا مرجانا'' نئی معنویت کی آئینہ داری کرتے ہیں اور جب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ بلڈ کینسر واحد متکلم پر حملہ آور ہے اور آخری اسٹیج رونما ہو گیا ہے تو درد کی شدت بڑھ جاتی ہے۔شاید اس شدت کو ابھارنا ہی افسانہ نگار مشتاق اعظمی کا مقصود تھا۔

مہندر پرتاپ چاند صاحب کا سفر نامہ ''جبین نیاز'' بھی میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ میں نے چند سال لیبیا دائرہ دین پناہ اور کوٹ ادّو میں گزارے ہیں۔انہوں نے جن اشخاص، مقامات اور اداروں کا ذکر کیا ہے وہ میرے ماضی کا بھی حصہ ہیں۔ اس سفر نامے میں ایک خاص ناسٹلجیا کی کیفیت ہے۔ جو مجھے بھی شدت سے محسوس ہوئی کہ اب یہ مقامات میری نظر سے دور ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نسیم لیبیا، جعفر بلوچ، گفتار خیالی، حنیف سیماب، شہباز نقوی، جسارت خیالی، سلیم اختر ندیم اور کئی دیگر دوستوں کی یاد تازہ کر دی۔ بلکہ ان سے ملاقات کرا دی۔

آخر میں ایک دفعہ پھر اپنا مطالبہ پیش کرتا ہوں کہ ''چہارسُو'' میں چھپنے والے مکالموں کی کتاب ضرور چھاپیئے۔آپ کی پہلی کتاب سے ایم اے، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلباء استفادہ کر رہے ہیں۔اور ہر وقت میرے زیر استعمال رہتی ہے۔''چہارسُو'' کے سب پرچے میرے پاس موجود ہیں لیکن جو معاونت یہ کتاب کرتی ہے وہ بے مثال ہے۔اس کام کے لیے آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ میری صحت دگرگوں ہے۔ دعا کی درخواست ہے۔

انور سدید (لاہور)

عزیز و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام شوق۔

مسعود مفتی صاحب کو ''قرطاسِ اعزاز'' تفویض کرنا اچھا لگا۔ایسے ہمہ جہتی ادیب کی خدمات کا اعتراف ہم سب کے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔ آپ نے چہارسو کے ذریعے جس عمدہ روایت کی بنا ڈالی ہے وہ دیگر ادبی رسائل کے مدیران کے لیے بھی قابل تقلید ہے۔ بلاشبہ آپ کی ژرف نگاہی بھی قابل صد تحسین ہے۔آپ کے درجات کی بلندی کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

میرے گلزار، خوش رہو۔

چہارسُو بابت مارچ اپریل باصرہ نواز ہوا۔ جب بھی چہارسو کی ہارڈ کاپی ملتی ہے تو گویا قارون کا خزانہ میرے ہاتھ لگ جاتا ہے۔عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ فوراً سے پیشتر اوّل تا آخر اپنے دل میں اتار لوں۔اس بار مسعود مفتی صاحب سے آپ کا براہِ راست خوب ہے۔ یہ پڑھ کر اور بھی اچھا لگا کہ مفتی صاحب ایک بے خوف اور صاف گو انسان ہیں جن کے دل میں ملک اور قوم کا درد بھرا ہے۔آپ کا انٹرویو گرچہ ہر شمارے کی زینت ہوتا ہے مگر صاحب قرطاسِ اعزاز کی شخصیت کو سامنے رکھ کر اس قدر انوکھا اور دلچسپ ہوتا ہے کہ سامنے والی شخصیت کی مکمل ترجمانی ہو جاتی ہے۔ای۔میل پر ''دروازہ کھلا رکھنا'' کی بابت آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ آپ اس سے بُری کہانی نہیں لکھ سکتے۔ بھلا بتلایئے کہ ایک تراسی سالہ کمزور و ناتواں شخص کو ستر سال پیچھے اس کے ماضی میں لے جانا کہاں کا انصاف ہے۔تین مرتبہ پڑھنے کے بعد منظوم تاثرات ارسالِ خدمت کر رہا ہوں جن کے شاملِ اشاعت ہونے کی زیادہ امید نہ ہے۔ میرے دوست جتندر بلّو کی کہانی ''نصیب اپنا اپنا'' اور عزیزہ رینو بہل کی کہانی ''مجھے کیا بُرا تھا مرنا'' دیر تک دل پر دستک دیتی رہیں بلکہ رینو بہل کی کہانی کے انجام نے تو آبدیدہ کر دیا۔ فیروز عالم صاحب کا سلسلے وار ''ہوا کے دوش پر'' اور برادرِ عزیز مہندر پرتاپ چاند کا ''جبینِ نیاز'' احساسات و جذبات کی شدت کے ساتھ معلومات اور شیریں بیانی سے لبریز ہونے کے باعث اپنی اپنی جگہ بے مثل اور باکمال تحاریر ہیں۔شعری حصہ بھی اپنی جگہ بھرپور اور جاندار ہے جس کے لیے فرداً فرداً نام تحریر کرنے کے بجائے اجتماعی مبارک باد دینا مناسب ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

برادرِ مکرم، سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

چند روز قبل ''چہارسُو'' موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ مضامین نثر اور نظم دونوں ہی بہت خوب ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ''مسعود مفتی کو خاصا نظر انداز کیا جاتا رہا ہے''۔لیکن ان کے بارے میں مضامین دل کش ہیں اور اچھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ آپ کا افسانہ بھی دلچسپ ہے۔ منظومات کی بات تو یوں ہے کہ اس دور میں پاکستان اور ہندوستان میں شعرا کی تعداد ناقابل یقین حد تک ضرورت سے کہیں زیادہ ہے، کچھ لوگ جو ابتداء میں شاعر نہیں تھے یکبارگی ہی سبزے کی فراوانی دیکھ کر اس سبزہ زار میں بھی گھس پڑے ہیں مثلاً ایک شاعرہ کی نظم کا آخری مصرع میں بڑا سا سکتہ ہے۔ارکان یہ ہیں۔ فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن ۔۔۔آخری مصرع ہے۔

وہ غزل ہی کیا جو ہو برائے زندگی

الفاظ ۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ جو ۔۔۔۔ کے درمیان موٹا سا سکتہ ہے۔اسی طرح لفظ ''لگے'' بھی ایک شاعرہ نے جس طرح استعمال کیا وہ غلط ہے، کسی لفظ کو محاورتاً استعمال کرنے کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ پروفیسر قیصر نجفی نے جوش کے مراثی کا تذکرہ تو کیا لیکن ان کے دو چار اشعار ہی نمونتاً دے دئے ہوتے تو بہتر ہوتا۔

نقشبند قمر نقوی بھوپالی (یو۔ایس۔اے)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔''چہارسُو'' کا تازہ ترین شمارہ (مارچ ۔ اپریل ۲۰۱۱ء) ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' کے ساتھ موصول ہوا۔ رسالہ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے ہی چلے گئے۔حسبِ سابق ''براہِ راست'' میں آپ نے مسعود مفتی صاحب کو خوب کریدا اور ان سے کئی ایک دلچسپ/سبق آموز انکشافات کرائے۔ ڈاکٹر وزیر آغا (مرحوم) نے مفتی صاحب کو ایک مزاح نگار کی حقیقت سے دیکھا جس سے مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر فتح محمد ملک اور تاج سعید نے اپنے اپنے انداز میں مفتی صاحب کے فن کا جائزہ لیا ہے اور سچ بات یہی ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔رہی خود مفتی صاحب کی تحریریں تو ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔انہیں جب بھی پڑھیں ان کی تازگی میں سرِ مو فرق کا احساس نہیں ہوتا۔یہی ایک بلند پایہ ادیب کا کمال ہے۔افسانوں میں ''قربان گاہ تاج پر'' (نجیب عمر) ''قطرہ قطرہ احساس'' (مشتاق اعظمی) اور ''دروازہ کھلا رکھنا'' (گلزار جاوید) بہت پسند آئے۔موخرالذکر کے عنوان ہی نے ایک ایسی یاد تازہ کی کہ سینے میں ہُوک سی اٹھی۔''جوش کے انقلابی مرثیے'' پروفیسر قیصر نجفی کا ایک فکر انگیز مضمون ہے۔حصہ نظم میں بھی آپ کا حسن انتخاب جھلکتا ہے لیکن یہ کیا کہ ادبی رسائل کے عناصر خمسہ (کرامت بخاری، اکرام تبسم، احمد صغیر صدیقی، انجم جاوید اور غالب عرفان) میں صرف ایک (غالب عرفان صاحب) جلوہ گر نظر آئے؟

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ایس۔ایم۔معین قریشی (کراچی)

ادبی گل وگلزارِ جاویداں، السلام علیکم۔

چہارسو کی بہاریں دیکھتا ہوں اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔آپ نے ٹائٹل کمپوزنگ اردو انتخاب میں بہر رنگ اپنی سی کر رکھی ہے۔رسالہ خوب ہے پڑھنے بیٹھا ہوں تو پڑھ کے اٹھا ہوں اللہ رکھے تحصیل ذوق کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔مشہور افسانہ نگار مسعود مفتی اسی احترام وعزّت کے لائق تھے۔چہارسو نے ان کے معتبر ادبی اطراف کی تصویر کشی کی، کمال کیا۔ان کا ادبی تشخص سب پر روشن ہے۔میں بھی ان کا ''فین'' ہوں۔''پاک جمہور'' کے ضمن میں ان سے میری خط وکتابت بھی ہوئی۔میں اپنی دور افتادگی کی وجہ سے پارٹی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔لوگوں کی سیاسی عادت کچھ ایسی ہے کہ وہ ''پاک جمہور'' کو نہیں محسوس کر سکے۔تفہیم کا مسئلہ بھی تھا۔کرشن کمار طور کی شاعری دل کے تاروں کو چھونے والی ہے۔''چہارسو'' کے صفحات کی وساطت سے ان سے متعارف ہوں۔اب سلسلۂ مراسلت بھی چلا ہے۔پہلے ان کا رسالہ ''سرسبز'' آیا پھر دو کتابیں۔ایک حمد، نعت، سلام کی کتاب چشمہ چشم ایک غزلوں کا مجموعہ غرفۂ غیب، حمد' نعت' سلام کے اظہارات نے تو مجھ پر سحر سا طاری کر دیا ہے۔حمد، نعت، سلام میں کئی غیر مسلم شاعروں نے بھرپور محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے کرشن کمار طور کا سیاق وسباق ازحد متاثر کرتا ہے۔چشمہ چشم سے حمد، نعت اور سلام کا ایک ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اس کے حضور سر کو جھکائیں یقین سے
پیشانی کو نماز سے رب آئینہ کریں

ہندو ہوں مگر یقیں ہے اُس پر
میرا دل، میری جاں محمدؐ

ان کی عظمت بیان کیسے ہو
کب نہیں تھے یہاں جو آپ ہیں حسینؑ

افسانے مزاجیت کے اعتبار سے پائے کے ہیں۔ان میں حیاتی ردوقبول کا دروازہ کھلا ہے۔گویا ''جاؤ اور آؤ'' دیپک کنول نے محبوب خان مرحوم کو خوب محبوب بنا کر پیش کیا۔محبوب خان کی فلمیں دیکھتا رہا ہوں۔ ہدایت کاری، اداکاری، موسیقاری لاجواب تھی۔لتا، رفیع، مکیش، شمشاد کے گانے غضب ڈھاتے تھے۔لتا سے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ارشاد ہے کہ اردو کی خدمت میں لتا منگیشکر ممتاز ہیں۔خوشی کی بات ہے کہ باقی دوستوں کے ساتھ یہاں پروفیسر زہیر کنجاہی بھی موجود ہیں۔ان سے اپنی پرانی یادوابستہ ہے۔ان کے ادبی معرکے ''روزِ روشن'' کی طرح عیاں ہیں۔ان کی ڈھیروں ڈھیر کتابیں چہارسو نظر آتی ہیں۔ماشاء اللہ جبین نیاز (سفرِ پاکستان کی خوشگوار یادیں) سرتاسر دلی اخلاص سے مملو ہے۔ مہندر پرتاپ چاند نے یہ سفرنامہ ''قلم اشک ناز'' سے رقم کیا ہے۔میں نے لیہ کے اخبار ٹھنڈی آگ میں ان کی تقریبات کی تصویریں دیکھی ہیں۔نوید سروش صاحب نے اپنے خط میں احباب کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا ہے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کے اس شعر کے ساتھ۔

تم ''جوانوں'' کے مسائل سے نہیں ہو واقف
تم نے شاید کہ جوانی میں محبت نہیں کی

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ شمارہ مسعود مفتی کی زندگی اور ادبی کارناموں سے پُر ''چہارسو''

کی روایات کا شاہکار ہے جس کی مبارکباد۔ موصوف نثر نگاری میں سنجیدہ افسانہ نگاری سے لے کر فکاہیہ مضامین تک میں یکساں دسترس رکھتے ہیں یہ مجھے اب معلوم ہوا۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے ''شہرِ افسوس'' میں اُن کی سقوطِ مشرقی پاکستان کی بپتا کو خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے اس تحریر نے بہت سارا ماضی میرے اندر سے کُرید کر میرے سامنے بکھیر دیا ہے۔ ۷۷ سالہ یہ تخلیق کار آج بھی اپنی تحریر میں جگمگاتا، روشنی بکھیرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ''دروازہ کھلا رکھنا'' ایک کہانی یا افسانہ نہیں بلکہ ہمارے سماج کا وہ آئینہ ہے جہاں دو کردار، دو مختلف زاویوں سے اپنا اپنا عکس تشکل کر رہے ہیں۔ زندگی گزارنے کے کئی طریقوں میں سے یہ دو طریقے بھی ہمارے ماحول کی عکاسی کر رہے ہیں جو یقیناً قابلِ غور ہیں۔ نجیب عمر کا ''قربان گاہ تاج پر'' اگرچہ ماضی کی تاریخ مغلیہ ہے مگر دیکھا جائے تو ہر تاریخی عمارت میں مدفون اُن گمنام فن کاروں کی داستان ہے جن پر ہمیشہ وقت کا خاموش پردہ پڑا رہتا ہے۔ غزلوں میں جمیل یوسف کی غزل ''کارِ رفو'' شمارے کی جان ہے بہت پسند آئی نظموں میں BREAKING NEWS (حمیرا راحت) بہت پسند آئی۔

غالب عرفان (کراچی)

برادرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

آج چہارسُو کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ شکریہ قبول کیجیے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ ادب کے ان درخشاں ستاروں کو کس قدر خوبصورتی کے ساتھ چہارسو کے صفحات میں سجاتے ہیں۔ اس دفعہ مسعود مفتی کو رسالے کے قرطاسِ اعزاز پر دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ مجھے اُن سے صرف ایک دفعہ ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ مگر اُن کی سحر انگیز شخصیت کا جادو آج بھی مجھے مسحور کرتا ہے۔ وہ پاکستان کے سچے عاشق ہیں اور اس ملک کے لیے عظیم خواب رکھتے ہیں۔ مسعود مفتی صاحب پر لکھے گئے مضامین میں مجھے اپنے استاد احسن فاروقی صاحب کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خوبصورت یادوں کو تازہ کرنے پر ایک دفعہ پھر دلی شکریہ قبول کیجیے۔

پروفیسر مسکین احمد منصور (حیدرآباد، سندھ)

برادرِ عزیز و مکرم۔

آپ ہر بار کسی نہ کسی معتبر شخصیت سے ملاقات کرواتے ہیں یہ بڑا احسان ہے آپ کا اردو ادب پر تحقیق کا کام کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے (آمین) بہتر ہوگا کہ اگر آپ ان تمام حضرات کا پتہ بھی شائع کر دیا کریں مگر پتا تو ہر اہلِ قلم کا بھی اُسکی تخلیق کے ساتھ شائع ہونا چاہیے تاکہ اگر کسی نے رابطہ کرنا ہوا تو سہل ہو جائے۔ کسی زمانے میں کاتبوں کی تعلیم کم از کم ''ادیب'' تک ہوتی تھی اور اکثر کی تعلیم فاضل اردو اور فاضل فارسی ہوا کرتی تھی۔ نامور ادیب و مدیر محمد طفیل مرحوم ''نقوش'' کے کاتب ہی تو تھے۔ اب کی بار کمپوزر نے میری غزل کے ساتھ اچھا خاصا ہاتھ کر دیا ہے۔ درست اشعار اسطرح ہیں

ذرات آئینہ بکف آتے ہیں اب نظر
دوزخ مزاج دھوپ کا صحرا ہے شہر شہر
یہ کون اپنی سوچ کا قیدی ہے ان دنوں
یہ کون رات رات کو ہوتا ہے شہر شہر

جمہور زر و خوف میں محصور ضیاؔ
جمہوریت کا ویسے تو چرچا ہے شہر شہر

ضیاء شبنمی (ملتان)

محترم و مکرم جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

''چہارسو'' ملا سرِ ورق کے بعد فیض کا فلسفہ پڑھا تو دلچسپی بڑھی کہ یہ مجلّہ ترقی پسندانہ مزاج کا ہے اور مجھ فقیر کا مزاج (بطور طالبِ علم) بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''چہارسو'' بہت پسند آیا۔ آگے مندرجات میں بھی تخلیقی معیار اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور پروفیسر فتح محمد ملک ایسے اہلِ قلم کی موجودگی ''چہارسو'' کے اعتبار کو بڑھانے کے لیے کافی ہے۔ مشتاق اعظمی اور گلزار جاوید کے افسانے اسلوبیاتی حوالے سے جاذبِ نظر تو ہیں ہی مگر ان میں بیان کی گئی کہانیاں زندگی کی ہماہمی کی خبر دیتی ہیں۔ مہندر پرتاپ چاند کا سفرنامہ پاکستان، اہلِ لیّہ کے لیے بالعموم اور میرے لیے بالخصوص خاصے کی چیز ہے۔ چاند میرے محبوب ہیں میں نے انڈیا سے لیّہ میں اُن کی آمد کے لیے کئی برس تک انتظار کیا، مجھ احقر کے ساتھ لیّہ کے ایسے ادباء اور دانشور بھی تھے جو مہندر پرتاپ چاند کے ساتھ باتیں کرنا چاہتے تھے، چاند تو اس دھرتی سے بچھڑ کر ناسٹلجیائی کیفیات کا شکار ہیں مگر لیّہ شہر کے باشعور لوگ اُن کی محبت میں بے تاب تھے افسوس اس بات کا ہے کہ چند عاقبت نااندیش لوگوں نے چاند صاحب کو اندیشوں کا ایسا شکار کیا کہ وہ اپنے بہت سے چاہنے والوں سے نہ مل سکے۔ چاند صاحب نے میرے بارے میں بھی لکھا ہے کہ میری جانب سے ترتیب دی گئی تقریب میں تشریف نہ لا سکے تو میں (مزمل حسین) دو تین دن بہت دل گرفتہ رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں فقط، تین دن نہیں ابھی تک دل گرفتہ ہوں اور شاید عمر بھر مجھے اس کا افسوس رہے گا۔ میں نے پورے سرائیکی وسیب سے شعراء، ادباء اور دانشوروں کو دعوت دے رکھی تھی، ایک شاندار مشاعرہ ہونا تھا، مگر یہ ہو نہ سکا اور اس میں اگلا پورا دن آنے والے لوگوں کو تقریب کے خاتمے کی اطلاع دیتا رہا اور معافی مانگتا رہا۔ خیر جو نصیب میں تھا۔

''چہارسو'' چہارسو پھیلی اداسیوں اور غیر یقینیوں میں ایک امید کی کرن ہے۔ لوگ کتاب اور بالخصوص شعر و ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں ''چہارسو'' ایسا خالصتاً تخلیقی جملہ گھپ اندھیروں میں ایک جگنو کے مشابہ ہے، میں مدیران چہارسو کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین (لیہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب! تسلیمات۔

آپ کی عنایات کا شکریہ۔ چہارسو کے تازہ شمارے کی پہلے سوفٹ کاپی اور اب ہارڈ کاپی بھی دستیاب ہوئی۔ اس جریدے کی سج دھج کے پیچھے آپ کی محنت شاقہ صاف جھلکتی ہے جسکی بنا پر چہارسو نے نہ صرف اپنا معیار برقرار رکھا ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قرطاسِ اعزاز بنام مسعود مفتی نے ہمیں کئی زاویوں سے چونکا دیا۔ براہِ راست میں آپ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے میرے قرطاسِ ذہن ہر ایک یاد تازہ کر دی۔ ''قدرت اللہ شہاب'' ایک بڑا نام۔ مسعود مفتی اور اُن میں دو قدریں مشترک ہیں دونوں بیوروکریٹ دونوں ادیب۔ عام طور سے یہ سنگم ہوتا نہیں اور جب ہوتا ہے تو ایسے ہی ستارے چمکتے ہیں۔ آپ نے ان کا نمائندہ افسانہ ''آسیب'' شامل کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے کہ یہ عام آدمی کی بے بسی کا نوحہ ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ جتندر بلّو کا افسانہ ''نصیب اپنا اپنا'' غریب الوطنی کا دکھ سمیٹے ایک بدنصیب کا قصہ محبت جس کے پاس سے گزر گئی اور وہ دیکھتا رہ گیا۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ ''بیگی دا'' کا مرکزی کردار غلاما، ہمارے معاشرے میں ایسی کئی مثالیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ہم ان کی کتنی ہی بے قدری کریں۔ آسمان کو ایسے ہی غلاموں نے تھام رکھا ہے ورنہ یہ ہم جیسے گناہگاروں پر گر گیا ہوتا۔ ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ ''مجھے کیا برا تھا مرنا'' نے متاثر کیا۔ ہمارے معاشرے کی مظلوم عورت جس پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ وہ ماں کی صورت انسانیت کی ماں ہے بیوی کے طور زندگی کی دو پہیوں کی گاڑی کا ایک پہیہ۔ بہن کی شکل میں محبت کی علامت اور بیٹی کے روپ میں ہمارے آنگن کا وہ پھول جس سے گلشنِ حیات مہکتا رہتا ہے۔ افسانے کا اختتامیہ اتنا دلکش ہے کہ طبیعت واہ واہ پکار اُٹھتی ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل مبارکباد کی مستحق ہیں۔ آپ نے افسانہ ''دروازہ کھلا رکھنا'' میں معاشرے کے دو کرداروں کا جس خوبصورتی سے موازنہ پیش کیا ہے۔ اس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی خیال آفاقی کی نظم ''بیوٹی پارلر'' ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ تشنہ بریلوی نے بغداد کا ماتم خوب کیا۔

نجیب عمر (کراچی)

مدیر محترم، سلام و رحمت۔

''چہارسو'' کا مارچ، اپریل ۲۰۱۱ء کا شمارہ ویمن ڈے پر موصول ہوا۔ بہت شکریہ! فیض صاحب کا فلسفہ امن و آشتی حرف حرف عمل کا متقاضی ہے۔ وطن کی آبرو میں تخلیقات مسعود کو بھی فنکارانہ پیرائے میں منظوم کیا گیا۔ پیہم رواں پڑھ کے قیامِ فیصل آباد (لائلپور) کے دوران، غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات میں شرکت کرنا اور مسعود مفتی صاحب سے آٹوگراف لینا یاد آیا۔ ''اب تو مرجانے۔۔۔'' میں مفتی صاحب اور قاسمی صاحب کے مابین تخلیق کار و مدیر کے روابط و مراسم کے علاوہ قومی و ملکی تاریخ کے تناظر میں بالترتیب نظریاتی تصادم و مطابقت کی تفہیم پائی۔ لکھنے والے پر کسی کی رائے کے ردِعمل کے حوالے سے وضاحت نے ''براہِ راست'' کو منفرد ابتدائیہ عطا کیا۔ آغا جی نے بطور مزاح نگار مفتی صاحب کا تقابل اپنے اپنے عہد کے نامور و قدآور مزاح نگاروں سے نہایت انوکھی تکنیک سے کیا ہے نسخے کی ہیئت کذائی کی ماہرانہ تصویر کشی سے ڈاکٹر نرگس فاطمہ کا مسکراتے ہوئے اعتراف یاد آتا ہے کہ ڈاکٹروں کے نسخے صرف کیمسٹ ہی پڑھ پاتے ہیں۔ غیر قدرتی اموات کے سماجی و معاشرتی المیے کو آسیب میں بکمال شعور و آگہی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اُن کی دیگر نثری تخلیقات کو بھی جملہ دانشوروں نے اپنے مضامین و اقتباسات میں بنظر تائید و تحسین رقم کیا ہے۔ ''نصیب اپنا اپنا'' امیگریشن کے مسائل پر اچھا فوکس کیا گیا مگر جینی کا اپنے غیر قانونی قیام کو دیو جیسے قابل بھروسہ ساتھی سے چھپانا سمجھ نہ آیا۔ ''مجھے کیا برا تھا مرنا'' میں اگر چند مکالمے شامل نہ ہوتے تو روح کی تجسیم کے عناصر سے ماورا ہونے کا زیادہ گہرا امپیکٹ ذہن پہ رہتا۔ ''دروازہ کھلا رکھنا'' میں دلشاد عالم خاں کے خود کو مکمل کرنے کے فیصلے میں کامیابی یا ناکامی کے گراف کا تعین، تجسس و تحیر کا کامیاب عُنصر لیے ہوئے ہے۔ اپنے دیس کے بارے میں دوسروں کے تاثرات و محسوسات جاننا ہمیشہ سے دلچسپ و اہم ہوا کرتا ہے کچھ ایسی ہی تحریک کے تحت ''جبینِ نیاز'' کو پڑھا اور مزید مانوسیت مطالعے میں یوں در آئی کہ والد گرامی کی بحیثیت ایریگیشن انجینئر تعیناتی سدھنائی ہیڈ ورکس، (ضلع ملتان) اور کوٹ ادو بھی رہی تھی۔ نذرِ غالب آج بھی غالب کے مصرعوں کی بازگشت کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ محبوب خان کی غیر معمولی شخصیت مختلف زاویوں سے متاثر کرتی ہے اور ''آتی'' بچپن کی معصوم یادوں سے لپٹی ہوئی یادگار فلموں میں سے ہے۔ جناب فیض احمد فیض کی پنجابی غزل اور ''ربّا سچیا'' تو اس شمارے کا روپ سروپ ہیں۔ رس رابطوں کی بھی کئی سطور ''چہارسو'' کے لئے پذیرائی کا پہلو لئے ہیں پھر آپ کا افسانہ/ ڈرامہ بھی جریدے کو سج دھج عطا کر دیتا ہے۔ بیک ٹائیٹل بھی بتدریج نظر افروز اور باعث توجہ ہونے لگا ہے۔ کبھی پینٹنگز اور کبھی خوبصورت کتابوں کے تعارف ''ذرا بارش کو تھمنے دو'' سے تو ساعتیں گنگناتی ہوئی لگتی ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

جناب گلزار جاوید صاحب! آداب۔

''چہارسو'' موصول ہوا۔ پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ اپنے نام کی طرح اس جریدے نے ملکوں ملکوں میں بسے لکھیاروں کی تحریروں کو یکجا کر کے جو چمن ترتیب دیا ہے دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ مسعود مفتی پر بہت خوب گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ ''براہِ راست'' ایک مفید سلسلہ ہے، مجوزہ شخصیت کی زندگی کے ادبی اور ذاتی پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ افسانوں میں جتندر بلّو، طاہرہ اقبال اور گلزار جاوید نے متاثر کیا۔ فیروز عالم کی داستانِ حیات پُر اثر تحریر ہے۔ غزلوں کا حصہ بھی بھرپور تھا۔ مشکور حسین یاد، کرشن کمار طور، امین راحت چغتائی اور ضیاء شبنمی غزلوں میں نمایاں نظر آئے۔ تفصیلی تبصرہ پورے جریدے پر کیا جا

سکتا ہے لیکن خط کے طویل ہونے کا خدشہ ہے۔ آج کے دور میں شائع ہونے والے اردو رسالوں میں ''چہارسُو'' نمایاں نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ جریدہ اردو ادب میں اپنا ممتاز مقام قائم رکھے گا آخر میں بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ ''چہارسُو'' حاصل کرنے کا ''زرِ سالانہ'' کیا ہے؟

وقار مسعود خان (خانیوال)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید صاحب، سلامِ مسنون۔

امید ہے آپ کا مزاج شگفتہ ہوگا۔ شمارہ : مارچ اپریل ۲۰۱۱ء موصول ہو چکا ہے جس کی بناء پر یہ تحریر نذرِ ''چہارسُو'' ہے۔ آپ نے جناب مسعود مفتی پر کام کر کے جی خوش کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری بھی ہے کہ ہم ''سوسائٹی'' کے اُن لوگوں پر کام کریں جو یا تو گوشہ نشین ہیں یا جنہیں وہ پذیرائی نہ مل سکی جسکے وہ حقدار تھے۔ ویسے بھی اب سوسائٹی رہ کہاں گئی ہے۔ آپ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ بقول شاعر

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی

ندیم ہاشمی (کراچی)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

الحمد للہ خیریت سے ہوں۔ ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۱ء ملا جس کے لیے میں سراپا ممنون ہوں۔ مسعود مفتی کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے آپ نے ایک اور ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہر پرچہ خاص ہوتا ہے۔ میں بخوبی واقف ہوں کہ کسی اہلِ علم وفن کے لیے خصوصی گوشہ تیار کرنا کتنا دشوار اور جگر آزما کام ہے۔ ڈاکٹر مقصودہ حسین نے ''پیہم رواں'' میں سوانحی کوائف، تعلیم اور ادبی کارگزاری کو خوب صورتی سے ترتیب دیا ہے ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات اور مسعود مفتی کے جوابات سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ فلم دیکھنے والا واقعہ دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر ''ایک مزاح نگار'' اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صاحب کی تحریر ''محدّب شیشے'' مسعود مفتی صاحب کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے مسعود مفتی کے فنِ افسانہ نگاری (تکنیک) کی درست انداز میں وضاحت کی ہے ڈاکٹر صاحب نے درست لکھا ہے۔

''یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں قدرِ اوّل کی تخلیقات کی تعداد زیادہ ہے اس نے نقاد اور قاری دونوں کو مایوس نہیں کیا''
(ص ۲۵)

پروفیسر فتح محمد ملک صاحب نے ''ریزے'' اور ''صدیوں پار'' کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا ہے اور مسعود مفتی کو اہم کہانی کار قرار دیا ہے۔ مفتی صاحب کی تخلیقات کا انتخاب آپ کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ ''بیگی دا'' ایک خاص پس منظر رکھتا ہے مذہب کے نام پر اور آڑ میں جو غیر محسوس طریقے سے ظلم ہو رہا ہے اُس کو طاہرہ نے محسوسات کی زبان عطا کی ہے۔ غلام محمد عرف غلام، کا کردار خوب پینٹ کیا ہے۔ گلزار بھائی آپ بھی اس زمانے میں خون گرما دینے والی محبت کی دل خراش کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ''دروازہ کھلا رکھنا'' اپنی گرفت میں لیے رکھنے والا افسانہ ہے۔ مشتاق اعظمی اور رینو بہل کی کہانیاں بھی انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ غزلیات میں مشکور حسین یاد، امین راحت چغتائی، آصف ثاقب، ڈاکٹر شباب للت، صابر عظیم آبادی کی روایت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ لہجے کی بے ساختگی نے مزا دیا۔ خورشید انور رضوی، شگفتہ نازلی، نعیم الدین نظر، احمد ظہور، احسان احمد شیخ، افضال فردوس، تصور اقبال نے خوب کاوش کی ہے نظموں میں شاہین کی برانٹوسورس، فیصل عظیم کی شوخیِ رندانہ، اختر رضا سلیمی کی منظر راز بلندی پر، حمیرا راحت کی بریکنگ نیوز اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے اچھی نظمیں ہیں۔ وقار مسعود خان کی نظم ''ایک خود غرض مسلمان کا نوحہ'' خاموشی سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک عام آدمی کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' فیروز عالم کی خود نوشت انتہائی دلچسپی سے ماضی کے نقوش پیش منظر میں لا رہی ہے۔ موجودہ قسط میں میر پور خاص اور وہاں کے لوگوں کو یاد کیا ہے۔ مہندر پرتاپ چاند کی سفر پاکستان کی خوش گوار یادیں ''جبینِ نیاز'' کے عنوان سے پرچے کے صفحات کی زینت ہیں۔ چاند صاحب نے بہت محبت اور عقیدت سے اپنی جنم بھومی کروڑ لعل عیسن کو یاد کیا ہے اور اپنے سفر کے یادگار لمحات کو گرفت میں لینے اور ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ خطوط بھی اہم ہیں۔

فیروز عالم صاحب کے لیے:

فیروز عالم صاحب، ریلوے اسکول اُسی جگہ برقرار ہے مگر حالت ناگفتہ بہ ہے۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول اب شہید بے نظیر بھٹو ہائیر سیکنڈری اسکول ہو چکا ہے۔ میر پور خاص میں اسکولز (سرکاری وغیر سرکاری) بہت ہیں مگر سرکاری کالج تین ہیں ایک یونیورسٹی کیمپس کام کر رہا ہے۔ چوہدری رفیق احمد صاحب کا دس بارہ برس پہلے انتقال ہو چکا ہے اُن کے نام پر ایک پرائیویٹ کالج کام کر رہا ہے۔ آپا خورشید بیگم الحمد للہ حیات ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ شہر چاروں طرف سے بہت پھیل چکا ہے۔ آپ نے یہ لکھا ہے کہ

''ایک ایسا شہر ہے جس کی خوش گوار یادیں ہر اس فرد کے ذہن سے نہیں مٹ سکیں گی جس نے وہاں کچھ بھی عرصہ گزارا ہے''۔ (ص ۸۴)

ریحانہ روحی صاحبہ کے گھر جانے کا چھوٹا سا واقعہ سن لیجیے گلزار بھائی کے بتائے ہوئے پتے پر جمنا داس کالونی گیا۔ اپنے ایک دوست سے پتا معلوم کیا تو اُس نے کہا وہ کونے والا گھر ہے۔ میں نے دروازہ بجایا کچھ دیر بعد پچاس برس سے زائد کا ایک گورا چٹا آدمی باہر آیا بڑی شفقت سے سلام کا جواب دیا۔ پتہ دریافت کرنے پر وہ صاحب مسکرائے اور گلی سے سڑک کی جانب آئے اور کہا

قریب ہی ہے۔ مجھے پتا بتانے کی کوشش کی مگر نا سود، پھر فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بائیک نکالی، ان کا یہ ایثار اور خوش دلی دیکھ کر میں بہت متاثر بھی ہوا اور شرمندہ بھی کہ میری وجہ سے انہیں زحمت ہو رہی ہے۔ میں نے بہت کہا کہ میری بائیک پر چلتے ہیں آپ کو واپس چھوڑ جاؤں گا مگر وہ صاحب مجھے محترمہ ریحانہ روحی کے گھر تک چھوڑ کر آئے۔ فاصلہ طے کرنے میں بمشکل دو منٹ لگے ہوں گے۔ میں نے شہزاد صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ریحانہ روحی صاحبہ سے ملاقات ہوئی اپنا تعارف کروایا آنے کا مقصد بیان کیا بہت خوش ہوئیں۔ ''چہارسو'' کا ذکرِ خاص رہا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی اپنے خط میں میرا بھی ضرور ذکر کرنا اور گلزار بھائی اور سب کو میرا سلام لکھنا۔ فیروز عالم صاحب ''ہوا کے دوش پر'' کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آپ لکھتے رہیے اسے میر پور خاص کے اہلِ علم وفن قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی امان میں رکھے (آمین) گلزار بھائی آپ کی ادب سے گہری اور سنجیدہ وابستگی پر رشک آتا ہے۔ ربِّ کائنات آپ کو آسانیاں عطا فرمائے (آمین)۔

نوید سروش (میر پور خاص، سندھ)

برادرم گلزار جاوید! سلام مسنون۔

اس بار قرطاسِ اعزاز ملک کے نامور لکھاری مسعود مفتی سے منسوب ہے۔ یہ سلسلہ بہت خوب ہے خاص کر آپ کے مکالمے کی مدد سے شخصیت اور فن کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ مسعود مفتی سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہاں تھے۔ انہوں نے اس بارے میں بھی حقائق بیان کیے ہیں۔ وہ صاحبِ طرز افسانہ نگار اور پاکستان کا درد دل میں رکھتے ہیں۔ بطور بیوروکریٹ وہ انصاف پسند اور دیانتدار تھے۔ افسانوں کے علاوہ اُن کا ڈرامہ پہلی بار میری نظر سے گزرا اور بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ عزیز دوست مہندر پرتاپ چاند کا سفر نامہ ''جبینِ نیاز'' پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ میں اُن کے ساتھ ساتھ شریکِ سفر رہا ہوں۔ سفر نامہ بہت خوبصورت اور یادیں بہت خوشگوار ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند صاحب نظم کے ساتھ نثر بھی خوبصورت لکھتے ہیں۔ وہ پیار کرنے والے خوبصورت، مخلص اور انسان دوست ہیں۔ فیروز عالم کی سوانح عمری ''ہوا کے دوش پر'' بھی دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں وہ ہمیشہ سچ لکھتے ہیں اسی باعث ان کی تحریر خود کو پڑھوانے کی قوت رکھتی ہے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

گلزار بھائی، آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ حسبِ سابق بہت خوب ہے۔ مسعود مفتی صاحب کی نسبت تمام معلومات اور اُن کا افسانہ ''آسیب'' بہت پسند آئے۔ ''نصیب اپنا اپنا'' دلچسپ افسانہ ہے۔ (بیگی دا) کا اندازِ بیان اور غلاما کا کردار ذہن میں چھاپ چھوڑ گیا اور قاری کی ہمدردی بھی بٹور گیا۔ (دروازہ کھلا رکھنا) خوبصورت افسانہ ہے جس میں کئی رنگ چھپے ہیں اور دل کو چھو رہے ہیں۔ چاند صاحب کا سفر نامہ ''جبینِ نیاز'' پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ایک ایک تفصیل چاند صاحب نے اس قدر خوبصورتی سے لکھی ہے کہ ایسا محسوس ہوا کہ میں بھی اُن کے ساتھ محوِ سفر تھی۔ پاکستانی بہن بھائیوں کا اُن کے ساتھ پیار بہت اچھا لگا۔ نہ جانے وہ کون لوگ ہیں جو دلوں میں بیر پالتے اور ماحول میں زہر گھولتے ہیں۔ حالانکہ سبھی اپنے ہیں اور سبھی کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت موجود ہے، پھر یہ نفرت کہاں سے آ گئی؟

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب اور سلام

اس بار کا گوشہ بھی دلچسپ تھا۔ مسعود مفتی صاحب کا انٹرویو اور خصوصاً قاسمی صاحب کی یادوں کے حوالے سے ان کی تحریر میرے لئے خاصی معلوماتی ہے اور فکاہیہ بھی دلچسپ ہے۔ بھگوان داس اعجاز کے دوہے اچھے ہیں مگر ان کے مصرعے توڑ کر لکھے گئے ہیں یا کسی وجہ سے ایسے چھپ گئے ہیں۔ آصف رضا کی نظم ''بھوت'' اچھی استعاراتی نظم ہے۔ شاہین صاحب کی برانٹوسورس ''ڈایناسور'' کی شکل میں دراصل انسانی تاریخ اور اس کے مستقبل کا اچھوتا منظر نامہ ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہیں میرا خط پھر سے اگلے شمارے سے دوڑ میں پیچھے تو نہیں رہ گیا۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

برادر محترم گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

''چہارسو'' پابندی سے ملتا ہے۔ دلی شکریہ قبول کیجیے۔ تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز مسعود مفتی کے نام دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ آپ نے اپنی بالغ نظری اور ادبی دیانت کا ایک اور دستاویزی ثبوت فراہم کیا ہے۔ مسعود مفتی اگر مشرقی پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات کے سبب بعض حلقوں میں متنازع فیہ ٹھہرے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ کیونکہ حق گوئی و بیباکی کی آئین جواں مرداں ہے اور شومئی قسمت سے ہمارے یہاں جواں مردوں کا ہمیشہ کال رہا ہے۔ مسعود مفتی ایک بیوروکریٹ تھے لیکن ایسے بیوروکریٹ جن پر بیوروکریسی اپنا رنگ نہ چڑھا سکی۔ بے شک! وہ ایک پابہ جولاں سرکاری ملازم تھے، مگر ان کے فکر و نظر کو کوئی زنجیر نہیں کر سکا۔ ہر چند ان کی مندرجہ ذیل رائے فرانسیسی ادیب موپساں، ادیب سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں ہے۔ لیکن ہماری نظر میں یہ رائے خود ان کے فن و شخصیت پر صادق آتی ہے۔

> ''ان تینوں میں جرأت اظہار ہی نہیں ادبی ہنرمندی بھی تھی اور منافقت کے بجائے زندگی کو دیانت داری سے دیکھنے والی آنکھ بھی تھی۔''

مسعود مفتی نے حقیقت نگاری کے شعور و شعار سے اپنی ادبی زندگی کی تہذیب کی ہے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے تناظر میں سیاست کے نہاں خانوں میں کلبلاتے راز ہائے سربستہ کو جس کمال حوصلگی و جرأت مندی سے

طشت از بام کیا، وہ قابل رشک ہے۔ پاکستان کو ان سے وہی نسبت ہے، جو روح کو وجود سے ہوتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ جب مشرقی پاکستان الگ ہوا تو انہوں نے روح کو اپنے وجود سے جدا ہوتے ہوئے محسوس کیا او یوں سقوط ڈھاکہ ان کے ذاتی سانحے کی شکل اختیار کر گیا۔اگر کوئی ہم سے مسعود مفتی کے ادب اور ان کی ادبی بوطیقا کے بارے میں پوچھے تو ہم مختصر ترین الفاظ میں یہ کہیں گے کہ ان کے ادب کا تخلیقی عمل خودکار ہے ۔ وہ تواتر سے ملوگیٹ، آمریت، ملائیت اور ناہموار معیشت ومعاشرت پر حملہ آور ہوتے ہیں۔لیکن کبھی افسانے اور رپورتاژ سے، کبھی ادبی اور سیاسی مضامین سے اور کبھی اخباری کالموں سے۔وہ مشاہدہ کو مجاہدہ سے مربوط رکھنے کے قائل ہیں۔وہ ایک نظریہ ساز ادیب ہیں اور بیرون ملک سے درآمد شدہ نظریوں اور تجربوں کے اتباع کو کسی نوع کی دستار فضیلت نہیں گردانتے۔مسعود مفتی کا مضمون ''اب تو مرجانے کو جی چاہتا ہے'' یادنگاری کے ذیل میں لکھے گئے یادگار مضامین میں سے ایک ہے۔ یہ مضمون ایک تاریخ ساز قلمکار کی ایسی یادوں کو دامن میں لئے ہوئے ہے، جو تاریخی وادبی ہر دو اعتبار سے گراں بہا ہیں۔اس مضمون میں مفتی صاحب کے فن اور شخصیت کے وہ تمام گوشے منعکس ہیں، جنہیں نگاہ تجسّس دیکھنے کی متمنی ہوسکتی ہے۔''براہ راست''''سچ کہوں گا اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہوں گا''جیسے حلفی بیان کی روح سے سرشار تحریر ہے۔جس میں بظاہر مدیر''چہارسو'' اور صاحبِ قرطاسِ اعزاز ایک دوسرے سے مخاطب ہیں۔مگر حقیقت میں ایسا لگتا ہے جیسے علم وآگہی کے دو قلزم آپس میں ہم آغوش ہیں۔جن کی فلک بوس لہروں نے ہم ایسے ساحل نشینوں کے دشت طلب علم وادب کو بھی سیراب کر دیا ہے۔مسعود مفتی کے گوشے میں بڑے بڑے نامور ادیب براجمان ہیں اور ہر ایک ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں اردو مزاحیہ ادب کے بحرالکاہل کا منفرد شناور قرار دیا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی کے نزدیک وہ رزم خیر وشر کے عکاس اور معاشرتی اقدار کے مبلغ ہیں۔ڈاکٹر انور سدید مسعود مفتی کو افسانہ نگار کے روپ میں ایک ایسا مسیحا تسلیم کرتے ہیں۔جس کا ظہور معاشرے کے اخلاق انحطاط کی انتہائی سطح پر پہنچنے کے بعد ناگزیر ہو جاتی ہے۔پروفیسر فتح محمد ملک نے ان یادوں کی بازیافت کا سہرا ان کے سر باندھا ہے، بقول ان کے:

> ''جن یادوں کو اپنے خواب وخیال میں بسا کر اسلامیان ہند نے تحریک پاکستان کا آغاز کیا تھا اور جن یادوں کو گواہ بنا کر بستر مرگ پر بے چین اقبالؔ نے قائداعظم کو لکھا تھا کہ اگر پاکستان نہ بنا تو برصغیر میں غرناطہ اور فلسطین کی داستان دہرائے جانے کا امکان ہے۔''

جتندر بلو کی کہانی ''نصیب اپنا اپنا'' کا نمایاں وصف افسانویت ہے۔انجام کی تعجب خیزی نے افسانے کے تاثر کو دوچند کر دیا ہے۔جبکہ جینی کے کردار کے ارتقا میں فنی جمال جھلکتا ہے۔بلاشبہ جتندر بلو نے ''نصیب اپنا اپنا'' کی کرافٹنگ میں چابکدستی سے کام لیا ہے اور خصوصی مہارت فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہانی میں سسپنس پیدا کرنا، اسے کامگاری سے قائم رکھنا اور پھر اُس کے انکشاف کو کلائمیکس کے سانچے میں ڈھالنا ایسی ہنروری ہے، جو خال خال افسانہ نگاروں کو نصیب ہے۔جتندر بلو کا یہ اختصاص ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں تارکین وطن کی دشواریوں کی نہایت دردمندی ودلسوزی سے نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ افسانہ بھی غیر قانونی قیام کے افسوس ناک انجام پر منتج ہوتا ہے۔گلزار جاوید کا رومانی افسانہ ''دروازہ کھلا رکھنا'' جذباتی، ہیجان انگیز یوں سے عبارت ہے اس کی اساسی خصوصیت Naturality ہے۔کہانی کے تمام تر واقعات حقیقت سے قریب ہیں۔ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر غیر حقیقی ہونے کا گمان ہو۔گلزار جاوید نے بعض مواقع پر مزاح کا تڑکا لگایا ہے جو بھلا لگتا ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے اور اگر وہ مزاح نگاری پر بھی ارتکاز فکر کریں تو یقیناً یہ میداں بھی مار لیں گے۔بعض غزلوں کے درج ذیل اشعار سے آسانی سے نہیں گزرا جاسکا۔

بس ایک حرف ہُو سے تلاطم بپا کرو
آواز کے وضو سے تلاطم بپا کرو

مشکور حسین یاد

اگر یہ ہے تو ہے کاریگری محبت کی
وہ شخص میرے مقدر میں تھا کہاں ورنہ

کرشن کمار طور

اندر حبس کا عالم لیکن ہم سب ننگے بیٹھے ہیں
ایسی حالت میں تم سوچو راحت باہر آئے کون

امین راحت چغتائی

پرتپال سنگھ بیتابؔ، کرامت بخاری، فیصل عظیم اور اختر رضا سلیمی نے اچھی نظمیں کہی ہیں۔

قیصر نجفی (کراچی)

''کافر ادا محبوب''

آپ کسی کافر ادا محبوب کے عشق میں کب کب گرفتار ہوئے اور اُس کا انجام کیا ہوا۔خشک گمیں نظروں سے مولانا حسرت موہانی نے سوال کرنے والے کو دیکھتے ہوئے تھوڑا سا وقفہ دیا اور رازدارانہ لہجے میں سوال کرنے والے کے قریب ہوکر ''میاں عشق تو ہم نے بھی کیا ہے لیکن شادی سے قبل اور جس نازنین کو دل دیا اسی کو شریکِ حیات بنالیا''۔

۔مقالاتِ افتتاحیہ۔

معراج جامی صاحب کے یہ اداریے شاید ''سفیر اردو'' میں شائع ہو کر وہ خراجِ تحسین حاصل نہ کر سکے ہوں جن کے یہ حقدار تھے، اس لیے کہ قاری ہمیشہ ادیبوں کی تخلیقات پہلے پڑھتا ہے اور بوجوہ یا تو اداریے پڑھتا ہی نہیں یا انہیں کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہے لیکن اب کتابی شکل میں ان کی اشاعت ایک مبارک فال ہے۔ان اداریوں میں جو نکتے اٹھائے گئے ہیں وہ تلخ حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ جامی صاحب کا کمال فن یہ ہے کہ وہ ملائمت، بردباری، حلیمی اور میانہ روی سے ان موضوعات پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں جن میں سخت گیری کی ضرورت ناگزیر دکھائی دیتی ہے۔ان کے سبھی موضوعات اردو زبان وادب اور فی زمانہ اس کی بے قدری سے متعلق ہیں لیکن مصنف کی دوررسی اور ذہانت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ موضوع سے الگ ہوئے بغیر اپنے نکات میں ملک کی سیاست اور اس کے معاشرے کے گرتے ہوئے معیار کو اپنی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اداریے ہر قاری کے ذوقِ سلیم کی تربیت کا سامان بنیں گے۔.....ڈاکٹر ستیہ پا آنند

۔ادبی مطالعات۔

''ادبی مطالعات'' ڈاکٹر مزمل حسین کے مقالات کا مجموعہ ہے۔جس کا غالب موضوع بلاغت اور اس کے متعلقات ہیں۔ان کے مطالعے سے ڈاکٹر مزمل حسین کا اُردو کلاسیکی شعر وادب اور تنقید سے وابستگی کا پتا چلتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ تحقیق کا کوئی اَنت نہیں ہوتا اور تحقیقی نتائج کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے علم وادب کی دنیا میں نت نئے نظریات جنم لیتے رہتے ہیں اور ہر آنے والا محقق اپنی صلاحیت، ذہن اُپج اور علمیت کے پیشِ نظر ان نظریات سے نئے زاویے تلاشتا رہتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑے محقق کی حتمی رائے بہت دیر تک مستحکم رہتی ہے۔اس تناظر میں زیرِ نظر مقالات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں مصنف نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ نئے مباحث کا آغاز کیا ہے اور یقیناً وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ بلاغت کے علم کو جانے اور سمجھے بغیر بڑی تخلیق ممکن نہیں۔میرے خیال میں مصنف کی اس حتمی رائے کو جانے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔.....شاہین اختر (شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین لاہور)

۔یوتھینیزیا۔

پیوستہ برس جب اردو کے چند رسائل کے توسط سے ''یوتھینیزیا'' کے موضوع پر کہانیاں لکھنے کی فرمائش کی گئی تو ایک دو دوستوں اور صلاح کاروں نے یہ کہا کہ اس دنیائے آلام میں انسانی زندگی کے واسطے حادثاتی غم واندوہ کیا کم ہیں کہ اب کہانی جیسی خوش وقتیٔ مطالعہ کی لطیف صنف ادب میں ایسا مریضانہ اور پژمردہ (morbid) موضوع کہانیوں کے لیے چنا گیا؟

لفظ ''یوتھینیزیا'' بطور ایک اصطلاح سرفرانسس بیکن نے سب سے پہلے سترھویں صدی کے اوائل میں ''طبی معاونت سے خود کشی'' کے لئے استعمال کیا۔ جہاں تک اس لفظ کا تعلق ہے اس کتاب میں اسے سرفرانسس کی دی ہوئی تعریف کے مطابق استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس سے جڑے ہوئے مسائل کا تعلق ہے اس پر کچھ بحث ہمارے ان ادیبوں نے کی ہے جنھوں نے اس مسئلہ کی اخلاقیات پر مضمون لکھے ہیں۔.....ڈاکٹر صفات علوی

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی